

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

مَدَوَّةُ اَیِّینِ دِلِّی کا علمی و دینی ماہنامہ

برپاک

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مترتب
عبد الرحمن عثمانی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

برہان

۱۰۲	ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ مطابق جولائی ۱۹۸۸ء	شمارہ ۱
-----	----------------------------------	---------

- ۱۔ نظرات
مولانا فراہی کی
تفسیر سورہ فیلی
ایک جائزہ
- ۲۔ عمید الرحمن عثمانی
جناب محمد رضی الاسلام ندوی
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
- ۳۔ تاریخ اسلام
خلافت راشدہ و بنی امیہ
الواح الصنادید
- ۴۔ جناب عبدالرؤف خاں
اورنگ آباد
ڈاکٹر محمد اسلم
پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ۵۔ البوہیان توحیدی
حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ
- ۶۔ جناب محمد سمیع اختر نلائی

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھپتہ شیخ مسکو جامع مسجد میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

ایک ایسے وسیع و عریض ملک میں جہاں روزِ اوّل سے مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف ثقافتوں سے وابستہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ موجود ہوں ایک دوسرے فرقہ کے لوگوں کے مذہبی جذبات، تہذیبی قدروں اور لسانی احساسات کا خیال رکھنا اتنی ضروری ہے اور اس طرح کے مخلوط سماجی نظام میں باہمی رواداری کے زریں اصول کو اپنائے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ترقی ناممکن ہے۔

ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی جس قوت اور شدت کے ساتھ فرقہ واریت، تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کو بڑھاوا ملا ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہم دوسرے مذاہب یا مس قدر ترقی نہیں کر پائے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ عدم تشدد کے جس اصول کی بنیاد پر ملک کو آزادی ملی، آزادی ملنے کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر ملک تشدد کی راہ پر چل پڑا۔

درحقیقت فرقہ واریت، تشدد، دہشت گردی، گروہی عصبیت اور لسانی جارحیت کو بڑھانے کے سلسلے میں ملک کی تہذیبی رنگارنگی سے بہت سے لوگوں کی عدم واقفیت یا جان بوجھ کر انکار کر دینے کی عادت کو بھی زیادہ دخل ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ یہ ملک ایک خوبصورت گلدستہ کی طرح ہے جس میں

رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ ان پھولوں کو اپنے انداز میں مہکنے اور اپنے رنگ و
 روپ کو قائم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی پھول یہ چاہے کہ دوسرے پھول
 اس کے رنگ اور خوشبو کو اختیار کر لیں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی اقلیتی طبقہ
 سے تعلق رکھنے والا فرد اپنا مذہب ترک کر کے اکثریت کے خوف اور ڈر سے ان میں
 شامل ہونے پر آمادگی کا اظہار کرے گا۔ اور نہ کوئی اکثریتی مذہب کا پیروکار آسانی
 سے اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے پر راضی ہوگا۔ ہر فرقہ کی اپنی ثقافت، اپنی شناخت
 اپنی زبان، اپنی انفرادیت اور اپنی روایات ہیں۔

”قومی ایکتہ“ (NATIONAL INTIGRETION) کی بات
 آج جس زوردار انداز سے کی جا رہی ہے اور اس کے لئے تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ
 اور وسائل تشہیر اختیار کئے جا رہے ہیں اس تناسب سے اس کے نتائج قطعاً سامنے
 نہیں آ رہے ہیں۔ دراصل ”قومی یکجہتی“ کے کار کو تقویت اس وقت مل سکتی ہے
 جب ملک میں بسنے والے تمام فرقے اور اکائیاں اپنی تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی
 روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کی سالمیت، وحدت اور اس کی مجموعی بہبود و
 فلاح کے لئے متحد ہو کر سرگرم عمل ہوں اور اس طرح اپنی وطن دوستی کا ثبوت
 پیش کریں۔ مذہب کا پابند ہونا بڑی بات نہیں ہے۔ بُری بات یہ ہے کہ
 دوسروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے رنگ میں رنگ جائیں۔ ”قومی
 دھارے“ کا مطلب اگر کسی سیاسی رہنما یا جماعت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ
 اقلیتی فرقہ اکثریتی فرقہ میں ضم ہو جائے تو یہ بات اس پر واضح ہو جانی چاہئے
 کہ اول تو اس ملک کا غیر فرقہ وارانہ سیکولر دستور اس بات کی تائید نہیں کرتا
 اور اگر بغرض محال کوئی دوسرا دستور اس کی تائید بھی کرتا تو یہ چیز

یہاں کے عوام کے لئے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ فرقہ پرست اور تنگ نظر سیاسی تنظیمیں اور عوامی ہندوستان کی تہذیبی ننگاری سے انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کے سبھی بسنے والے بلا اختیار کسی خاص مذہبی اور معاشرتی رنگ کو اختیار کر لیں فی الحقیقت "قومی یکجہتی" اور مختلف اکائیوں کے مابین ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی راہ میں روڑا اٹھاتے ہیں۔ وہ نہ تو ملک کے دستور کے وفادار ہیں اور نہ ملک کی وحدت و سالمیت کے طرفدار، اگر اس طرح کی فرقہ پرست اور تنگ نظر جماعتوں پر قانونی طور پر پابندی نہ لگائی گئی تو یہ قوتیں بھی مذہب کا نام لے کر، مذہب کے تقدس کا استحصال کر کے لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر، مذہب کی آڑ میں اور کبھی زبان کی بات کر کے جو حقیر مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ تو حاصل نہ ہو سکے گا البتہ ہر طرف طوائف الملوک انتشار اور افتراق پھیل جائے گا۔

انسان دوستی، احترام آدمیت، خدمت خلق، خیر خواہی، ایثار و قربانی، اخلاق و شرافت، محبت و ہمدردی، وسیع قلبی و رواداری، اعلیٰ انسانی اصول اور اخلاقی اقدار ہیں۔ موجودہ پر آشوب اور خود غرضی و مفاد پرستی کے دور میں زندگی کے تمام شعبوں اور جملہ محاذوں پر یہ تعمیری جذبات، پاکیزہ خیالات اور صالح افکار و نظریات کو اجاگر کر کے ان کی افادیت، اہمیت اور ضرورت عام لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی شدید ضرورت ہے۔

ہم اپنی ذاتی اور جماعتی زندگی کے طریق کار میں مثبت اور سنجیدہ تبدیلی لائیں، باہمی احترام و اکرام اور اعتماد و اعتبار کی فضا کو بڑھاوا دے کر ایک دوسرے کے جان و مال کا تحفظ اور واجبی حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری کا

ہم میں سے ہر فرد کے اندر پیدا ہو۔ جمعی ہم ایک مثالی اور فلاحی معاشرہ اور پاکیزہ سماجی نظام کے قیام کی بنیادوں کو استوار کر سکتے ہیں۔

مذہب و عقیدہ انسانی رشتوں میں دُوری پیدا کرنے، دراڑ ڈالنے، باہمی منافرت اور تنگ نظری پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان رشتوں کو مزید مستحکم، پائدار اور انسانی وحدت کو مضبوط کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

۴

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں برکھنا
کاش ملک و قوم کا دانشور طبقہ، ارباب اقتدار، صاحب منصب اختیار
اور مختلف سماجی، اصلاحی اور سیاسی ذمہ دار افراد و جماعت اس روشن
حقیقت کو سمجھ کر اس کا پالن کریں۔

کریپشن، مہنگائی، گرامنی اور موقع پرستی نے اپنے تمام سابقہ ریکارڈ
کو توڑ دیا ہے۔ ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ غربت، افلاس،
بیکاری، بے روزگاری، جہالت اور بیماری کے چنگل میں گرفتار ہو کر
کس میرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں
کے تمام تر تعمیر و ترقی کے دعوؤں کے باوجود اس کے فوائد اور ثمرات
سماج کے پسماندہ اور نیچے طبقوں تک نہیں پہنچ رہے ہیں اور عام
لوگ آج بھی اپنے آپ کو ذہنی و فکری اعتبار سے مفلس اور غلام ہی
سمجھ رہے ہیں۔ اگر ملک میں بسنے والی اقلیتوں میں جان و مال کے
عدم تحفظ کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف مذہبی،
لسانی، تہذیبی اور سماجی تشخص و امتیاز کی طرف سے خطرات لاحق

ہیں۔ عام لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے، ان کے بنیادی آئین،
انسانی اور جمہوری حقوق کا تحفظ و حصول اور مایوس کن رجحانات
کے احساسات کو کم کرنے کے لئے زوردار عوامی تحریک چلانے کے
ساتھ ساتھ قوم خاص طور پر نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت کی طرف
اولین مرحلے میں توجہ دی جانی چاہئے، جو ہمیں انسانیت، محبت اور
جمہوریت کی راہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

مولانا فراہی کی تفسیر سورہ فیل

ایک جائزہ

(۲)

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اس فصل میں آگے مولانا فراہی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چڑیاں لاشیں کھانے کے لئے آئی تھیں۔ لکھتے ہیں :

”شعرا کا عام انداز کلام اجمال و کنایہ کا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے۔ بعض نے مجلاً چڑیوں کے دیکھنے کا ذکر کر دیا اور اس قدر بس تھا۔ کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خورد چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم و مشہور بات تھی۔ وہم و گم جوچ کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب ریح کے قتل کی پیشین گوئی عمرو بن ربیعہ نے اسی دلیل سے کی تھی۔ بعض شعرا رنوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی۔ اس وجہ سے وہ بھی ساتھ ہولی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ عمرو بن ہارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے :

إذ اما غزوا بالجيش خلق فوقهم عصاب طير تھندی بعصاب
جواع قد ايقن ان قبيله اذا ما التقي الجمع ان اول غالب
[جب وہ فوج لے کر حملہ کرتے ہیں تو چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈان کے اوپر منڈلاتے
ہیں۔ وہ گرا چاہتی ہیں۔ کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جاعتوں میں ٹکری ہوگی
ہے تو انہی کا قبیلہ غالب رہتا ہے]

اسی مضمون کو ابو نواس نے لیا ہے :

تتأى الطير غدا وتثقت بالشبع من جزاء
[جب میرا مدوح جنگ کے لئے نکلتا ہے تو چڑیوں کے جھنڈ اس کے
پیچھے اس یقین کے ساتھ چلتے ہیں کہ اس کے شکار سے اپنا پیٹ خوب
بھریں گے] ۱۰

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کے اس استدلال کا تذکرہ
کرتے ہوئے لکھا ہے :

”۳۶۔ میں بصرہ میں جنگ جمل واقع ہوئی تھی۔ حجاز میں اس لڑائی کا حال
اسی دن معلوم ہو گیا تھا۔ کیونکہ غول در غول پرندے کہے ہوئے اعداد
چنگلوں اور چونچوں میں لئے ہوئے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔“ ۱۱
مذکورہ اشعار میں شاعرانہ مبالغہ آرائی ظاہر ہے۔ شاعر اپنے مدوح
کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وہ لشکر جنگ کے لئے چلتا ہے تو پرندوں
کے جھنڈ اس یقین کے ساتھ اس کے ساتھ ہولیتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوگا تو

۱۰ تفسیر سورۃ فیل ص ۶۸-۶۹۔

۱۱ ارض القرآن سید سلیمان ندوی اول ص ۳۱۵ بحوالہ تاریخ طبری ذکر واقعہ جمل

اس کے شکار سے اپنا پیٹ بھر رہے گے۔ پرندوں کا لشکر کی کامیابی کا یقین کر لینا حقیقت واقعہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟ اس مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ کر استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

واقعہ فیل سے قبل بھی ایام جاہلیت میں بہت سی جنگیں ہو چکی تھیں جیسے جنگ بسوس، جنگ فاحس وغیرہ اور جنگ بعاث وغیرہ، جن میں ہزاروں جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد بھی بے شمار جنگیں ہوئیں اور تاریخ میں ان جنگوں کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔ لیکن کسی جنگ کے بارے میں یہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے اس موقع پر آنے والے مردار خور پرندوں کا تذکرہ کیا ہو اور ان کی شکل و صورت اور قد وغیرہ کا اتنی باریکی سے تذکرہ کیا ہو۔ اگر جنگ کے موقع پر چڑیوں کا آنا ایک معمول تھا اور واقعہ تھا تو اسے اتنی اہمیت دینے اور ان کی شکل و صورت، رنگ، چوچ کی ہیئت اور قد وغیرہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ روایتوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ فیل کے موقع پر ضرور کوئی غیر معمول اور غلاف معمول بات پیش آئی تھی۔ اسی لئے راویوں نے اہمیت دے کر چڑیوں کا تذکرہ کیا۔

قرآنی الفاظ اور اسالیب سے استشہاد :

(۱) مولانا امین احسن اصلا م، صاحب نے لفظ ترمی سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے :

ترمی کا فاعل ہمارے نزدیک قریش ہیں جو اہم ترکے مخاطب ہیں فعل ترمی چڑیوں کے لئے کسی طرح موزوں ہے ہی نہیں، چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگوں سے سنگریزے تو کھا سکتی ہیں لیکن اس کو ترمی نہیں کہہ سکتے۔ رمی صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو

یا ناخن کا زور استعمال ہو یا ہوائے تیز و تند تھپڑے برس کے
ساتھ ہوں۔ ۵۷

مولانا اصلاحی کے آخری جملے سے خود ان کے اعتراض کی تردید ہو رہی ہے۔
ابو قیس بن اسلمت یثربی جاہلی کے جو اشعار اوپر گزرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس
وقت خدائی فوجوں نے لشکر ابرہہ کو پسایا اس وقت تیز و تند ہوا بھی چل رہا
تھی اس لئے چڑیاں جب اوپر سے پتھر گرائی تھیں تو تیز ہوا کی وجہ سے ان میں رمی
کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مشہور محدث ابن ابی حاتم کی نقل کردہ روایت سے بھی
یہی معلوم ہوتا ہے :

عبد بن عمر کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی
اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر بڑھا گئے
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے سے
پرے باترے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں
سنگریزے تھے۔ انھوں نے اول تو آواز ادا پھر لشکر پر سنگریزے
مارنے لگے۔ ساتھ ہی تیز و تند ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر
کے نصیب غلٹی بنا دیا۔ ۵۸

سیرت ابن اسحاق میں نفیل شہمی کا جو شعر ہے اس میں 'ترمی' کا لفظ موجود ہے :
نخشیۃ اللہ لما ۱۱ ایت طبراً ۱۲ وقد فحجا ۱۳ ترمی علیہا
اسی لئے قرآن نے ایجاز و اعجاز کا نمونہ پیش کرتے ہوئے 'ترمی' کا لفظ استعمال

۵۷۔ تفسیر قرآن بستم ص ۵۶۔

۵۸۔ بحوالہ قصص القرآن سیو ہاروی سوم صف ۳۶۸

کیا تاکہ اس ایک لفظ سے پوری صورت حال کی تصویر کشی ہو جائے۔
(۲) ترجمہ سم کا مخاطب کون ہے ؟ اس سلسلے میں مولانا فرماتے

ہیں:

”ہمارے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا یا اس کو بطریق تواتر سنا کر اس پر یقین رکھتے تھے۔ یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے گویا واحد کا لفظ ایک ایک کر کے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں... (کبھی کلام واحد کے صیغے سے شروع ہوتا ہے اور پھر جمع کی ضمیر آتی ہے کیونکہ واحد سے مقصود جمع ہوتی ہے) کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے لیکن اس سے مقصود بھی جمع ہوتی ہے“ ۱۴

”خطاب کبھی نبی سے بحیثیت امت کے امام اور ترجمان ہونے کے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے خواہ تمام لوگ یا ان کی ایک جماعت اور کبھی خطاب بذات خود لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں خطاب واحد کے صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد نبی کے واسطے کے بغیر پوری امت ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نبی کے بعد آیا ہے اور کبھی پہلے، یہ اتفاقات کے طریقے پر ہوتا ہے“ ۱۵

پھر مولانا نے قرآن کے اس اسلوب کی متعدد مثالیں تفسیر سورہ فیل اور اسالیب القرآن

۱۴۔ تفسیر سورہ فیل صفحہ ۱۳-۱۴

۱۵۔ اسالیب القرآن فرامی صفحہ ۱۵-۱۶ دائرہ حمید یہ مراۓ میر اعظم گڑھ

میں دیکھیں، مثلاً :

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْغُلَّكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ نِعْمَةً اللَّهُ لِيَكُمْ مِنْ

آيَاتِهِ (لقمان - ۳۱)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ، إِنَّ يَشَاءُ

يَذْهَبُ بِكُمْ وَيَأْتِي بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (ابراہیم - ۱۹)

إِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُوا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ

وَهُمْ يَصْطَرُونَ (الأعراف - ۱۹)

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا،

إِذَا يَبْلُغُ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا

أَفْ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (اسرار -)

مولانا نے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں دی ہیں لیکن ان تمام مثالوں کا
استقرار کرنے سے ایک دوسرا ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خطاب کبھی واحد کے
صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے لیکن وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ
اور اشارہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اس واحد کے
صیغے کے بعد یا اس سے پہلے جمع کا صیغہ ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
واحد کا صیغہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ غالباً قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں
جس میں کوئی ایسا قرینہ نہ پایا جاتا ہو اس کے باوجود واحد کا صیغہ جمع کے
معنی میں ہو۔

یہاں یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ سورۃ فیل میں اَلَمْ تَرَ سے مراد
جمع ہے اس لئے اس کے بعد تَرْسِمْسُ بھی جمع (ترموسم) کے معنی میں ہے
اس لئے کہ اَلَمْ تَرَ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اَلَمْ تَرَ کے الفاظ قرآن میں

اکتیس^{۳۱} مرتبہ آئے ہیں۔ قرآن یہ اسلوب اس وقت اختیار کرتا ہے جب کسی اہم بات کی طرف اشارہ کرتا^{۳۲} اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے:

کسی اہم اور مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا: عاد و ثمود (الفجر - ۶) نمرود (البقرہ - ۲۵۸) بنی اسرائیل (البقرہ - ۲۴۳، ۲۴۶) اصحاب الفیل (فیل - ۱)۔
یا اہل کتاب (آل عمران - ۲۳) منافقین (النسار: ۴، ۷، ۱۳، ۸) المجادلہ (۱۴، ۸) مشرکین (ابراہیم - ۳۸، مریم - ۸۳، موسیٰ - ۶۹)

شعراء (الشعراء - ۲۲۵) کے رویہ کی طرف توجہ دلانا۔

یا اللہ کی صفات کی طرف متوجہ کرنا (ابراہیم: ۱۹، ۲۴ المجادلہ - ۷)

یا آثار کائنات کی طرف توجہ مبذول کرنا (الحج: ۱۸، ۲۳، ۴۵ النور: ۱، ۲۴)

الفرقان - ۳۵ لقمان ۲۹ - ۳۱ فاطر - ۲۷ الزمر - ۲۱)

”فخر الرازی نے لکھا ہے:

”المراد من الرویۃ العلم والتذکیر وهو اشارۃ الی ان الخیر
یہ متواتر، فكان العلم الحاصل بہ ضروریاً مساویاً فی القوۃ
والجلال للرویۃ“ نہ

[دیکھنے سے مراد عیاں تائید دہانی کو نا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس چیز کی خبر دی جا رہی ہے وہ تواتر سے ثابت ہے اس لئے اس سے جو علم حاصل ہو رہا ہے وہ قوت و وضاحت میں رویت کے مساوی ہے]

”مولانا فراہی نے بھی یہی لکھا ہے کہ :

”کسی امر کا اقرار کرانے کے لئے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے جب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہمد بات کا ذکر آتا ہے۔“ لہ

معلوم ہوا کہ یہ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے اسے عام ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا۔

(۳) ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ ناشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہئے تھی۔
”تَرْمِيهْم بِحِجَارَةٍ مِّن سَجِيلٍ فَيَجْعَلُهُم كَعَصْفٍ مَّا كُولٍ وَارْسَلْ عَلَيْهِمْ طِيْرًا اِيَّا بَيْلٍ“ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن ^{صلواتی} فرماتے ہیں :

”یہ سوال جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوب بلاغت سے نا آشنا ہیں وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجہ خیر یا شرکی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے اس کو فعلن کی پوری تفصیل سے پہلے ظاہر کر دیتے ہیں دناؤں کی قبولیت ظاہر کرنے کے لئے قرآن نے یہ

اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آئے ہیں۔ یہاں سورہ نوح سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ قال نوح رب انهم عصوني واتبعوا من لم يزدده ماله وولده

الاحسار... ما خطیئنا ثم اغرقوا فادخلوا ناراً، فلم
 یجدوا من دون اللہ الصادا۔ وقال نوح رب لا تذر علی
 الذم منی من الکافرین دنیا (نوح ۲۱-۲۶) ان آیات پر تدبر کی
 نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح کی دعا کے پہلے ہی فترے کے بعد ان
 کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی دعا موخر کر دی گئی ہے حالانکہ انجام
 پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی
 ہے کہ قبولیت دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے ترتیب کلام میں تقدیم و تاخیر
 کر دی گئی بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابرہہ کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے
 لئے ان پر چڑیوں کے بھیجے جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر
 اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر امتنان و احسان کا تھا اس وجہ
 سے بغاوت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بد انجامی کی تصویر پہلے سامنے آجائے۔
 مولانا اصلاحی نے سطور بالا میں جس اسلوب بلاغت کی طرف اشارہ کیا ہے
 ہمارے نزدیک سورہ فیل میں وہ اسلوب نہیں پایا جاتا بلکہ ایک دوسرا اسلوب
 ”تفصیل بعد الاجمال“ پایا جاتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ پہلے
 قرآن ایک واقعہ اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کے بعد اسی کو تفصیل سے
 بیان کرتا ہے جیسے سورہ کہف کی یہ آیات ملاحظہ ہوں :-

”اُمّ حسیۃ ان اصحاب الکھف والرقیم کا نوا من ایاتنا عجبا،
 اذ اوی الفتیۃ الی الکھف فقالوا ربنا آتنا من لدنک رحمۃ
 وھیتی لنا من اُمرنا، ثم اذا هم فی الکھف

سنین عدداً، ثم بعثناهم لنعلم أَى الحزبين احصى لما لبثوا
أمدًا، نحن نقص عليك بنأهم بالحق، إهم فتية آمنوا بكم
ونادهم هدى ... الخ (الكهف ۹-۲۶)

پہلے قرآن نے اجمال کے ساتھ بتلایا کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی اور ہم نے
انہیں سالوں سلائے رکھا۔ پھر انہیں بیدار کیا تا کہ وہ دیکھیں کہ وہ بیان کے
کہیں زیادہ دنوں تزیف پہ پا۔ اس کے بعد پھر سے اصحاب کہف کا قصہ
تفصیل سے بیان کیا۔ یہی اسلوب سورہ فیل میں بھی ہے۔ پہلے قرآن نے
اجمال کے ساتھ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کے کید کو ناکام
کر دیا پھر اس کی تفصیل یہ بیان کی کہ اس نے چڑائیوں کو بھیج کر سنگباری کے
ذریعہ تھس تھس نہس نہس کو کے کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ اس طرح ان کا
منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ :-

مولانا فراہی نے ایک فصل میں تاویل میں غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ
لیا ہے۔ لیکن وہ سراسر عقلی اور بے بنیاد ہے۔ ایک مثال یہاں ذکر کی جاتی ہے
اسی پر مولانا کے ذکر کردہ دوسرے اسباب کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔
لکھتے ہیں :

”بعض لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں انھوں نے چڑیوں اور پتھروں کا
ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے اس سے بعض سننے والوں کو گمان ہوا کہ یہ
پتھر چڑیوں ہی نے پھینکے۔ اور ممکن ہے کہ بعض دیکھنے والوں کو بھی یہ شبہ
ہوا ہو اور انھوں نے اپنے خیال کے مطابق واقعہ کو بیان کر دیا ہو۔“

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا عذر واضح ہے۔ سنگباری کے جو نتائج ظہور میں آئے وہ عربوں کی سنگباری کے اعتبار سے بہت زیادہ تھے۔ اہمہمہ کی پوری فوج کا بھٹس کی طرح پامال ہو جانا قریش کی سنگ اندازی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ سنگ باری آسمان سے ہو رہی ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو تمام فضا چڑیوں سے بھری ہوئی تھی اس وجہ سے خیال ہوا ہوگا کہ ہونہ ہو یہ ان ہی چڑیوں کا کوشمہ ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے یہ روایت سنی انہوں نے آیت کو بھی اسی پر محمول کر دیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح تھا کہ یہ آسمانی سنگباری عربوں کی سنگباری کے پردے میں ہوئی ہے۔

ایک دوسری جگہ بھی اسی قسم کی قرآنی کن ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے : ”جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل و صورت ، ان کا رنگ ، ان کی چونچوں کی زرد گوئی ، ان کا لاشوں پر گرنا سب کچھ بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بیان عین شہادت پر مبنی ہوگا۔ باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگوں میں پتھرا ٹھائے ہوئے تھیں تو یا تو انہوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کر لیا کہ یہ چڑیاں پکینک رہی ہیں یا تو میہم کی ضمیر کا مرجع انہوں نے طیرا کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کئے بغیر آیت کی جو تاویل ان کے ذہن میں آئی اسی سانچہ میں انہوں نے قصہ کو ڈھال دیا۔“

مولانا کے اس طرز تحقیق پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ جب عینی شاہدوں کو ماقاب میں اعتبار قرار دیا جائے تب تو بڑی آسانی سے کس بھی واقعہ کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیکھنے والوں نے صحیح دیکھا، بتائے والوں نے صحیح بتایا اور سننے والوں نے صحیح سنا۔ کسی سے کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوتی۔ اس زمانے کے راویوں سے زیادہ تسریحات اس سلسلہ میں اس لئے نہیں ملتی کیونکہ اس پر انھیں عین الیقین اور علم الیقین حاصل تھا۔ ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ ہوگا کہ ایک زمانہ میں یہ چیز بھی معرض بحث بن جائے گی کہ چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے آئی تھیں یا لشکر ابرہہ کی لاشوں کو کھانے۔

مولانا فراہی کی تاویل پر اعتراضات :

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ توہمیں مسجد کا مخاطب اہل مکہ کو مان کر یہ کہنا کہ چڑیاں لشکر ابرہہ پر سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں، صحیح نہیں۔ سورہ فیل کے الفاظ اور اسلوب میں غور کرنے سے بھی اس تاویل کی غلطی واضح ہوتی ہے۔ ذیل میں اسے ہم اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

(۱) سورہ فیل کی پہلی آیت ہے : اَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِصَحَابِ الْفِيلِ۔

اس میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ قرآنی دستور سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو وہاں عذاب اور سزا کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ عذاب انسانوں کے ذریعے یا ان کی مروت میں نہیں ہوتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ آندھن طوفان بھیج کر اور احرام سہاوی و

ارتی مسلط کر کے ہلاک کرتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں :

الفجر - ۵ : اَلَمْ تَزَكِّیْ فَعَرَّ سَرْبُكْ بِعَاد

ابراہیم - ۴۵ : وَتَبَّیْنَ لَکُمْ کَیْفَ فَعَلْنَا بِہُمْ وَحَنَرْنَا لَکُمُ الْاُمَثَالَ

المسلسلات - ۱۸ : کَذٰلَکَ نَفْعِلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ -

الصافات - ۳۳ : اِنَّا کَذٰلَکَ نَفْعِلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ -

شروع کی تین آیتوں میں گزشتہ قوموں کی ہلاکت کا تذکرہ ہے اور مومنین کو آیت

میں جہنم کے عذاب کا بیان ہے۔ یہی معنی سورہ فیل کی آیت میں بھی پایا جاتا ہے لیکن

مولانا فراہی کی تاویل ماننے کی صورت میں عذاب میں انسانوں کی شرکت و معاونت لازم

آتی ہے اور معصوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابراہیم پر سنسپاری کی اور اس کے پردے

میں اللہ نے ان کو ہلاک کیا۔

(۲) سورہ فیل کی تیسری آیت ہے : وَاسْرَسَ عَلَیْہِمْ طَیْرًا اُبَابِل

قرآن میں جب ہم اس آیت پر عمل کرتے ہیں تو معصوم ہوتا ہے کہ اسے یا تو

غلبہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے یا لغو۔ یا عذاب کے مفہوم میں۔ اول الذکر مفہوم

کی مثالیں :

مریم - ۸۳ : اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیَاطِیْنَ عَلَی الْمَکْرِیْمِیْنَ تَوْنَاهُمْ اِنَّمَا

النساء - ۸۰ : وَحَن تَوْنٰی فَاٰتٰہُمْ سُلٰتٰی عَلَیْہُمْ حَفِیْظًا - مزید دیکھئے

الشوری - ۴۸ -

الاسرار - ۵۳ : وَہٰی سَیِّئَاتٌ عَلَیْہُمْ وَکَیْلًا

الانعام - ۶۱ : ہُوَ الْقَہَرُ فَوْقَ عِبَادَہِ وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً

انعام کے مفہوم کی مثالیں :

ہود - ۵۲ : یٰۤاَقُوْمُ اسْتَغْفِرُوْا لَہُمْ ذُنُوْبَہُمْ تَوْبُوْا اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَاءُ

علیکم مدام ادا

[مزید دیکھیے: نوح - ۱۱، الانعام - ۶]

ان کے علاوہ دیگر تمام آیتوں میں عذاب کے معنی میں آیا ہے جیسے:

الاعراف - ۱۳۳: فأرسلنا عليهم الطوفان والجراد....

۱۴۲: فأرسلنا عليهم رجنا من السماء

العنكبوت - ۴۰: فمنهم من أرسلنا عليه حاصبا أزید دیکھیے القمر ۸۸

الاسرار - ۶۸، الملک - ۱۷]

الاحزاب - ۹: فأرسلنا عليهم ريحا وجنودا لم تروها [مزید دیکھیے

حم السجده ۱۴، الذاریات - ۴۱، القمر - ۹]

سبا - ۱۶: فأرسلنا عليهم سیں العرم

القمر - ۳۱: إنا أرسلنا عليهم صيحة واحدة

الذاریات - ۳۳: لنزّل جردة من طیر

الاسرار - ۶۹: فیوس علیکم قسفا من الريح

الکہف - ۴۰: فیرسل علیکم حسبا من السماء

سورۃ فیل میں بھی "أرسل علی" عذاب کے معنی میں ہے جیسا کہ خود مولانا فراہی نے

بھی لکھا ہے: أرسل علیہم، حرف علی میں یہاں غلبہ اور ضرورتوں کا مفہوم پہچان

ہے۔ "لہ" فقرہ رازی نے بھی فعلی ارسال کے عذاب کے معنی میں ہونے کا اشارہ کیا ہے۔

لیکن مولانا فراہی کی تاویل کی صورت میں عذاب کا مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔ مولانا کہتے

۱۔ تفسیر سورۃ فیل ص ۴۔

۲۔ تفسیر کبیر رازی ۱۰۱/۳۲

ہیں کہ لشکرِ ابرہہ کو اللہ تعالیٰ نے حاسب کے ذریعہ ہلاک کیا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے چڑیاں بھیجیں۔ گویا چڑیاں عذاب کے لئے نہیں بلکہ دفعِ مہرت کے لئے بھیجی گئی تھیں تاکہ اہل مکہ کو پیش آنے والا کالیف اور پریشانیوں دور ہو جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل مکہ کا جین دو بھر رہتا تا کہ جبکہ قرآن اُرسلی علیٰ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور قرآنی مستقر سے معلوم ہوا کہ قرآن اسے عذاب کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔

(۳) سورہ فیل کی چوتھی آیت ہے: **ترمیہم بحجارة من سجيل**۔ اس آیت سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ ”ترمیہم بحجارة“ اہل مکہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اس میں سجیل کی قسم کے پتھروں کا تذکرہ ہے۔ اگر سنگباری اہل مکہ نہ کی ہوتی تو ”من سجيل“ کا قید لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف ”ترمیہم بحجارة“ کہنا کافی تھا۔ حضرت ابن عباس کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ سجیل فارسی الفاظ سنگ اور گل کا معرب ہے۔ عربی زبان میں کنکر پتھر کے لئے تعدد الفاظ آتے ہیں لیکن ان میں سے صرف سجیل کا استعمال خاص معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سجیل کی قسم کے پتھر مکہ و نواح کے یہاں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر آخر اہل مکہ سنگباری کرنے لئے کہاں سے آئے تھے؟

یہ استدلال مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی نے بھی کیا ہے۔ اس پر جناب نسیم ظہیر اصلاحی صاحب نے بڑا مضحکہ خیز تبذیر کیا ہے۔ جن باتوں میں بحجارة من سجيل اور حجارة من طين کے الفاظ آئے ہیں انہیں نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

”ان باتوں میں غریب باندہ کا ذکر ہے۔ جن کو ایسی رشیدی اور تباہ کن آئمہ کے ذریعے ہلاک کیا گیا تھا جو اپنے ساتھ سجیل کے قسم کے پتھر لے ہوئے

آئی تھی اور مسلسل کئی روز تک چلتی رہی۔ یہ قومیں عرب تھیں اور
سرزمین حجاز میں آباد تھیں۔ انھیں ہلک کر نے والی آندھی کہیں
دور دراز سے کنکر پتھر لے کر نہیں آتی تھی بلکہ وہ جن راستوں سے
گزرتی تھی انھیں میں پڑے ہوئے کنکر پتھر اپنے ساتھ لٹاتے ہوئے
چلتی تھی اب اگر اس علاقے میں سبیل کی قسم کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے
تھے تو سول پیدا ہوتا ہے کہ یہ آندھیاں بھی اپنے ساتھ سبیل کے
پتھر کہاں سے لائی تھیں۔ پتا نہ چلتا۔

یہ ایک قش غلطی ہے۔ قرآن مجید سورہ فیل کے علاوہ دو جگہ اور حجازہ
من سجیل کے الفاظ آئے ہیں (سورہ ۱۰۸۲ النجر - ۷۴) اور ایک جگہ حجازہ
من مدین کے الفاظ ہیں (الذاریات - ۳۳) تینوں جگہ مراد قوم لوط ہے۔ تاریخ
اور جغرافیہ سے ادنیٰ سی بھی واقفیت رکھنے والا جانتا ہے کہ قوم لوط حجاز میں
نہیں بلکہ حجاز سے سینکڑوں برس دور شام میں بحر مدار (DEAD SEA)
کے کنارے آباد تھی۔ اس لئے قوم لوط کو قلم کے کنارے پر نہ زمین حی میں آباد
کردینا سخت غلطی ہے۔

نئی تاویل کا سبب :

مولانا فرہانی کی تفسیر سورہ فیل کا مطالعہ کرتے وقت بار بار یہ خیال ذہن میں
آیا کہ آخر مولانا کے ذہن میں یہ عجیب و غریب تفسیر کیسے آئی۔ جبکہ کوئی روایت
ساتھ نہیں دیتی۔ تفسیر کی کسی کتاب میں ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا اور

امت کی تاریخیں کسی کی جانب سے یہ رائے سامنے نہیں آئی۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اشعار عرب کے وسیع و عمیق مطالعہ کے نتیجہ میں مولانا کے ذہن میں عربوں کی اخلاقی عظمت، شجاعت و بہادری، شہسواری اور شمشیر زنی کی تصویر متسم ہو گئی تھی۔ اس لئے ان کو شبہ ہوا کہ انھوں نے لشکرِ ابرہہ سے ضرور مقابلہ آرائی کی ہوگی۔ اسی کو بنیاد بنا کر مولانا نے اشعار عرب میں سے مجمل اشعار لے لئے اور انھیں اپنے مدعا پر دلیل بنا دیا، اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر سورہٴ فیل پر نظر ڈالی اور جو جو اشکال آتے گئے انھیں قرآن کے مختلف اسالیب، قواعد نحو اور عربی اشعار سے حل کرتے گئے۔ اور جو روایتیں ان کے خلاف ملیں۔ انھیں ”بے بنیاد، غلط، لرغوی“ قرار دے دیا۔ اور اس طرح تانے بانے بناتے بناتے سورہٴ فیل کی ایک ایسی تفسیر وجود میں آئی جو حقیقت کے بالکل برعکس تھی۔ مولانا کے اس خیال کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے :

”دنیا کے پردے پر کوئی قوم ایسی نہیں جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو۔ پھر اس سے اس بے جنتی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے اپنا معبود دشمنوں کے حواریوں کے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے تمیزی کا گدن تو ہم دنیا کی ادنیٰ قویوں کی نسبت بھی نہیں کر سکتے تو قوم قریش و بنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کر سکتے ہیں جن کا تادمہ سرمایہٴ فخر و ناز ہمیشہ شہسواری، شمشیر زنی، در قدر اندازی ہی رہا ہے یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر اپنے آئنے نہیں دی۔“

اہل مکہ کے لشکر ابرہہ سے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم ابدر میں بیان کر چکے ہیں۔ مولانا فراہی کا یہ استدلال سراسر عقلی اور قیاسی ہے۔ تاریخ کے کسی واقعہ کے ثبوت کے لئے محض قیاس کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے تاریخی شہادت مطلوب ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اس سلسلہ میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بلکہ میلانا کی فرض کردہ صورت پر کئی اعتراضات پڑتے ہیں:

(۱) کلام عرب میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل مکہ نے ابرہہ سے اپنے مقابلہ کا ہاکی سا ہی نہ کر دیا ہو۔ بعد میں بھی بہت سی جنگیں ہوئیں لیکن کبھی اہل مکہ نے فوج کو ابھارنے اور جوشش دینے کے لئے یہ نہیں کہا کہ ”مقابلہ کرو جس طرح تم نے ابرہہ سے مقابلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔“ تمام اشعار میں لشکر ابرہہ کی تباہی کو صرف اللہ کا کرشمہ کہا گیا ہے۔ ذوالرمتہ کے اشعار میں مقابلہ کا جو ذکر ہے اس کے سلسلے میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس میں پہلے ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

عبدال مطلب نے دعا کے وقت کہا تھا:

يا هاب لا ارجو لهم سواك ويا رب فامنع منهم حماك

[اے رب ان کے مقابلہ کے لئے مجھے تیرے سوا کسی سے امید نہیں ہے اے

رب ان سے اپنے گھر کی حفاظت فرما]

انھیں کا شعر ہے:

منعت أبرهة الأرض التوحيت من اللدائم ثم تخلق لهود اندا

مغیرہ مخزومی کہتا ہے :

انت حبست الفیل بالمغس اهلكت ابى يكسوم والمغلس
 كردستهم وانت غير مكروس نل عسهم وانت غير مدعس
 [تو نے ہاتھی کو مغس کے مقام پر روک دیا اور تو نے ابویکسوم اور
 مغلس کو ہلاک کر دیا۔ تو نے ان کی ہڈیاں اور جوڑ بند توڑ دیئے،
 تو نے انھیں پامال کر دیا اور دندالا اور ان کا تخریبی منصوبہ کامیاب
 نہ ہوسکا]

طالب بن ابی طالب بن عبد المطلب کا شعر ہے :

الم تعلموا ما كان في حرب واحس وحيش ابى يكسوم اذ ملئوا الشعبا
 فلولاد فاع الله لا شئ غيرة لا صبحتم لا تمنغون لكم سريرا
 [کیا تمھیں معلوم تھیں کہ واحس کی جنگ اور ابویکسوم کے لشکر کا کیا انجام
 ہوا۔ جیب انھوں نے وادی کو بھر دیا تھا۔ اس وقت اگر اللہ تعالیٰ
 انھیں دفع نہ کرتا تو تم قوم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے]
 ابوامیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے :

حبس الفیل بالمغس حتی ظل یحبو کاتہ معتور
 [اس نے ہاتھی کو مغس میں روک دیا یہاں تک کہ گھٹنوں کے بل اس طرح
 چلتا تھا جس طرح وہ اونٹنی چلتی ہے جس کی کوئی پیچ کاٹ دی گئی ہوں۔]

۱۔ سیرت ابن ہشام

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

یہ اور ان کے علاوہ دیگر تمام اشعار میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ اور شکر ابرہہ کی پسپائی کو اسی کا کوشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اہل مکہ کے مقابلہ کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

(۲) ہر دیا نہ سنگ اندازی کی جو صورت فرشتہ کی گئی ہے تاریخی نہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر اہل حجاز اس طریقہ کے نادار ہوتے تو اس سے پہلے ہونے والی جنگوں میں بھی اس طریقہ جنگ کے اختیار کرنے کا تذکرہ کلام عرب میں ملنا چاہئے۔ اور اگر انھوں نے پہلی مرتبہ یہ اختیار کیا تھا تو بھی اس کی مسرت ضروری ہے اور کلام عرب میں اس کا بھی حوالہ ملنا چاہئے۔

(۳) عربوں کی شجاعت و بہادری، ہمت و دلیری، غیرت و حمیت، شہسواروں و شمشیر زنی اور حریت پر ہیزی کی داستانیں بجا۔ لیکن محض اس کا بنیاد پر تاریخ گر مہنا اور حقائق کے برخلاف نئی تصویر پیش کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کے لئے ٹھوس تاریخی حقائق مطلوب ہیں۔ تاریخ، سیرت، درجہ بیشہ کی کتابوں میں فتح مکہ کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ کے ہمراہ مدینہ میں داخل ہوئے تو وہیں مکہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ صرف حضرت خالد بن الولیدؓ کے دستہ سے بہت معمولی سی جھڑپ ہوئی۔ اب اگر کوئی اہل مکہ کی شجاعت و حمیت کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان جگہ ضرور ہوئی ہوگی تو اسے تاریخ بیانیہ نہیں۔ تاریخ سازی ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہی حال و قوائیل کا بھی ہے۔ تاریخی ثبوت نہ ہونے کے باوجود محض اہل عرب کی شجاعت کی داستانوں کی بنیاد پر ان کی معرکہ آرائی ثابت کرنا بعید از صواب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مکہ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مکہ پر کسی ناحق شخص کو مسلط نہیں کرے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ پر فتح پائی تو فرمایا:

”ان اللہ جلس عن مکة الفیل ، وسلط علیہا رسولہ
ولاحین وانہ قد عادت حرمتہا الیوم کحرمتہا
بالامس“۔^۱

[اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روک دیا اور اپنے رسول اور اہل ایمان
کو اس پر تسلط بخش دیا۔ آج مکہ کی حرمت اسی طرح ہو گئی ہے
جیسے کل تھی]

فتح مکہ کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اس کی ایک وجہ
یہ بھی تھی کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ حضور حق پر ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ
نے انھیں مکہ پر غلبہ بخش دیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے :

”اتركوا وقومہ فانہ ان ظہر علیہم فہو نبی
بصادق“۔^۲

[انھیں ایسی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر
وہ غلبہ پا جائیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سچے نبی ہیں]

پیشین نظر مقالہ میں مولانا قزاقی کی تفسیر سورہ فیل کے صرف متعلقہ مباحث پر
گفتگو کی گئی ہے۔ ورنہ واقعہ فیل کے سلسلے میں دوسری رائیں اور بعض دوسری جزئیات
بھی ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں قلم اندازہ
نہ کر رہے ہیں۔

مولانا قزاقی نے اپنے انہی رسالہ کے آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

ہے کہ مناسک حج میں 'رجی حجلہ' کا اضافہ و ناقہ فیل کے یعداس کی یادگار کے طور پر کیا گیا
اور اسلام نے اسے باقی رکھا۔ اس پر ائمہ نے ایک دوسرے مقالہ میں بحث کی ہے جو
"مناسک حج کی تاریخ" کے عنوان سے ماہنامہ "حیات نو" اعظم گڑھ کے مئی ۱۹۸۷ء
کے شماروں میں شائع ہو گیا ہے۔ واللہ ولی الحق وهو ہادی السبیل۔
ختم شد

معذرت

مجھے اس بات کا بے حد دکھ اور احساس ہے کہ "برہان" کے سابق مرتب جناب مرحوم جمیل علی
کے انتقال کے بعد میں ذہنی طور پر انتشار کا شکار بن چکا۔ ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں جناب سید
شہاب الدین ندوی کا جو مقالہ شائع ہوا ہے اسے بین السطور دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور تم
قبیلہ قاضی جی میر اعزازی ہی غلط کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مذکورہ شمارہ میں ہی مقدمہ ادب
جناب نقیل احمد صاحب کے مضمون میں بھی بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں جو پھر حال "برہان" کے
معیار اور مزاج کے مطابق نہیں مثلاً داماد، صاحبزادی اور صاحبزادوں نے حضرت مفتی صاحب
کی بڑی خدمت کی "مفتی صاحب" کی اولاد کا یہ اولین قرینہ تھا یہ کوئی احسان نہیں۔
احسان تو قوم و ملت کے ان اکابر اور بزرگوں کا ہے جنہوں نے ملت کے تعلق سے بے لوث خدمات
انجام دیں، وغیرہ۔ نیز سابقہ سالوں میں جناب اظہر صدیقی یا متفرق معاصر اخبارات میں نیا
وغیرہ میں غیر موزوں جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیر سلی چیریں برہان میں
شائع ہونا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اس طرح کی تمام تحریروں کو کالعدم سمجھا جائے
اور ادارہ کی فروگزاشت کو نظر انداز کر کے معذرت قبول کی جائے۔

(عمید الرحمن عثمانی)

تاریخ اسلام

خلافت راشدہ دوسری امیر
(آخری قسط)

اتر حجاب عبدالرؤف خاں صاحب ایم۔ اے، اودنی کلاں

پروفیسر خورشیدا حمد فارق صاحب نے اپنی معنون بالا تصنیف میں کئی مقامات پر ”جہاد“ کی خالص مادی و اقتصادی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے اس کے اعلیٰ و ارفع روحانی مقصد کو سراسر معکوس اور متعاقب کر دیا ہے۔ مثلاً ص ۱۳۵ پر عنوان ”مسلمانوں کی اقتصادی حالت“ کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

”ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ردہ بغداد میں زد کر کے جب عراقی دشامی سرحدوں پر فوج کشی کی اور کئی نئے محاذ کھل گئے تو سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا، امان کی ترغیب پر حجاز دین کے درجنوں مغلوک الحال عرب قبیلے جنگ میں شرکت کے لیے آگے آئے، تھے اور وسائل سے بھرپور دونوں پڑوسی ملکوں کی سرحدیں جنگیں جیت کر فقر و ناداری سے نجات پا چکے تھے..... عمر فاروق کے عہد میں عراق، شام، فارس، عیسوی و طامیہ اور مصر میں بہت سے نئے محاذ کھلے اور بڑی بڑی جنگوں کی تیاریاں ہوئیں تو پھر سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا..... عمر فاروق کی پکار پر..... بہت سے عرب جو ناداری کا شکار تھے اور بہت سے قبائلی رئیس جن کے دل میں کارہائے نمایاں کر کے دولت، عزت اور مرتبے حاصل کرنے کی لگن تھی، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پکار پر اپنی ریگستانی بستیوں سے نکل آئے اور خلافت کی فوجوں میں ضم ہو گئے“ اس سے پیشتر ص ۷۰

پیر نمبر ۲ پر بھی یہ تغیر خفیف یہی بات سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔

فاضل پروفیسر صاحب نے جہاد اور بدوی قبائل کے اسلامی اسلامی افواج میں انضمام کا وہی مقصد قرار دیا ہے جو مشہور مستشرق سرہملٹن الیگزینڈر گب، متوفی ۱۹۷۱ء نے اپنے ایک مقالہ "اسلامی تاریخ کی تعبیر"

(An Interpretation of Islamic History)

میں واضح کیلے کہ "چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات میں استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لیے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دیا گیا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دیوی مغارہ وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصد گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو ان پر اس کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔"

بدوی قبائل کے خلافت کی فوجوں میں ضم ہونے اور ان کے اسلام قبول کرنے نیز مقصد جہاد کی تعبیر و توضیح میں مذکورہ دونوں بیانات پڑھنے کے بعد قارئین برہان پر یہ بات غفی نہیں رہنی چاہیے کہ مستشرقین کے صفِ اول کے اسکالر سرہملٹن گب

نے مقالہ بعنوان "سرہملٹن الیگزینڈر روسکین گب، از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، بابت ماہ اکتوبر

اور پروفیسر قارق صاحب کے طرزِ نگارش میں کتنی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے۔ گویا: **ٹھ** میری زباں میں رنگِ تمہاری زباں کے ہیں

جہاد کے مبنیہ مقصد پر خاکسار اقم الحروف اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کے بجائے محترم پروفیسر ضیاء الحسن قاروتی صاحب کے الفاظِ مستعار میں عرض کرتا چاہے گا کہ ”تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتاسر معاشی و مادی اندازِ فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دین اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کار فرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اُس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنا یا بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد و وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا..... جہارے نزدیک یہ رویہ فنِ تاریخ نگاری کے ہمہ گیر اصولوں کے مطابق کبھی نہیں ہے اس لیے کہ اس رویہ سے اُسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر جدید محققین ناز کرتے ہیں یہ مورخ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنے پیشرو مورخین کے بیانات کو ”باندھ دگر“ پیش کر دے بلکہ اُسے تمام تر حالات کے تجزیے سے اسباب و علل اور اُن کے اثرات و مضمرات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنی چاہیے جو واقعات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ بہر حال جہاد کے اقتصادی مقصد کی مزید توضیح فرماتے ہوئے ص ۶۔

۲۴۵ پر راز ہیں: ”اسلامی معاشرے کو جس ضابطے سے اقتصادی توانائی و سیاسی عروج حاصل ہوا وہ دربارِ خداوندی میں مورتیوں کے تقرب کے قائل یا رسول اللہ کی نبوت سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ و قتال کا ضابطہ تھا۔ اسے رسول اللہ کی زندگی میں بے حد اہمیت حاصل تھی وہ جب تک چھے

اس ضابطے پر بڑی تندہی سے عمل کرتے اور کراتے رہے اور اس کی توثیق و تاکید
برابروہی کے ذریعہ ہوتی رہی۔ کَتَبَ عَلَیْکُمْ الْقِتَالَ وَهُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ۔

(لوقہ ۲۱۶) تم پر جنگ و قتال فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔
وَ قَاتِلُوْهُمْ حَیْثُ رَحْتُمْ لَا تَكُوْنُ فِتْنَةً وَ یَكُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

(انفال ۳۹) مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا
کوئی مذہب باقی نہ رہے۔) فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ (توبہ ۵)

جہاں کہیں بھی مورتیوں کی تعظیم کرنے والے تمہیں ملیں انہیں قتل کر دو۔ وَ قَاتِلُوا
الَّذِیْنَ یَلْبِسُوْنَ دِیْنََ الْغَیْبِیِّ بِالْغَیْبِیِّ (توبہ ۱۲۳) اپنے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو۔

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ (انفال ۶)
مغالین سے لڑنے کے لیے جس قدر ممکن ہو فوج اور جنگی گھوڑے تیار رکھو۔

اٰیٰتُهَا الْبَیِّنٰتُ خَرَجَ مِنْهُمُ الْمُنِیْنُ عَلَی الْقِتَالِ (انفال ۶۵) اے نبی مسلمانوں
کو غیر مسلموں سے لڑنے پر اکسلاؤ۔ مدینے کے دس سالہ قیام میں رسول اللہ کے

فوجی اقدامات کا تناسب فی سال سات سے زیادہ رہا۔ انہوں نے بذات خود
عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف تقریباً سوا دو درجن فوجی مہموں کی

خود قیادت کی اور علی اقل التقدير چار درجن انہیں اپنے سالاروں کی کمان میں
بھیجیں، وسائل خورد و نوش کی عام کمی اور قدرت کی طرف سے ملک میں اس

غیر مساویانہ تقسیم کے باعث عربوں میں لوٹ مار اور جنگ و قتال کا رجحان پہلے ہی
بڑھا ہوا تھا۔ اس ضابطے پر عمل اور اس کی پیہم تاکید اور غنیمت سے حاصل ہونے

والے عظیم مالی فوائد کے لیے جنگ و قتال اور جارحانہ ترکاڑا اسلامی معاشرے
کے مزاج اور خمیر کا جوہر لا ینفک بن گیا تھا، ص ۶۹-۷۰ پر بھی بیشتر ازیں بہ ترمیم

۵۳ آیات شریفہ پر خمیر اقم الحروف نے تحریر کی ہے۔ اے۔ روف۔

خفیف محول بالا عبارت ارتقام فرمائی جا چکی ہے۔ البتہ یہاں سورہ برائت کی آیت ۳۹ ”قَاتِلُوا الَّذِينَ يَدِينُونَ... هُمْ صَاغِرُونَ (ظفر و نون)“ کا اضافہ فرماتے ہوئے جنگ و قتال کا اصطلاحی نام ”جہاد“ بتلایا ہے۔ نیز ص ۱۳-۶۱۲ پر بھی جہاد کے اسی مفہوم کا اعادہ بزرعنوان ”جہاد“ کیا گیا ہے مگر یہاں یہ اضافہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ”جہاد ہر مسلمان کے لیے مذہبی فریضہ ہی نہیں تھا جس سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہوتی تھی بلکہ اقتصادی خوشحالی اور دنیوی سر بلندی کا ذریعہ بھی تھا۔ اسلامی معاشرے کی اقتصادی عمارت کی تشکیل عہد نبوی ہی سے منہزم غیر مسلموں کی دولت اور ان کے بال بچوں کی خدمت سے ہوئی تھی جو غلام بن کر غازیوں کے ہاتھ آئے تھے۔ اس دوطرفہ فتنیت کے باعث جہاد اسلامی نفسیات کا جزو لاینفک اور رسول اللہ کے جانشین کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا“

مذکورہ بالا عبارات نو پر بحث میں فاضل پر دفسیر صاحب نے آیات جہاد کو ان کے سیاق و سباق سے کاٹ کر مقصد جہاد کی توضیح اس انداز و اسلوب میں پیش فرمائی ہے کہ قاری کے ذہن پر بقول اکبر الہ آبادی بالالاست یہ تا فرقا ہو تا ہے کہ ”بوسے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے“ ساتھ ہی عکس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مستشرقین کے تمنج اور تائسی میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ یورپین فضلاء کا کہنا ہی یہ ہے کہ عز و مات دسرا پا شوقی شہادت اور اللہ کے دین کی سر بلندی جیسے پاکیزہ جذبات و اعلیٰ مقاصد کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب، نادار، مفلوک الحال اور ننگے بھوکے ہاجرین و انصار کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور ان کی پرانی خوئے التجاج کے تحت لوٹ مار کر کے عظیم مالی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ تھے۔ علاوہ ازیں اقتباسات بالا میں بعض آیات کا ترجمہ بھی غلط نظر ہے،

مثلاً سورۃ انفال کی آیت ۳۹ کا یہ ترجمہ ”مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہے“ اس کے بالمقابل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ ”اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے“ ہماری رسائی کی حد تک دیگر مشاہیر مترجمین نے بھی تقریباً یہ تفسیر خفیف حضرت تھانویؒ کے ترجمہ کے ہم معنی ہی ترجمہ کیا ہے۔ مزید برآں سورۃ برآۃ کی آیت نمبر ۱۲۳ کے صرف درمیانی فقرہ قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُوكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ دَانِے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو پر اکتفاء کر لیا گیا ہے جو علمی وقار و متانت کے متافی ہے۔ موصوف کے بیان کردہ ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ہمسایہ غیر مسلموں سے لڑنے کا جبری حکم دیا جا رہا ہے۔ جو پڑوسیوں سے متعلق قرآنی تعلیمات اور ہدایات نبویؐ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس پوری آیت شریفہ کا ترجمہ یہ ہے، ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہتے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے اور ترجمہ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ) اس کی تفسیر میں مولانا نے مرحوم فرماتے ہیں کہ ”یہاں قریب اور پاس پڑوس سے مراد غیر مسلموں کا وہ علاقہ ہے جو دارالاسلام سے نزدیک ہے یعنی پہلے ان سے لڑا جائے اور پھر ان سے جو دور ہیں“ اور منکرین حق اور کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکار حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلیط میلط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے۔ یہاں ضروری معلوم ہو گا ہے کہ سورۃ بقرہ کی اس آیت کو پیش کر دیا جائے جس میں ہے کہ تمہیں تعظیم القرآن ص ۵۳۹ ج نمبر ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء ایڈیشن نیز تعظیم القرآن ۲: ۲۵۲ حواشی ۱۴۱ تا ۱۴۳ بھی دیکھے جائیں۔

پہلے جہاد کی اجازت دی گئی ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ غنیمت حاصل کرنے کے لیے ”جارحانہ ترکناز“ کی اجازت فرما رہے ہیں یا صرف مدافعت کی۔
 وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (دبقہ ۱۹۰) یعنی ”اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو، واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے“ یعنی یہ جو فرمایا کہ جو تم سے لڑیں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بوڑھے قصداً نہ مارے لڑنے والوں کو مارے۔“ (موضع القرآن) قرآن مجید میں یہ اول آیت ہے کہ جس میں جہاد و قتال کا حکم دیا گیا ہے (حقانی) اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی، وہ یہ ہے: اِذْ نَبَأَ لِبَنِي إِسْرٰءٰلَ يٰۤاٰمَنُوۤا اِنَّمَا فَتَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ هُوَ اَبْسَطُ لَكُمْ ۚ لَا يَمْلِكُ شَيْۤا سِوَا اللّٰهِ ۚ عَلٰۤی اَنۡ تَتَذَكَّرُوۤا (آل عمران ۱۷۵) ”اور ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا“ یہ اور دیگر آیات جہاد اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور پر نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تمام تردقاعی تھا جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے۔
 دراصل پروفیسر فاروق صاحب نے مقاصد جہاد کے استنباط و استنتاج میں بجائے

۱۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ۱: ۱۵۰ ج ۲۰۱ مئی ۱۹۸۳ء ایڈیشن نیز ماہنامہ برہان دہلی
 اپریل ۱۹۸۳ء ص ۹، حاشیہ ۳ مقالہ خلافت ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض
 از جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی تاظم فرقانیہ اکیڈمی ننگر پارہ ۵
 ۲۔ ملاحظہ ہو ”مقالہ“ خلافت ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض از جناب مولوی
 شہاب الدین صاحب ندوی مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت اپریل ۱۹۸۳ء ص
 ۲۰۹ ج ۳ نیز سیرۃ النبی ص ۱: ۵ مطبوعہ ۱۹۸۳ء۔

ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا لالچ نہ تھی۔^۹ رہا سیاسی عروج و
استیلا تو یہ بھی دین حق کی سر بلندی کے لیے ہے نہ کہ ذاتی اغراض و خواہشات
نفسانی کی تکمیل کے لیے۔ جہاد کے سلسلہ میں لذتہ بود حکایت دراز تر گفتیم کی
مصدق قارئین برہان کی سمیع خراشی قدرے زیادہ ہی ہو گئی ہے جس کے لیے راقم
الحروف معذرت خواہ ہے۔ موصوف کی تصنیف میں نہ صرف جہاد بلکہ دیگر
واقعات کے پس پردہ بھی صرف معاشی و مادی محرکات کو ہی نمایاں مقام
حاصل ہے جس سے ذہن پر یہ تاثر پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اس عہد میں
”بے قید جنسی میل ملاپ“ کے سبب معاشرے میں نفسانی شہوات اور ناک و
نوش و تن و تلوش کا غلبہ زائد از ضرورت تھا جس میں لوگ صرف اسیر مرغ و ماہی
ہو کر رہ گئے تھے اور ان کی زندگی کی تمام نگاہوں محض شکم پروری کی حد تک محدود
تھی جس میں زندگی کے اعلیٰ روحانی مقاصد کا یکسر فقدان و بحران تھا۔

تاریخ اسلام، خلافت راشدہ و بنی امیہ کے فاضل مصنف حضرت امام
حسن رضی کی سراری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ، ”اُن کی چھپتی کینزوں کے بارے میں بھی
ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس زمانے میں سراری رکھنے کا عام رواج تھا اور خود
اُن کے والد علی حیدرؒ کی سترہ سراری تھیں اس لیے غالب قریب ہے کہ امام حسن رضی
کے بھی سراری رہی ہوں گی۔“ (ص ۸۲۵) ہمارے انتہائی ناقص و محدود مطالعہ
میں اب تک یہی آیا تھا کہ تاریخ واقعات و حقائق کے تحقیقی مطالعہ کا نام ہے نہ
کہ اظہار و قرائن پر منحصر تحریر کا۔ مگر مذکورہ تحقیق پڑھ کر معلوم ہوا کہ تاریخ مبین

^۹ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از حضرت علی میاں صاحب ادا م

” غالب قرینہ کو بھی بڑا دخل ہے اور مل دتھن کی بیساکھی کا سہارا لے کر آسانی سے کسی بھی تاریخی کردار کی شکل و صورت آسانی سے مسخ کی جاسکتی ہے۔ عرض مدعا یہ کہ جب امام موصوف کی سرکاری کے ضمن میں عصری توارتخ سے کسی قسم کی معلومات ہم نہیں ہوتیں تو پھر ملنی طور پر یہ فرمانا کہاں تک درست ہے کہ اُن کے والد کے سترہ سرائی تھیں ” اس لیے غالب قرینہ ہے کہ امام حسنؒ کے بھی سرائی رہی ہوں گی “ شاید اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔ ۵

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے مضمون بلند لا مکاں سے لائے
بہر حال ایک مؤرخ کے لیے آزادی رائے کے باوجود حقائق مقدس ہونے چاہئیں۔
تبرّا کی شروعات کے تحت فرماتے ہیں کہ ” تبرّا کی ابتدا خود علی حیدرؒ نے کی تھی جس کا جواب امیر معاویہؓ نے بھی تبرّا سے دیا تھا۔ (۵۵۰) اس سے پیشتر ص ۳-۲۶۲ پر بھی اس سلسلہ کی یہ عبارت موجود ہے، ” تحکیم کے بعد علی حیدرؒ نے تنازہ میں دعلے قنوت کے بعد امیر معاویہؓ، اُن کے مشیران خاص پر لعنت بھیجنا شروع کر دی تھی اور اس کے جواب میں امیر معاویہؓ نے بھی علی حیدرؒ اور اُن کے بعض ممتاز مقربوں پر مسجدوں میں لعنت بھیجنے کا حکم دیدیا تھا“

لیکن اس کے برعکس شاہ معین الدین احمد تدوی کی تحقیق یہ ہے کہ ”اموی خلفائے ایک بڑی عادت یہ جاری کی تھی کہ وہ خود اور اُن کے تمام عمال خطبہ میں حضرت علیؓ پر لعن طعن کیا کرتے تھے اور اسے خطبہ کا جز بنا دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اسے بالکل بند کر دیا اور تمام عمال کے نام فرمان جاری کر دیا کہ حضرت علیؓ کے متعلق جو ملامت الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ بند کر دیں اور اس کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت داخل خطبہ کریں، اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ جو آج تک جاری ہے“

۱۵ تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۲۱۹، مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔ تاریخ الخلفاء حصہ دوم ص ۱۱۱۔
باقی صفحہ ۱۱ پر دیکھیں؛

علاوہ ازیں علامہ ابن کثیر (رحمہ اللہ) صاحب البدایہ والنہایہ نے اس واقعہ کی تردید کی ہے اور بالصراحت لکھا ہے: **إِنَّ هَذَا أَلَمَ لِيَصَحَّ**۔ بالفرض یہ دعا کسی حد تک تسلیم بھی کر لی جائے تو بغیر لعن کی کتنی۔ کیونکہ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی علوشان کے بعد تر ہے کہ عورتوں کی طرح بیٹھے ہوئے حریت کو کوسا کریں اللہ ایک دفعہ جب آپ سے جبل اور حنین کے مقتولین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو جواباً فرمایا کہ سجدہ طرفین کے مقتولین جنتی ہیں بشرطیکہ اُن کے دل صاف ہوں اللہ پھر حیات اور زندہ لوگوں کے بارے میں ناملائم الفاظ کہنے کی ابتداء وہ کیوں کر کر سکتے تھے اور واقعہ ہے کہ نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعن کیا اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن ابولولو کے قاتلانہ حملہ کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے ایک چھ رکنی پینل مقرر کر دیا تھا تاکہ یہ پینل بعد از مشاورت اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لے۔ چنانچہ بقول فاضل پر وفیسر صاحب ”پینل کے ارکان خلافت کے لیے اپنی اپنی فضیلت، جہادی خدمات اور اہلیت کا پرزور اظہار کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے“ (ص ۱۴۵)

(حاشیہ بقیہ نمبر ۱) از علامہ سیوطی۔ ناشر ادارہ درس اسلام دیوبند۔

۱۱ تاریخ ابن خلدون ۱: ۵۷۸ حاشیہ مطبوعہ دیوبند۔

۱۲ مقدمہ ابن خلدون (اردو) جلد اول ص ۳۸۳ بحوالہ طبری۔

۱۳ بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سب و شتم اور لعن و تشنیع کی مذموم رسم کا آغاز عبداللہ ابن دہب ابن سبا المعروف بہ ابن السودا نے کیا تھا جو ایک یہودی الاصل غالی شیعہ تھا۔ برائے حوالہ دیکھیے مذہب اور یا طنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایں ص ۱۳۹۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے منتخب ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو وہ اپنے ”گھر گئے اور اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے ہاشمی بزرگوں کو شکایت کی.... (اور کہا) عمر رضی اللہ عنہ وصیت کر دی ہے کہ خلیفہ وہ فریق ہوگا جسے عبدالرحمن کی تائید حاصل ہو۔ بخدا اگر عمر جیتے رہے تو میں بتاؤں گا جیسی انھوں نے ہماری حق تلفی کی ہے اور اب اور پہلے جیسی جیسی ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کرتے رہے ہیں اور اگر مر گئے جیسا کہ پورے آثار ہیں تو پستل کے باقی رکن یقیناً خلافت سے ہمیں محروم کر دیں گے اور اگر انھوں نے ایسا کیا اور یقیناً وہ ایسا کریں گے تو میں بھی انھیں جہنم سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔“ (ص ۱۴۶)

بینہ مزاجی کیفیت کسی مغلوب الغضب اور بندہ حرص و آرزو شخص کی تو ہو سکتی ہے مگر کاظم غیظ اور فاتح قلوب اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب جیسے پروردہ رسولؐ کی نہیں۔ محول بالا اقتباس سے بلا ابہام و تردد یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علی حیدرؑ اپنے اندر نہ صرف یہ کہ خلافت پانے کی آرزو رکھتے تھے، بلکہ اس کی حرص و طمع کا جذبہ بھی ان کے دل و دماغ پر محیط تھا، جو کہ ارشاد نبویؐ، ”بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے“ کے یکسر منافی ہے اور یہ باور کرنے کا کوئی امکان نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپؐ کا یہ ارشاد گرامی نہ پہونچا ہو۔ رسول اکرمؐ نے بشمول حضرت علیؑ تمام صحابہ کرامؓ کی جس طرز پر برہنہ ہا برس اصلاح و تربیت فرمائی تھی اس کے پیش نظر یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرات ”حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ دار نہیں گرتے تھے بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے لرزہ بر اندام ہو جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائیکہ وہ اپنا نام

حکومت کے لیے پیش کریں، اپنے منہ سے اپنی تعریف کریں اور اپنی ذات کے لیے
 پرہیزگندہ کریں علیہ السلام اور اس کے دعویدار بنیں۔ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر
 ہوگی اور اس نے مختلف امتوں، قوموں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے
 اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہوگا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ
 صحابہ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو، فتنہ اور افتراق سے نفور اور نفسانیت
 و دنیا داری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری علیہ السلام خلیفہ ثانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
 باہمی تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے اور وہ اہل بیت کا احترام بھی حد درجہ ملحوظ
 خاطر رکھا کرتے تھے یہاں تک کہ دیوان عطا کے رجسٹریں ناموں کے اندراج کی
 ابتداء بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی سے ہی کرائی گئی۔ ۱۵۳
 میں اپنے سفر شام کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا چارج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
 ہی سپرد کر دیا تھا نیز مہمات ملکی میں وہ حضرت علی حیدر رضی اللہ عنہ سے برابر مشورہ لیتے رہتے
 تھے۔ اور ان دونوں حضرات کے اتحاد و یگانگت کا آخری مرتبہ یہ تھا کہ حضرت
 علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو جو فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے بطن سے نکھیں ان (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے
 عقد میں دے دیا تھا۔ ۱۵۴ پھر کیسے یقین کیا جائے کہ ان کے آپسی تعلقات میں
 کشیدگی تھی۔

۱۵۵ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا آخر ص ۱۵۳۔ از مولانا سید ابوالحسن علی
 ندوی مدظلہ العالی۔

۱۵۶ تاریخ دعوت و عزیمت ۲۸۱۲ - ۳۲۷ - طبع چہارم از مولانا ابوالحسن علی
 ندوی دامت برکاتہم۔

۱۵۷ دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو مستعار تصویریں۔ ص ۴۲۔ پہلا ایڈیشن۔
 از مولانا محمد محترم حضرت علی میاں صاحب ادا م اللہ فیو ضہم۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حوٹائی کا محاصرہ کرنے اور ان کی شہادت کے واقعہ میں مصری جتھے کے ساتھ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے چنانچہ فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ اس مصری جتھے کو جو سب سے بڑا تھا (دو جتھے اور کبھی تیس) علی حیدر کی اخلاقی تائید حاصل تھی۔۔۔۔۔“ رملۃ حظہ ہو موصوف کا مضمون ”اعتراضات کے جواب مشمولہ ماہنامہ برلمان دہلی سنہ زوری ۱۹۸۴ء)۔

ہمیں یہ تسلیم کہ خلیفہ کے خونِ ناحق کے دھبوں سے محمد بن ابی بکرؓ کا دامن پاک نہ تھا کیونکہ اولاً یہی محمد بن ابی بکرؓ عقب سے عمرو بن حزم انصاری کے مکان سے چھلانگ لگا کر کاشانہ خلافت میں گھسے تھے۔ لیکن محمد بن ابی بکرؓ اور مصری جتھے کو نہ تو حضرت علیؓ کی اخلاقی تائید ہی حاصل تھی اور نہ کسی قسم کا اشتراک و تعاون ہی۔ اس کے برعکس حضرات حسنینؓ اور آپؐ کا آنا بدکردہ غلام تنبر عین دورانِ محاصرہ اولین خلافت کے دروازہ پر بطور گارڈ متعین تھے، یہ اس سبب محاصرین عقب سے کود کر داخل ہوئے۔ معاذی کے مشہور عالم عردہ بن الزبیرؓ رپیدائش غالباً ۳۱ھ اور انتقال تقریباً ۹۴ھ) کے اس قول سے کہ ”علیؓ اس سے بہت زیادہ متقی تھے کہ وہ قاتلین عثمان کی مدد کرتے اور عثمان بھی اس سے کہیں زیادہ پرہیزگار تھے نہ علیؓ ان کو قتل کرا دیتے“ اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ باغیوں کو حضرت علیؓ کی اخلاقی تائید حاصل تھی۔ خود حضرت علیؓ کو جب اس حادثہ کا جملہ کا علم ہوا تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے: ”خدایا! تو گواہ رہ کہ میں عثمان کے خون سے بری ہوں“ اور یہ بھی فرمایا کہ

۱۱۔ سیرۃ نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین، مترجم پر د فیسرتار احمد فاروقی صاحب ص ۲۶۔

۱۔ عثمان بن النورینؓ از مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص ۲۶۱، تاریخ الخلفاء از علامہ سلیمان علی حسہ
دوم قسط ص ۲۴ نیز تاریخ ابن خلدون جلد اول قسط ۳ ص ۵۱۲۔

کہ حضرت عثمان کی شہادت سے میری کمر ٹوٹ گئی۔

اموی معاشرہ کی ایک خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے بنو ہشامؒ "خلافت کے لیے عبادت و ریاضت" ارقام فرماتے ہیں: جو لوگ خلافت و امارت کے امیدوار ہوتے وہ عبادت و ریاضت اور سادہ پابند مذہب زندگی کا مظاہرہ کر کے عوام کا تعاون حاصل کیا کرتے تھے۔ اموی دور میں بہت سے لوگوں نے خلافت، امارت اور سیاسی و اقتصادی سر بلندی کے لیے نہیں چلائیں اور سب نے عبادت و ریاضت تیز رکھی کھینچی زندگی کا مظاہرہ کر کے عوام کی اخلاقی و عملی مدد حاصل کر کے مسلح بغاوتیں کیں۔ ان میں ایک امیدوار خلافت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔ وہ مسجد حرم میں پہروں لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے تھے، پہینے میں اکثر دن روزے رکھتے تھے چاہے موسم سردی کا ہوتا چاہے گرمی کا..... دوسرے آرزو مند خلافت عبداللہ بن عباسؓ کے لڑکے علی (م س ۱۱ھ) تھے، وہ اپنی مسجد میں چوبیس گھنٹے کے دوران ہزار سجدے کرتے تھے اور بقول بعض ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے..... اموی حکومت کی بساط الٹ کر عباسی حکومت قائم کرنا ان کا نصب العین تھا..... تیسرے امیدوار خلافت امام حسینؓ کے پوتے اور علی زین العابدینؓ کے لڑکے زید (م س ۱۲ھ) تھے انھوں نے عبادت و ریاضت اور روکھی کھینچی زندگی کا مظاہرہ کر کے مدینہ کے باشندوں کو اپنی خلافت کی ہم بازی کے لیے تیار کر لیا تھا..... زید کو مدینے میں مسلح بغاوت کا موقع نہیں ملا تو وہ کونے چلے گئے اور دہاں بہت سے لوگوں کو اپنی عبادت و ریاضت اور سادہ زندگی سے متاثر کر کے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ۱۳ھ میں بحر بیالیس سال اموی فوجوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے (ص ۴۰۰-۵۹۹)

اقتباس الایں عبادت و ریاضت کی تعبیر و تشریح خالص مادی تناظر میں پیش کی گئی ہے جس سے بالخصوص یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں استحقاقِ خلافت کے لیے

ظاہری پارسائی اور خشک زندگی کا مظاہرہ کرتا ضروری تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جن حضرات نے نمائشی زہد و تقدس کا سہارا لیا ان میں اول الذکر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (شہادت ۵۷۳ھ) نبیرۃ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حواری رسولؐ حضرت زبیرؓ بن العوام کے صاحب زادے اور حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھائی تھے، آپ ہجرت کے بعد مدینہ الرسول میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے پیدا ہونے والے (رسلہ) شخص تھے جن کی ولادت سے مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی تھی آپؓ اکثر موزعین کے نزدیک خلیفہ پنجم (۶۴ تا ۷۳ھ) کہلاتے ہیں۔ دوسرے تابعی اور تیسرے تبع تابعی تھے۔ جنہوں نے سیاست کو خلافت علیؓ منہاج النبوة کے طرز پر از سر نو ڈھالنے کی عملی جدوجہد اور سرفروشانہ خدمات انجام دیں اور جن کی طرزِ باند و بود اسلام کے صحیح علم و عمل کا نمونہ تھی اور جو دنیوی اشیاء سے استلذاذ کو بہ نظر استحقار و استحقاقات دیکھتے تھے۔ بالفرقِ محال ان حضرات نے "خلافت" امارت اور سیاسی و اقتصادی سر بلندی" حاصل کرنے کے لیے ہی "عبادت و ریاضت نیز روکھی بھکی زندگی کا مظاہرہ" کیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو امارت تو درخت میں حاصل تھی ہی جیسا کہ خود موصوف نے اپنی تصنیف کے ص ۱۹۶ پر حضرت زبیر بن العوام کی غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ منقولہ جائیداد کے جو تین اعداد و شمار دیئے ہیں انہیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور صرف ان کے اوسط کو قابل قبول سمجھا جائے تو وہ بھی تین کروڑ بائیس لاکھ ہوتا ہے۔ اس میں سے گیارہ لاکھ قرض منہا

۱۔ آپؓ کی خلافت و شہادت کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ابن خلدون جلد دوم قسط ۴ ص ۱۳۷ تا ۱۸۴، تاریخ الخلفاء ص ۸۴ تا ۸۸ جلد دوم، تاریخ اسلام ۲: ۵۸ تا ۹۴۔ مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ نیز مقالات شبلیؒ

۵: ۳ مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔

کر دیا جائے تب بھی تین کروڑ گیارہ لاکھ میں سے جو کچھ حضرت عبداللہ ابن زبیر کو ورثہ میں ملا ہو گا وہ آسودگی و فرغ الحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے انہیں کافی تھا۔ باوجودیکہ انہوں نے روکھی بھیکی زندگی بسر کی تو اس کا مقصد سوا رضائے الہی حاصل کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ افسوس کہ ان پاک نفوس کو بھی ہم نے اپنے ہی معیار سے جانچا اور پرکھا۔

کارپا کاں راقیاس از خود گیر گر چہ ماند در نوشن شیر و غیر
مولہ فوق اقتباس میں حضرت زید بن علی زین العابدینؑ کا سنہ شہادت (۲۲۰ھ) بھی شاید سہو غلط درج ہو گیا ہے۔ کیونکہ آپ کی شہادت کا واقعہ ۲۲۰ھ میں رونما ہوا۔ آپ کی نعش کو چار سال تک دروازہ دمشق پر مصلوب رکھا گیا اور جب ولید ثانی بن یزید بن عبد الملک خلیفہ (۱۲۵ تا ۱۲۹ھ) ہوا تو اس نے حضرت زید کی لاش کو جلادینے کا حکم دیا۔ دوسری طرف عوام الناس کا عالم بھی کچھ بہتر نہ تھا جیسا کہ عنوان ”پابندی صوم و صلوٰۃ“ ص ۵۵۹ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ بہر حال فاضل مصنف نے اس دور کے اکابر و اصاغر کے زہد و تقشف اور عبادت و ریاضت کو جس تناظر میں پیش کیا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ بے دل ہائے تماشا کہ عبرت ہے نہ ذوق بیکسی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دین
جبکہ یہ حضرات دنیوی اشیاء سے استلذاذ حاصل کرنے کو یہ نظر استحقار و استحقاف دیکھتے تھے۔

دیگر متنازعہ فیہ اور محل نظر اقتباسات سے اندیشہ تطویل کے سبب صرف نظر کرتے
۱۹۰ دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں از حضرت علی میاں
ص ۸۴ نیز تاریخ اسلام ۲۱۶: ۲ - مصنف مولانا اکبر شاہ خاں نجیب
آبادی۔

ہوئے عرض خدمت ہے کہ موصوف نے اپنی تصنیف میں اس نقطہ رنگاہ کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ تاریخ صرف بڑے لوگوں کے سوانحی حالات بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں معاشرتی زندگی کے تمام پہلو محتوی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ موصوف نے معاشرہ کے کسی پہلو کو رد و شن کرنے میں پہلو تہی سے کام نہیں لیا جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں تصنیف میں ”عنوان“ عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر اعتراضات اور ان کا جائزہ،“ خاصہ کی چیز ہے۔ انداز بیان اور ایجاز بیان کے اعتبار سے بھی پوری تصنیف نہایت شستہ و شگفتہ ہے۔ شروع میں اصلاح سہو و خطا (Error) دینے کے باوجود تقریباً سنو دیکڑے طبی اغلاط سنوڑ محتاج اصلاح ہیں جنہیں آئندہ ایڈیشن میں درست کرنے کا ہر ذمہ صواب نے وعدہ فرمایا ہے۔ ص ۱۸ پر ”پانی سر سے اونچا ہونا“ محاورہ تعقید لغتی کے ساتھ اس طرح مستقل ہوا ہے، لیکن جب سر سے اونچا پانی ہو گیا تو انھوں (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) نے ابوذرؓ کو شام جلد وطن کر دیا، اس محاورہ کو منکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے جو اردو اور عربی ابان و ادب کے شہرہ آفاق ادیب و فاضل بھی ہیں، اس طرح استعمال فرمایا ہے: قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو انھوں نے اپنے رسولؐ کو در آپ کے اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ بہر کیف اردو ادب میں ہمارے لیے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستان خیال قابل تقلید و سند ہیں ص ۱۲-۱۱ پر اصطلاح ”نسل کشی“ کا استعمال بھی نہرت لیے ہوئے ہے فرماتے ہیں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے گھوڑے پالنے اور ان کی نسل کشی کے لیے ایک دوسری چراگاہ ریزد کرائی جس کا نام شرف تھا، اس معنی میں اب تک افزائش نسل تو دیکھنے سننے میں آیا تھا مگر ”نسل کشی“ کا استعمال پہلی دفعہ باصرہ نواز ہوا ہے جو غالباً فارسی مصدر ”کشتن“ بمعنی

’ہوتا‘ سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ فارسی سے تابلہ قاری کے لیے یہ اصطلاح خوبصورت ہوتے ہوئے بھی سرلیج الفہم نہیں۔ ممکن ہے وہ اسے خود کشی، ضمیر کشی، و خیر کشی اور نفس کشی وغیرہ پر قیاس کر ڈالے۔ بہر حال یہ سبقت قلمی ہے۔ ص ۵۵ پر یہ فقرہ بھی قدرے گنگناہٹ ہے، ”ام فردہ کے چار لڑکے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑے محمد بن اشعث کا زرتند نصف صدی بعد ہمعصر مذہبی اکابر کے تعاون سے عبدالملک بن مروان اور حجاج کے خلاف ہوناک بغاوت کر کے مشہور ہوا“ اس فقرہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ محمد بن اشعث کا سب سے بڑا فرزند کون تھا لہذا ”فرزند“ کے بعد عبدالرحمن ثبت ہونا چاہیے تھا جو کہ ابن اشعث کا سب سے بڑا فرزند تھا۔ ص ۳۱۹ پر یہ فقرہ بھی مبہم ہے، ”خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سلیمان نے اپنے بھائی وید کے اکثر گورنروں اور سالاری کے عہدوں پر فائز کیا“ ص ۱۹۷ پر بیرونی بستیوں قبا پہنچیں“ کی بجائے ”بیرونی بستی قبا پہنچیں“ ہونا چاہیے۔ ص ۳۵۶ پر لفظ ”صلح“ بجائے اسم مؤنث اسم مذکر استعمال ہوا ہے۔ یعنی ”عبدالملک کے صلح سے منحرف تین بڑے حریف تھے“ حکیم مومن خاں مومن نے اسے صیغہ مؤنث میں استعمال کیا ہے۔

پھر کوئی لےنے کی طرح نہ ہوئی صلح اب کے کسی طرح نہ ہوئی

ص ۵۵۹ پر گاؤں (ذبیہ، موضع) کا املا گانوں، اور ص ۶۰۵ پر گاؤں تحریر کیا ہے گو دونوں املا درست ہیں تاہم کوئی ایک املا اختیار کرنا بہتر تھا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں جبکہ ص ۱۱۹ و ۱۳۲ پر علی الترتیب گاؤں (Gowā) یعنی لیا چغیا جیہ اور بیل (oxen) یا گائے (Kine) کا جمع بھی گاؤں ہی ثبت فرمایا ہے۔ ص ۶۱۳ پر ”ہائے“ کا املا حائے حطی سے اختیار کیا ہے جبکہ اردو فارسی شعرا نے ہائے ہوز سے تحریر فرمایا ہے مثلاً غم قر سے دور نہ رہتا جو ہا ل کیا کرتا۔ مصحفی نیز

مگر زردی صفحہ حسن تو بردارد کہ امشب کشیدار ہالہ جہد دل صفحہ رورا (غنی)
 انی اصل "تاریخ اسلام" خلافت راشدہ دینی امیہ" کی بعض تصریحات پر اصرار کرنے
 جو کچھ خامہ رسائی کی ہے وہ محض ایک طالب علمانہ کاوش ہے نقد تبصرہ جو ایک بلند پایہ
 علمی معیار کی چیز ہوتی، اہل نظر علماء و فضلاء کا کام ہے خاکسار کے پاس نہ تو اس قسم
 کی علمی استعداد و صلاحیت ہی ہے اور نہ مطلوبہ کتب کا ذخیرہ ہی چنانچہ جیسی اور جتنی
 معاون کتب و رسائل و جرائد تک رسائی حاصل ہو سکی اُن سے زلہ ربائی کر کے اس
 خردہ گیری کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جس میں امکانی حد تک اپنی ضعیف و ناقص
 رائے زنی سے احتراز کیا ہے کیونکہ سطحی خواندگی کے بل پر جو رائے بھی دی جائے گی
 وہ یقیناً ناقص ہی ہوگی بقول سعدیؒ: "ظہم ضعیف رائے فضول چرا کند۔"
 چنانچہ مجھے صدق دل سے اس امر کا اعتراف ہے کہ خورشید کجا ذرہ آوارہ کجا۔
 امید کہ پروفیسر خورشید احمد صاحب فارق اس آہو گیری میں جو کچھ درست ہو
 اس کی پذیرائی کرتے ہوئے اس پر دمایہ تہی علم کو اپنی آؤ سحر گاہی و دعائے نیم شبی میں
 گاہے ماہے یاد فرماتے رہیں گے۔ ظ

وز زبان تو تمنائے دعلئے دارد

(ختم شد)

۱۲۱ موصوف کے تبصرہ کے سلسلہ میں خاکسار کو دو تین الطاف نامے نظر نواز ہوئے
 تھے جن میں مطبعی اغلاط کی درستی کا وہدہ فرماتے ہوئے ازراہ لطف و کرم یہ بھی
 ارشاد فرمایا تھا کہ تبصرہ کرنے کی اب ضرورت نہیں مصنف کی نظر میں اغلاط آگئی
 ہیں۔ اے۔ رؤف۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم

۱۹۸۸ء کو راقم الحروف شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ کے ساتھ مطالعاتی دورے پر بالاکوٹ پہنچا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید احمد بریلویؒ اور شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ شیر سنگھ کی فوج کے مقابلے میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ بھارت کے نامور عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔

دریائے کنہار کے کنارے جامع مسجد کے قریب ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں ہیں۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں سید احمد بریلوی کا دھڑ دفن ہے۔ ان کا سردریائے کنہار میں بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا تھا۔ وہاں کسی شخص نے اُسے پہچان کر دریا کے کنارے دفن کر دیا۔ ان دونوں مقامات میں بارہ میل کا بعد ہے۔

سید احمد بریلویؒ کے مزار کے سرہانے سنگ مرمر کی لوح نصب ہے۔ اور اس پر عربی عبارت کے علاوہ اردو زبان میں پہا لفاظ منقوش ہیں:

سید احمد شہید

نے ۶ مئی ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعۃ المبارک گیارہ اور ۱۲ بجے کے درمیان سکھوں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ میں

شہادت نوش فرمائی۔ سرزمین بالا کوٹ آپ کے خون کی امین ہے۔
 سید صاحب کے مزار مبارک سے جانب قبلہ پانچ چھ میٹر کے فاصلے پر امیر
 المجاہدین مولانا فضل الہی وزیر آبادی محو خواب ابدی ہیں۔ ان کا انتقال جہلم میں
 ہوا تھا لیکن ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت بالا کوٹ لے جانی گئی۔ راقم
 الحروف کی نگرانی میں ان کے بارے میں عرفان حفیظ بٹ نے ایک تحقیقی مقالہ بھی
 لکھا ہے اعدا ماتم نے ان کا ایک اہم خط جو انھوں نے چمرکنڈ سے اقبال شیدائی کو
 پیرس بھیجا تھا، ماہنامہ المعارف لاہور میں شائع کر دیا ہے۔ ان کے لوح مزار
 پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
 لا اِلهَ اِلاَّ اللہ محمد رسول اللہ
 مدفون

حضرت مولانا فضل الہیؒ وزیر آبادی
 امیر المجاہدین چمرکنڈ (پاکستان)
 سلسلہ حضرت سید احمد بریلوی شہید و شاہ اسماعیل شہید
 تاریخ وفات ۵ مئی ۱۹۵۱ء

سید احمد بریلویؒ کے مزار مبارک سے تقریباً چار فلانگ کے فاصلے پر ایک
 پہاڑی کے اوپر ایک چار دیواری کے اندر شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ صاحب تقویۃ
 الایمان محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر کے سر پر سنگ مرمر کی ایک لوح پر یہ عبارت
 مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
 مدفون

حضرت مولوی شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی
بن شاہ عید الغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی

رحمۃ اللہ علیہم

ولادت شنبہ ۲۸ شوال ۱۱۹۶ھ

شہادت جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۷ھ

اے ذبیح اللہ اسماعیل ما شد نہایت صورا سرافیل ما
خون خود را در کہہ و کہسار ریخت لیک بیخ حریت در ہند بخت

احقر العباد سید اسد علی انوری فرید آبادی

اس کتبہ را در ماہ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ نصب کرد

بالاکوٹ سے ہمارا قافلہ مظفر آباد پہنچا۔ وہاں سپریم کوٹ آف آزاد جموں
و کشمیر کے احاطے میں دادی کشمیر کی معروف شخصیت اور آزاد کشمیر کے صدر
میر واعظ محمد یوسف کا مقبرہ ہے۔ اس کے قریب ہی اب ایک اور سابق صدر
خورشید حسن خورشید کو دفن کیا گیا ہے۔ میر واعظ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن
عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی دوست تھے۔ میر واعظ کے مزار پر ابھی باقاعدہ
کتبہ تو نہیں لگا، البتہ ایک لوح پر یہ عبارت منقوش ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد یوسف میر واعظ کشمیر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس
کاشگ بنیاد جناب بریگیڈیر محمد حیات خاں صاحب صدر آزاد جموں
و کشمیر نے بتاریخ ۱۶ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۸۲ء
اپنے دست مبارک سے رکھا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور کو دارالعلوم کورنگی (کراچی)

میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطہ قبور میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ ان کے لوح مزار کی عبارت راقم الحروف نے لکھی تھی جسے ان کے وزند جنید احمد نے سنگ مرمر کی ایک سہل پر کندہ کرا کے قبر کے سر پرانے لگا دیا ہے۔ وہ عبارت یوں ہے :

ہو الباقی

إِنَّا لِلّٰهِ يَا لَنَا سِوَاكَ مَا جِئْنَاكَ

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

مدیر ماہنامہ برہان دہلی

پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈائریکٹر شیخ الہندؒ اکیڈمی

رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

وفات کراچی

ولادت آگرہ

۳ رمضان ۱۴۰۵ھ / ۲۳ مئی ۱۹۸۵ء

۶۱۹۰۸

علامہ سیاب اکبر آبادیؒ کی قبر کا ذکر الواح الصنادید میں آچکا ہے، لیکن اس وقت وہاں کتبہ نصب نہیں تھا اور ایک قریبی مکان کی دیوار پر ان کی تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی۔ اب ان کا عالیشان مقبرہ تیار ہو گیا ہے۔ ایک بلند چبوترے پر ان کا مزار سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے۔

یا غفور یا حمید

۱۳۷۷ھ

مرقد منور منزل راحت جادو دانی علامہ سیاب اکبر آبادیؒ

۱۹۶۵ء

قدس حملاً وذلک الفوز المبین

۱۳۵۰ھ

دے گیاد اہل جدائی آخر وہ معظّم وہ مکرم سیما
فخر علم وادب استادِ زمان فن کے اسرار کا محرم سیما
قادری لکھ دو یہ تاریخ وفات نہ رہا شاعر اعظم سیما

۱۹۵۱ء

پروفیسر حامد حسن قادری

وفات ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء

کراچی (۱۱ بجے دن)

پیدائش ۱۸۸۰ء

اکبر آباد (اگرہ)

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں ملتان پر فوج کشی کی۔ حاکم ملتان مظفر خاں
نے بڑی بے جگری کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن اسے ہزیمت اٹھانا
پڑی اور وہ داد شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ مظفر خاں کو حضرت بہاؤ الدین
نکریا ملتانی کی درگاہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ اس کے لوح مزار پر یہ
عبارت منقوش ہے :

آخری آرام گاہ

رکن الدولہ صفدر جنگ حاجی نواب مظفر خاں سدوزی شہید

شجاع دابن شجاع حاجی امید ملتان رہے مظفر
برور میدان بہ تیغ و بازو چہ حملہ آورد چوں غصنفر
چوں سرخوشد بسوئے جنت بگفت رضوان بیا مظفر

تاریخ شہادت ۲۳ رجب ۱۳۳۳ھ

مطابق ۲ جون ۱۸۱۸ء

اسی درگاہ کے احاطے میں مسجد کے عقب میں رنگین ٹائلوں سے مزین ایک
 قبر ہے۔ صاحبِ قبر نواب شہنواز خاں، نواب زکریا خاں والی لاہور کا فرزند
 ہے۔ یہ وہی ذات شریف ہے جس نے پہلی بار احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ
 کرتے کی دعوت دی تھی۔ شہنواز خاں، نواب معین الملک ناظم لاہور کے مقابلے
 میں مارا گیا تھا۔ اس کے مزار کے سر ہانے ایک ٹائل پر یہ عبارت درج ہے:

لا اِلهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

چوں شہنواز خاں بملتان شہید شد
 خمدار تیغ قتل برو ماہ عید شد
 جستم چو سال مشہد آں غازی شہید
 گفتا خرد کہ حاکم ملتان شہید شد

۱۲۳۳ھ

(باقی)

اعلان

۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ء کو مفکر ملت کے تاریخی اور شاندار افتتاح کے دوران شرکار نے اجتماعی طور پر یہ تجویز پاس کی تھی کہ آئندہ ہر سال اس موقع پر مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ کی یاد میں ایک روزہ علمی سمینار کا اہتمام کیا جائے۔

چنانچہ اس سال حسب پروگرام سردیوں کے آغاز میں سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس مبارک اقدام اور نیک کام کی تکمیل کے لئے قارئین کرام دل سے دعا فرمائیں۔ سمینار میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں اور حیات و خدمات پر مقالہ نگار حضرات روشنی ڈالیں گے۔ چونکہ وقت کم ہوگا اور مقالات زیادہ ہوں گے اس لئے کوشش اس بات کی کی جائے کہ مقالات زیادہ سے زیادہ جامع اور علمی سطح کے ہوں۔

اس سلسلے میں مختلف عنوانات اور دعوت نامہ عنقریب ارسال کیا جائے گا۔ مقالات قبل از وقت دفتر برہان میں پہنچنا ضروری ہیں تاکہ انھیں چیک کیا جاسکے۔

(منیجر)

ابو حیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ
(۵)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی شعبہ عربی مسلم پریسرسٹی علی گڑھ

یہ رسالہ مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ ابن خلکان نے
مثالب الوزراء ^{۱۱۵۰ھ} "مثالب الوزراء" حاجی خلیفہ نے "قلب الوزراء" ^{۱۱۵۰ھ}
اور یاقوت نے "اخلاق الوزراء" کے نام سے یاد کیا ہے ^{۱۱۵۰ھ}

اس کا مخطوطہ قسطنطنیہ کے کتب خانے میں پایا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں محمد بن تاووت البلیغی
نے ایڈیٹ کر کے مجمع العری دمشق سے شائع کیا۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ان تین
ذہاب (ابو الفضل ابن العمید، ابو الفتح ابن العمید، صاحب بن عباد) کی بدسلوکی
اور توحیدی کی ذات کے سلسلے میں ان کی ناقدر شناسی ہے۔ اس تصنیف میں
ابو حیان توحیدی نے ان وزراء کی زندگیوں کے تاریک گوشوں کو بڑی جرأت
کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان وزراء کے خلاف ابو حیان توحیدی نے نہ صرف یہ کہ
اپنے خیالات کے اظہار پر اکتفا کیا ہے بلکہ ان کے بارے میں حق پسند جلیل القدر
معاصر علماء کی رائے بھی نقل کی ہے۔ ابو حیان توحیدی نے صرف ان کی خامیوں
ہی کو نہیں گنایا ہے بلکہ اگر ان میں کوئی اچھائی یا خوبی دیکھی تو اس کی بھی تعریف کی
ہے۔ ابو حیان نے کتاب کے آغاز ہی میں غیبت کے موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور کسی ظالم کے ظلم کا پردہ چاک کرنے یا کسی منافق کے نفاق کو واضح کرنے کو غیبت و جھٹل خوری کے دائرے سے الگ قرار دیا ہے۔ آخر میں قارئین سے اس کتاب کے مطالعہ کی اپیل کی ہے۔

اس رسالے میں توحیدی نے خوشخط لکھنے کے اصولوں رسالۃ الکناپۃ : سے بحث کی ہے۔ ابو حیان توحیدی خود بھی اچھا خطاط تھا۔ اس لیے اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اس میں عربی خط اور اس کے اقسام پر بڑی محققانہ بحثیں ہیں۔

المقایسات : ڈاکٹر ذکی مبارک کہتے ہیں ”المقایسات کا شمار دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے، پہلی بار ہندوستان میں شائع ہوئی۔ پھر مزید اصلاح و ترمیم کے بعد مصر سے شائع ہوئی۔ کتاب المقایسات تمام ہم لوگوں کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد نہیں۔ بلکہ اس سے حقیقی معنوں میں پورا فائدہ دہی اٹھا سکتے ہیں جو اسلامی فلسفہ کے بنیادی اصولوں سے واقف ہیں۔“
یہ ابو حیان توحیدی کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ پہلی بار ۱۳۰۵ھ میں مرزا محمد شیرازی کے اہتمام میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا ایک اور ایڈیشن حسن السندوبی نے ۱۹۲۹ء میں مصر سے شائع کیا۔ المقایسات کے بارے میں ڈاکٹر ابراہیم کیلاتی نے حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

”یہ کتاب چھوٹے بڑے ایک سو چھ مقایسات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ یہ چند فی البدیہہ لکچر ہیں جو مختلف موقعوں پر ان علمی مجلسوں میں دیے گئے تھے جو یحییٰ بن عدی نصرانی اور ابوسلیمان منطقہ سجستانی کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ علمی مجلسیں کبھی تو ابن عارضہ کے محل میں منعقد ہوتیں، کبھی درآتوں کے بازار میں یا پھر سجستانی کے کسی شاگرد کے یہاں۔“

ان مجلسوں میں ہر طبقہ کے نمائندے اور ہر مذہب و ملت کے افراد (خواہ وہ کسی عقیدے کے ماننے والے ہوں) غریک ہوتے۔ شرکاء میں فلسفی، طبیب، ریاضی دان، ہیئت دان، مورخ، شاعر، ادیب اور متکلم غرضیکہ ہر صنف کے اصحاب کمال نظر آتے ہیں جو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے دنیا کے دور دراز کے علاقوں سے آتے تھے۔ عام طور پر ان مجلسوں میں فلسفہ و تصوف کی بحثیں زیادہ ہوتیں، طالبان علم اپنی بیاضیں کھول کر بیٹھتے اور صدر محفل جو جواب دیتا اسے نوٹ کر لیتے جس مسئلے پر اتفاق نہ ہوتا تو صدر اپنی رائے دیتا جسے لوگ تسلیم کر لیتے۔ ۱۵

فلسفہ و حکمت کے میدان میں یہ بہت ہی اہم کتاب ہے۔ بعد کے فلاسفہ نے مختلف فلسفیانہ بحثوں میں ابو حیان توحیدی کی ذات کی طرف رجوع کیا ہے اس کتاب کے ذریعہ اس دور میں فلسفہ کے میدان میں ہونے والی سرگرمیوں اور ترقیوں کا بہت حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسائل کیسے ابھرتے ہیں اور اختلافات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔

اس کتاب کا پورا نام "الاشارات الالہیۃ والاشارات الروحانیۃ" ہے۔ اس کتاب میں روحانیت کی جلا اور درجات کی بلندی کے لیے غماز اہم کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نسخہ دمشق کے "مکتبہ ظاہریہ" میں تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند قدیم ترین باقی ماندہ نسخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔ جلد اول کو ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی نے دریافت کر کے ۱۹۵۷ء میں قاہرہ سے شائع کیا۔ الاشارات میں ۵۴ مسائل ہیں جو مختلف قسم کے اوراد و طائف اور مواظبات و نصائح پر مشتمل ہیں۔

اس کتاب کا اسلوب اس کی دوسری کتابوں کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی تحریر کافی عمدہ اور بہتر ہے۔ اس کے اندر ابو حیان نے انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات اور روحانی تغیرات و تقلبات کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ذاتی شخصیت سے متعلق احوال، زندگی کے تجربات، مختلف اوقات میں طاری ہونے والی الگ الگ کیفیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے اندر ابو حیان نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان جب دنیوی مشکلات و پریشانیوں سے گھرا جاتا ہے تو از خود اپنے آپ کو ایمان و یقین کے دامن میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں ایسے شخص کی مایوسی و ناامیدی کا بھی تذکرہ ہے جسے دنیا و اہل دنیا کی تلخیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اس شخص کی حالت زار کا تذکرہ ہے جو مسلسل نا کامیوں کی بدولت ٹوٹ چکا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کی صحیح عکاسی دہی کر سکتا ہے جو ان حالات سے گذرا ہو۔ یہ ابو حیان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ جب کہ اس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ اسی لیے اس نے دنیوی معاملات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے روحانیت اور تصوف کی طرف رغبت دلائی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان کو حقیقی عزت و کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دے۔ اس نے مناجات و سرگوشی کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ذکر و اذکار، اوراد و وظائف کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی تاکہ ان کی نیتیں حصولِ آخرت کے لیے خالص ہو سکیں۔ یہ کتاب چونکہ رسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں سب سے بڑا رسالہ آٹھ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ ہر رسالہ دعائیہ کلام سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کے اندر وعظ و نصیحت اور علاقائی سے کنارہ کشی کی تعلیم ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ بعض دوسرے رسائل بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں:

رسالة فی علم الکتابۃ

رسالة الحيوان

رسالة العامة المعروفة برواية سفيانة

المناظرة بين أبي سعيد السيرافي ومتى بن يونس القناني

كتاب النوادر

تقرير الجاحظ

ان کے علاوہ ابو حیان توحیدی کی طرف منسوب کی جانے والی ایسی کتابوں کی فہرست بھی ہے جو غیر معروف ہیں اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔

رسالة الحنين الى الاوطان

رسالة في ضلالات الفقهاء

كتاب المحاضرات والمناظرات

الامتناع

التذكيرة والتوحيد

كتاب ايجم العقلي اذ اضايق الفضا عن ايجم الشرعي

رياض العارفين

رسالة في اخبار الصوفية

الرسالة البغدادية

رسالة الحيوان

رسالة في بيان ثمرات العلوم

رسالة الى ابي الفضل ابي العميد

كتاب الرد على ابن جنى في شعر المتنبى

رسالة لابن بکر الطالقانی

الرسالة في ضلالات الفقهاء في المناظرة

١٣	لقية الوعاة - جلال الدين عبد الرحمن السيوطي بمطبعة السعادة - مصر
١٤	١٣٢٦ هـ - ص ١٢٧
١٥	لسان الميزان - حافظ ابن حجر العسقلاني - حيدرآباد - ١٣٣١ هـ
	ج ٤ - ص ٣٤٣
١٦	طبقات الشافعية - المطبعة الحسينية - مصر
	ج ٣ - ص ٢ - ٣
١٧	" " " " " " " " " " " " " " " "
١٨	" " " " " " " " " " " " " " " "
١٩	لسان الميزان - العسقلاني - ج ٤ - ص ٣٦١
٢٠	طبقات الشافعية - للسبكي - ج ٤ - ص ٣٠
	لسان الميزان - العسقلاني - ج ٤ - ص ٣٦٩
٢١	معجم الادباء - ج ١٥ - ص -
٢٢	التوحيدى - عبدالرزاق عبيد الله - ص ٦٩
٢٣	لسان الميزان - ج ١ - ص ٣٦١ - ٣٦٣
٢٤	التوحيدى - عبدالرزاق عبيد الله - ص -
	معجم الادباء - ج ٨ - ص ١٤٢
٢٥	" " " " " " " " " " " " " " " "
٢٦	لقية الوعاة - السيوطي - مصر - ص ١٢٢
٢٧	وفيات الأعيان - ابن خلكان - ج ١ - ص ١٣٠
	مكتبة الهمزة - مصر
٢٨	" " " " " " " " " " " " " " " "

- ۲۹ امراء البیان - ج - ۲ - ص ۲۹۲
- ۳۰ معجم الادباء - ج - ۹ - ص ۱۳۳
- ۳۱ میزان الاعتدال - ج ۳ - ص - ۳۰۵
- ۳۲ معجم الادباء - ج - ۱۵ - ص - ۵
- ۳۳ وفيات الاعیان - ج - ۱ - ص - ۷۵
- ۳۴ الصداقة والصدايق - ص - ۳۰ - بحوالہ - مطالعات
- ۳۵ الامتاع والموانسة - ابو حیان توحیدی - ایڈیٹ ڈاکٹر احمد امین
احمد الزیف، لجنۃ التالیف والترجمہ - مصر ۱۹۴۴ء - ج ۱ - ص ۲۲۳
- ۳۶ " " " " ج ۱ - ص - ۲۹۶
- ۳۷ " " " " ج ۱ - ص - ۱۲
- ۳۸ " " " " ج ۱ - ص - ۱۲
- ۳۹ معجم الادباء یا قوت الحمدا - ج - ۱۵ - ص - ۱۰
- ۴۰ طبقات الشافعیہ - تاج الدین ابو نصر عبد الوہاب بن عامر بن عبد الحکیم
السبکی - ج - ۳ - ۱۹۶۲ء
- ۴۱ التوحیدی - عبد الرزاق - ص - ۱۲۸
- ۴۲ البصائر والذخائر - ابو حیان توحیدی - تعلیق - ڈاکٹر ابراہیم کیلانی
مطبعة الانشاء - دمشق - ج - ۱ - ص - ۱۴۹
- ۴۳ المقابسات
- ۴۴ التوحیدی - عبد الرزاق - ص - ۱۵۶
- ۴۵ " " " " ص - ۱۶۰
- ۴۶ التنزیل الغنی - ڈاکٹر ذکی مبارک - ج - ۲ - ص - ۱۶۳

- [illegible]

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

لمصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برکات

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مرتب
عمید الرحمن عثمانی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

ہریان

جلد ۱۰۲ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ مطابق اگست ۱۹۸۸ء شمارہ ۲۵

- | | | | |
|----|--------------------------|-----|----------------------------------|
| ۱۔ | نظرات | ۲۔ | عمید الرحمن عثمانی |
| ۲۔ | مکتوبات عثمانیہ | ۳۔ | جناب قاضی اطہر مبارکپوری |
| ۳۔ | کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟ | ۴۔ | ڈاکٹر محمد یوسف |
| ۴۔ | عہد عباسی کے نامور مترجم | ۵۔ | مسلم یونیورسٹی علی گڑھ |
| ۵۔ | حنین بن اسحاق العبادی کے | ۶۔ | حکیم محمد حسان نگرانی |
| | دستیاب طبی مخطوطات | ۷۔ | ذاکر نگر، نئی دہلی |
| ۶۔ | بغداد کی وجہ تسمیہ | ۸۔ | جناب مقصود احمد |
| ۷۔ | الواح الصنادید | ۹۔ | شعبہ عربی بڑودہ یونیورسٹی |
| | | ۱۰۔ | ڈاکٹر محمد اسلم |
| | | | شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور |

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر
دفتر بڑھکانے ۱۷ دو بانہ ارجامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ خبر دنیا بھر کے تمام امن پسند ممالک اور انسان دوست افراد جماعت کے لئے انتہائی خوش آئند اور باعث اطمینان ہے کہ آٹھ سالہ طویل ترین اور بے معنی خلیجی جنگ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کے پیش نظر جو با حوالی ۱۹۸۷ء کو پاس کی گئی تھی اب ایک سال کی مدت پوری ہونے کے بعد ایران نے اس قرارداد کو بلا شرط تسلیم کر لیا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مذکورہ قرارداد میں سب سے پہلے ایران و عراق کو فوری جنگ بندی کرنے، بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں تک دونوں ممالک کی فوجوں کی واپسی اور جنگ کے دوران قیدی بنائے گئے سپاہیوں کے تبادلے کی بات کہی گئی ہے۔ جنگ بندی کے نفاذ اور مقبوضہ علاقوں سے دونوں ممالک کی فوجوں کے انخلاء کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل جناب کو یار ایک نگران ٹیم مقرر کریں گے۔ اور دونوں ملکوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ تمام متنازعہ امور و معاملات کا تصفیہ اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل کی مدد سے کریں۔

آٹھ سال تک مسلسل جنگ کے باوجود ایران و عراق دونوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس جنگ میں قطعی فتح یا شکست کسی بھی فریق کو حاصل

نہیں ہو سکتی۔ یہ بات دونوں کے مفاد میں ہے کہ ”جنگ بندی“ سے اتفاق کر لیا جائے اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں ”جنگ بندی“ کی قرارداد کو قبول کر لیا جائے۔

اس جنگ کے آغاز سے اب تک اقوام متحدہ، ناوابستہ تحریک، اسلامی کانفرنس اور عرب لیگ کی جانب سے بھی اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بھی ان دونوں ملکوں سے بارہا اپیل کی گئی تھی کہ وہ فوری ”جنگ بندی“ کو قبول کر لیں اور اس وسیع پیمانہ پر جو جانی و مالی نقصانات ہو رہے ہیں اسے روک دیں جس سے مجموعی طور پر کسی بھی ملک کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

بہیں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا ہے کہ اس خونیں جنگ کا پس منظر کیا تھا، اسباب و عوامل کیا تھے اور کن حالات اور مجبوریوں کے پیش نظر دونوں اسلامی اور پڑوسی ممالک جارحیت پر اتر کر اپنے اپنوں ہی کے گلے کاٹ رہے تھے؟ اور دنیا بھر کے ممالک، ملکی، عالمی اور بین الاقوامی تنظیمات کی ”جنگ بندی“ کی مسلسل کوششوں کے باوجود کس طرح دونوں ملک باہم دست و گریباں، سامراجی قوتوں کے آلہ کار اور اسرائیل کے ناپاک مقاصد اور مکروہ عزائم کی تکمیل کرتے رہے۔ ایران، عراق جنگ کی وجہ سے سامراجی اور صیہونی قوتوں اور انسان دشمن عناصر کو یہ موقع ملا کہ وہ اس پورے خطہ میں اپنی عسکری قوت اور اسلحہ سازی میں اضافہ کرے۔ چنانچہ اس سے نہ صرف خلیجی ملکوں بلکہ برصغیر کے اس پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حال ہی میں بلا جواز ایران کے مسافر بردار جہاز پر امریکہ کا قاتلانہ اور سفاکانہ حملہ جس میں جہاز کے عملہ سمیت دو سو نوے مسافر ہلاک ہوئے سامراجی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطہ میں امریکہ کی موجودگی کس قدر نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

غالباً اس دردناک انسانی المیہ سے متاثر ہو کر ہی ایران نے اب بلا مشروط عراق سے جنگ بندی کے لئے اقوام متحدہ کی قرارداد پر از سر نو غور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بلاشبہ یہ جنگ دورِ حاضر کی تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک، تباہ کن اور طویل ترین جنگ تھی جس میں ایک محتاط اندازہ کے مطابق دس لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی اور مجروح ہو کر زندگی بھر کے لئے بیکار اور معذور ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی معیشت اور اقتصادیات پوری طرح تباہ ہو کر رہ گئیں۔ شہر کے شہر ویران اور کارخانے تباہ ہو گئے۔ آٹھ سال کی اس بے معنی جنگ میں جو تباہی اور نقصانات ہوئے اس کی پھر سے بحالی اور تعمیر کے لئے کئی دہائیاں درکار ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد میں ”مناسب بین الاقوامی امداد“ سے دونوں ملکوں کی معیشت کی بحالی اور تعمیر و ترقی کی بات بھی کہی گئی ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بین الاقوامی امداد اور تعاون کے بغیر دونوں ملکوں کی تباہ شدہ معیشت کی بحالی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

یو۔ این۔ آئی کی رپورٹ اور اخباری اطلاعات کے مطابق ایران و عراق کی معیشت کی بحالی پر کم از کم چار سو ارب ڈالر خرچ ہوں گے۔ اس لئے کہ جنگ کے دوران دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی اقتصادی تنصیبات کو تباہ کیا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے پیداواری مرکزوں پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ تاکہ ایک دوسرے کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کر سکیں۔ ماہرین کا کہنا ہے

کہ یہ جنگ کا منصوبہ بنانے والوں کی ایسی حکمت عملی ہے جس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ فوجی ساز و سامان کی مرمت بہت تیزی کے ساتھ ہو جاتی ہے مگر اقتصادی تنصیبات کی تباہی کا جنگ کی پوری کارروائی پر اثر پڑتا ہے کیونکہ ان تنصیبات کو دوبارہ کارآمد بنانے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جو ایک سو تہتر بین ملکی جنگیں ہوئی ہیں ان میں یہ حکمت عملی کامیاب رہی ہے۔

ایک اندازہ کے مطابق دونوں ملکوں کی جنگ سے برباد معیشت کی بحالی میں کم از کم بیس سال لگ جائیں گے۔ جنگ سے قبل ایران روزانہ تقریباً تیس لاکھ بیرل تیل پیدا کرتا تھا، جزیرہ خرگ میں اور اس کے ارد گرد عراق کی پیداوار پچاس فیصد سے بھی کم ہو گئی۔ اسی طرح جنگ سے پہلے عراق دس لاکھ ستر ہزار سے بیس لاکھ بیرل تک روزانہ تیل پیدا کرتا تھا۔ مگر شام سے گزرنے والی پائپ لائن کے بند ہونے اور ترکی سے گزرنے والی پائپ لائن کو شدید نقصان پہنچنے پر عراق کے تیل کی پیداوار تقریباً صفر ہو گئی۔ عراق نے ترکی سے گزرنے والی پائپ کی جلد مرمت کر کے پانچ سو سے ساٹھ بیرل روزانہ تیل کی پیداوار شروع کر دی اور پیداوار مستقل طور پر اسے بحال ہونے کے امکانات ہیں۔

بہر حال اب جبکہ ایران نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا ہے تو امید کی جاتی چاہئے کہ فریقین اس بے فیض جنگ کے بھیانک نتائج کا بھرپور احساس کریں گے اور اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ کسی بھی طرف سے

مستقبل میں کوئی ایسا قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے جس سے نہ صرف خلیجی ممالک اس سے متاثر ہوں بلکہ امن عالم اور سلامتی کو خطرات لاحق ہوں۔
 خدا کرے دونوں ملکوں کے سربراہ پوری تندہی اور سنجیدگی سے اپنے ملک کے اندرونی مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور متاثرین کو بحال کرنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں اور امن عالم کے کار کو آگے بڑھانے میں اپنا تعاون دیں۔ ع
 شاید کہ ترے دل میرا تر جائے مری بات

اسلام کا اقتصادی نظام

تالیف: مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمن

ایک عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام معاشی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ نکالا ہے اور جس پر عمل کرنے کے بعد سرمایہ و محنت کی کشمکش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے ساتھ ساتھ موجودہ صنعتی اور معاشی مسائل کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔ صفحات ۴۰۸، بڑی تقسیم قیمت / ۲۰ روپے مجلد - / ۴۰ روپے

زناۃ المصنفین، اردو بانہار جامع مسجد دیہی

مکتوبات عثمانی

مفتی بنام قاضی

از مولانا قاضی الطہر مبارک پوری بمبئی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی (متوفی شنبہ ۱۰ شعبان ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء) رحمۃ اللہ علیہ میرے خاص علمی محسن ہیں، درحقیقت انھوں نے مجھے ملک کے مستند و معتبر محققین و مصنفین کی صف میں لاکر رکھا کیا ہے، اگر ندوۃ المصنفین سے وہ میری کتابیں شائع نہ کرتے تو شاید میری کتابوں کی اشاعت اتنے باوقار اور معیاری انداز پر نہ ہوتی، مفتی صاحب مرحوم سے میرا تعلق و تعارف زمانہ طالب علمی ہی سے تھا، جب کہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں آئے دن عمار کی آمد و رفت مختلف تقریبات میں رہا کرتی تھی، جہاں تک یا پڑتا ہے مفتی صاحب سے سب سے پہلی خط و کتابت تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، لاہور چھوٹ گیا تھا۔ کسی علمی جگہ کی تلاش تھی میں نے مفتی صاحب کو لکھا کہ مدرسہ علیہ کلکتہ میں جگہ ہو تو مجھے رکھوادیں۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب نے لکھا کہ وہاں جگہ میں پڑھ چکی ہیں، پھر بھی آپ مولانا سعید احمد کے بانی صاحب کو لکھیں اور میرا حوالہ دیں، اس کے بعد خط و کتابت کی باری نہیں آئی۔ میں ۱۹۵۷ء میں بمبئی گیا۔ اس میں مفتی صاحب کی

شفقت اور خوردہ نوازی کو بڑا دخل ہے۔ اس زمانہ میں مجاہد ملت حضرت مولانا
حفظ الرحمن صاحب اور حضرت مفتی صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے اور
خان منزل کھانڈیا اسٹریٹ میں مرحوم عبداللہ محمد عرب سکری صاحب کے یہاں
قیام کرتے تھے، ہم لوگ صبح دشام ان حضرات کی خدمت میں حاضری دیتے اور
مختلف موضوعات پر کھل کر تبادلہ خیال کرتے تھے، ۱۹۶۵ء میں مفتی صاحب نے
ندوة المصنفین سے میری کتاب ”عرب و ہند رسالت میں“ میں شائع کی، اسی زمانہ
سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ویسے مفتی صاحب زیادہ خط و کتابت کے عادی
نہیں تھے اور نہ ہی ان کو اس کے لیے وقت ملتا تھا، ایک مرتبہ معذرت کرتے ہوئے
تحریر فرمایا کہ خط و کتابت کے بارے میں میرا مزاج حضرت الاستاذ مولانا شاہ انور صاحب
کی طرح ہے۔ اس کے باوجود میرے ہر خط کا جواب دیر سویر دیا کرتے تھے جس میں شفقت،
محبت، خلوص، خوردہ نوازی اور تشبیح ہمت افزائی ہوا کرتی تھی، اپنی کتابوں کے لیے
دوسروں سے مقدمہ لکھوانے کا میرا ذوق نہیں ہے، ندوة المصنفین سے مفتی صاحب نے
میری آٹھ کتابیں شائع کیں اور کسی کتاب پر دوسرے کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ ہر کتاب کی ابتدا
میں مفتی صاحب کی چند سطریں ہیں جو بہتر سے بہتر مقدمہ سے بڑھ کر ہیں، یقین ہے کہ اگر
میں کسی دوسرے بزرگ سے مقدمہ لکھواتا تو اس میں وہ خلوص، خوردہ نوازی، اعتراف اور
تشبیح کی وہ فراوانی نہ ہوتی جو مفتی صاحب کی چند سطروں میں موجود ہے۔ یہی حال ان کے
خطوط کا ہے۔

حق تصنیف کے نام پر رائٹلی یا کتاب کی فروختگی میرے ذوق و مزاج کے
خلاف ہے، میں نے کبھی کسی کتاب پر کوئی رقم نہیں لی ہے بلکہ خود میں نے رقم خرچ کی
ہے حتیٰ کہ قاہرہ میں جب میری کتابوں کے شائع ہونے کی باری آئی تو دار الانصار
کے مالک مرحوم سید اسعد سید احمد نے رائٹلی کی بات کی تو میں نے اُن سے کہہ دیا کہ

آج تک میں نے اپنے ملک میں کسی سے حق تصنیف کے نام پر کوئی رقم نہیں لی ہے۔ قاہرہ میں کیا لوں گا، آپ شائع کر کے فروخت کریں البتہ مجھے اتنے نسخے دے دیں۔ یہی صورت میں نے ندوۃ المصنفین سے کتابیں شائع ہونے کے وقت اختیار کی، اور جب پہلی کتاب ”عرب و ہند عبر رسالت میں“ شائع ہوئی اور مفتی صاحب نے ۲۵۰ روپے عنایت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس کے عوض تاجرانہ نرخ پر اس کے نسخے لے لیے، اس کے بعد ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لیتا رہا، یہ صورت میں نے اپنے مزاج کے تقاضے پر اختیار کی اور اپنا علم فروخت کرنے کے بجائے اس کو فروغ دینے کی راہ نکالی۔ درمیان میں بعض اہم اور مشہور اداروں کے ذمہ داروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی کتابیں ہم کو دیں، اس میں آپ کا فائدہ ہوگا مگر میں نے کہا کہ یہ بات وضع داری اور مروت و فتوت کے خلاف ہے کہ مفتی صاحب نے میری کتابیں شائع کر کے اوساط علمیہ میں میرا تعارف کرایا ہے اس کے بعد میں دوسرے ادارے سے بات چیت کروں، پھر میں اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کی قیمت چند روپے کی صورت میں وصول کرنا نہیں چاہتا۔

خوش قسمتی سے مفتی صاحب کے جو خطوط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ان میں پہلا خط ۳۴ فروری ۱۹۵۹ء کا اور آخری خط ۱۹ جنوری ۱۹۸۲ء کا ہے لیکن اکیس بائیس سال میں یہ خطوط آئے اور تقریباً ایک سال میں ایک خط کا اوسط پڑتا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ خطوط آئے مگر افسوس کہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے، جو رہ گئے ہیں ان میں علم دوستی، فراخ دلی، خوردہ نوازی، شفقت، خلوص اور تعلق کی وہ قدیں ہیں جو ہمارے بزرگوں میں عام طور سے مفقود ہیں، مفتی صاحب کے غیر محفوظ خطوط میں وہ تعزیتی خط بہت ہی اہم تھا جسے آپ نے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ کے وصال پر مجھے لکھا تھا، افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔

(۱) مورخہ ۳۴ فروری ۱۹۵۹ء محترم مولانا دادم مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، ”رجال السند والہند“ مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے، ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہو جاتی ہے، مولانا سعید کو مزید تاکید لکھ دوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلاء کو پُر کر دیا ہے، بھرے ہوئے موتی کیجا ہو گئے ہیں، اور سند و ہند کے ارباب علم و حکمت کا ایک خوب صورت ہار تیار ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی

(۲) مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا دادم مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہنچ گیا تھا۔ ”برہان“ میں جلد شائع ہوگا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمایا کریں۔ کتاب ”ندوة المصنفین“ سے ضرور شائع ہوگی، اس کو مکمل کر لیں، ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہوگی؟ اس کو صاف کر لیں، رائٹنگ کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھئے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں۔ پھر بھی خدمت کی جائے گی میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورت حال ہے۔

غالباً ۱۸ کو بمبئی آنا ہوگا، حج کیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ بخیر و عافیت لہ ”عرب و ہند عہد رسالتیں“ میری پہلی کتاب جو ندوة المصنفین سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی۔

(۳) مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ء، مخلصم و محترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا، مجھے خود خیال تھا کہ اس دفعہ
آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ بیچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط
لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہو سکا، کاموں کا ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت
کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بکئی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں
آنا جانا مشکل ہو گیا تھا، افسوس آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ
تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کر لیتا، کتاب کا آخری باب فوراً ارسال
فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہو جائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی
کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کاتب کو دے دیا گیا ہے، دونوں
مضمون محفوظ ہیں، ان شاء اللہ ”برہان“ ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین
کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آرہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو
دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں، آپ کے مضمون گرانقدر
ہوتے ہیں، واپس کیسے ہو سکتے ہیں، امید ہے آپ بہ جلد وجوہ بغیر و عافیت ہوں گے، والسلام
خان صاحب گارڈی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا کیوں کہ
چھوٹا لڑکا ساتھ تھا۔ عتیق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

(۴) مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۴ء برادر مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا گرامی نامہ ملا تھا، لغافہ بھی پہنچ

جناب اے، اے خان صاحب بھئی سکرٹری جمعیۃ علماء ہمارا شٹر۔

گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے انشاء اللہ کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم کوشش کر دوں گا، فہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، علمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے۔ ”ابن حزم“ والا مضمون جلد شائع ہوگا، صدارت کا انتخاب ہو چکا ہوگا۔ ابھی یہاں خبر نہیں پہونچی، کتاب کے سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی ہوگی، اُمید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ فقط، والسلام عتیق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۵) ۶ جون ۱۹۶۵ء
مخلص مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجد ہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، میں حج کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں علیل ہو گیا تھا، سخت قسم کا فلو ہو گیا تھا، بالکل بے جان ہو گیا، یہاں پہونچ کر بھی اس کے اثرات رہے، کمزوری اب بھی باقی ہے، شکر ہے کتاب طبع ہو گئی۔ اور عمدہ طبع ہو گئی، آپ کے لیے بطور معاوضہ نہیں بطور ہدیہ ۲۵۰ طے شدہ ہیں، جیسے ہی گنجائش نکلے گی ارسال خدمت کر دیے جائیں گے، ادارے کی حالت بس یوں ہی سی ہے یہ مجھے ذہنت نہیں ملتی دوسروں کے بس کا کام نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ضروری مصارف میں بھی تنگی ہوتی ہے، جس کتاب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، یہی میں ضرور دیکھوں گا، خدا کرے ادارے سے شائع ہو سکے، مدینہ منورہ میں عزیز مولوی خالد سلطانی

۱۔ جمعیتہ علماء ہمارا شٹر کی صدارت کا انتخاب۔ ۲۔ میں نے اس کے بدلے تاجرانہ ترغ پر کتابیں لے لی تھیں، اس کے بعد یہی روایت قائم رہی کہ ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لے لیتا تھا۔ ۳۔ عزیزم خالد کمال سلمہ، یہ اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔

سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں قیام صرف تین روز رہا، یونیورسٹی بھی نہ دیکھ سکے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

عقیق الرحمن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۶) مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۵ء

مخلصم و محترم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا۔ جواب دینا اور بھوپال کے درمیان چلتی ٹرین سے لکھ رہا ہوں، پٹھان کوٹ زٹناٹے سے دوڑ رہی ہے اور قلم ہل رہا ہے، یہ معلوم ہو کر کہ قرعہ میں نام نہیں آسکا، افسوس ہوا، قرعہ ہی ٹھہرا، اس کی کشتی اکثر حالات میں ہواؤں کے خلاف چلتی ہے، صورت یہ ہے کہ گزشتہ سال کے تلخ تجربے کے بعد اس سال کمیٹی میں یہ طے ہو گیا تھا کہ میں اپنے پاس کوئی علیحدہ کوٹا نہیں رکھوں گا، چنانچہ میرے پاس ایک سیٹ بھی پہنچی ہے، سفارش ضرور کر سکتا ہوں اگرچہ وہاں بھی چند ہی سیٹیں ہیں، کمیٹی میں تو زیادہ کی بات ہوئی تھی مگر حکومت نے اندازے سے بہت کم تعداد نشستوں کی کر دی ہے، اس لیے وہ صورت باقی نہیں رہی، بہر حال اگر آپ کالج فرض ہے اور آپ پہلی دفعہ جا رہے ہیں تو مسٹر دی، اے قدوائی ڈپٹی سیکریٹری اکسٹرنل ایگزیکٹو دہلی کے نام درخواست بھیجیں، اور اس کی کاپی مجھے بھیج دیں، درخواست ٹائپ شدہ انگریزی میں ہو، میں یہاں ممکن سعی کروں گا، کیوں کہ بحالت موجودہ میری حیثیت سفارشی ہی کی ہے، میرے پاس براہ راست کوئی کوٹا نہیں ہے۔ قدوائی صاحب کے پاس بھی نہیں ہے، مگر اکاؤنٹ کا درخواستوں پر ہم اور وہ مل کر غور کر سکتے ہیں، اور مجھ سے پوچھئے تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس سال صبر سے بیٹھے رہیں، اور اگلے سال کا انتظار کریں، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، بھوپال سے غالباً پرسوں واپسی ہوگی۔ مدینہ منورہ سے مولوی خالد کمال سلمہ کا خط آیا تھا جواب لکھوں گا،

علماء ہند کی عربی تصنیفات پر آپ کا مقالہ پاکر کتاب شائع ہوئی تھی، مولوی خاں
سیف اللہ کو جدہ میں اس کی ضرورت ہے کیا کرنا چاہیے۔ فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی

(۷)..... ۱۹۶۵ء

محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، ڈاکٹر صاحب موصوف کو ادارے
کے قواعد و ضوابط کی کاپی بھیجی جا رہی ہے۔ میں ان کو خط بھی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں،
لائف ممبر بن جائیں تو اس وقت ادارے کو بڑی مدد مل جائے، جنگ کے بعد سے
حالات بہت نازک ہو گئے ہیں، یہاں کی مطبوعات کی اعلیٰ پیمانے پر کچھت پاکستان
میں ہوتی تھی، وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ کتابیں منگاتے تھے اور اس طرح
ادارہ کی اہم ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں، اب یہ سلسلہ تمام تر منقطع ہے اور مستقبل قریب
میں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آتی، ذی استطاعت صاحب خیر اور صاحب ذوق اگر توجہ
سے کام لیں تو یہ نازک وقت ٹل سکتا ہے، بہتر ہو گا کہ آپ ہی ڈاکٹر صاحب موصوف
کو تازہ مطبوعات کے بعد خط تحریر فرمادیں، ابھی تک آپ کی دوسری کتاب کی کتابت
شروع نہیں ہو سکی ہے، اور اس کی وجہ یہی حالت کی ناسازگاری ہے، جیسے ہی موقعہ
ملے گا کام شروع کرایا جائے گا، ”عرب و ہند عہد رسالت میں“ پر تبصرہ کا کٹنگ بھی
مل گیا تھا، امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی

(۸) ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء

مخلص و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، پہلا خط بھی پہنچ گیا تھا، تاخیر
جواب کے لیے معذرت خواہ ہوں، سب سے پہلے تو زیارت حرمین شریفین سے بحیرت
۱۵ جناب ڈاکٹر عبد اللطیف خاں صاحب مقیم کویت۔

تمام واپسی پر مبارکباد قبول فرمائیں، بہت خوب ہوا کہ مولوی خالد سلمہ کی موجودگی میں والدین کو یہ سعادت میسر ہو گئی، ادارے کے حالات ناقابل بیان حد تک نازک ہیں، ہر مہینے ہی انتظار رہتا ہے کہ پاکستان سے سلسلہ کھلے اور کام جاری ہو، یہ پورا سال انتہائی پریشانی میں گزرا ہے، اور اب پانی سر سے اڈنچا ہے، افسوس دوستوں تک کو یہ احساس نہیں کہ ندوۃ المصنفین جیسے بہترین علمی اور مذہبی ادارے پر کیا بیت رہی ہے، جس روز بند ہو جائے گا دنیا حیرت کرے گی، بمبئی میں کام کی اچھی خاصی گنجائش ہے مگر کرے کون؟ غیر ضروری کاموں کے لیے روپیہ جمع ہو جائے گا مگر ندوۃ المصنفین کو ”چند لاکھ ممبر“ چند خاص ممبر اور بہت سے عام ممبر نہیں ملیں گے، یا اللعجب! آپ کی کتاب میں تاخیر کا سبب زیادہ ہی سبب ہے، تمام ضروری کام روک دیے گئے ہیں، کیونکہ کچھ ہے ہی نہیں، اساک بے جوڑا ہوا ہے، کتاب کا مسودہ برائے کتابت بہر حال اسی عمدہ کاتب کو دیا جا رہا ہے، توقع ہے چند مہینوں میں کتاب طبع ہو کر سامنے آجائے، یہی فکر ہے کہ کاغذ کہاں سے آئے گا، طباعت کی رقم کا کیا ہوگا؟ میں حالات کی ناسازگاری سے گھبرانے والا نہیں ہوں، مگر عزم و ہمت کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے، امید ہے آپ یہ ہمہ وجہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام، عتیق الرحمن عثمانی۔

(۹) ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء۔

مخلص و محترم جناب مولانا دام محمد عم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ اگرچہ مولوی محمد ظفر احمد خاں کے نام ہے

لیکن میرے ذمہ ہی جواب کا قرضہ ہے، وہ خط اس وقت سامنے نہیں ہے، کہیں دبا ہوا ہوگا، میری حالت ایسی ہی ہو گئی ہے، کتابت شکر ہے مکمل ہو گئی ہے، یہاں تک کہ

۱۰ ندوۃ المصنفین کے قدیم خادم اور آفس انچارج چند سال ہوئے انتقال کر گئے، ضیق انفس کے دائمی مریض تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

پرسوں میں نے بھی چند منٹ نکال کر اپنے دو صفحے لکھ دیے ہیں، یہ چھوٹی سی بات تھی مگر بڑی تھی کہ میرے پاس ان کاموں کے کرنے کا وقت ہی نہیں، کتاب ان شاء اللہ دیر آید درست آید، کامصداق ہوگی، کوشش کی جائے گی کہ پروف آپ دیکھ سکیں، یہ اچھا ہوگا،

حاجی احمد غریب صاحب کی رحلت کا قلب پر غیر معمولی اثر ہے، بڑے صاحب خیر، اعلیٰ درجہ کے منتظم اور تعمیری صلاحیت کے شخص تھے، اجتماعی کاموں سے بھرپور دلچسپی لیتے تھے، افسوس کم عمر پائی، ان کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، میں نے آج ہی فیسی محل کے پتے پر حافظ محمد صدیق صاحب کو خط لکھا ہے، اندیشہ ہے کہ حافظ صاحب بمبئی نہ ہوں اور خط ضائع ہو جائے، اچھا ہو کہ خط محفوظ ہو جائے، امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ بخیر دعائیت ہوں گے، مولوی خالد صاحب سلمہ کی کامیابی سے قلبی مسرت ہوئی، صالح اور لائق نوجوان ہیں، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی اولاد میسر ہوئی۔ میں الحمد للہ بخیریت ہوں، دوسری جانب مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کے لیے چھوڑ دی ہے۔

صیق الرحمن عثمانی، دفتر برہان جامع مسجد دہلی ۱۰

خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تعزیتی خط بھی میرے پاس محفوظ ہے جس کو آپ نے الحاج احمد غریب صاحب مبینی مرحوم کی وفات کے سلسلہ میں ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق صاحب مبینی مرحوم کے نام لکھا تھا اور اوپر خط میں جس کے محفوظ ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے، اس مکتوب کو بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۶۷ء مخلص و محترم جناب حافظ محمد صدیق صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کن لفظوں میں حاجی احمد غریب صاحب مرحوم کی تعزیت کی جائے، آپ کے قلب پر تو جو کچھ گذر رہی ہوگی، ہم لوگ بھی اس المناک خبر کو سن کر دم بخود رہ گئے، بہت سخت اور غیر معمولی حادثہ ہوا ہے، انا اللہ وانا الیہ راجعون،

صد افسوس ملت کا ایک سچا خادم اُٹھ گیا، مرحوم سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۷۷ء میں ”محمدی جہاز“ پر ہوئی تھی، مرحوم امیر الحج تھے، اور ہم لوگ ایک ڈیلی گیشن میں حجاز جا رہے تھے، اس کے بعد سے تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت مرحوم کی ایک ایک خصوصیت رہ رہ کر یاد آرہی ہے، اعلیٰ درجہ کے منتظم، مسّت کے زبردست بھی خواہ، اجتماعی مصالحتوں کو سمجھ کر بہترین کام کرنے والے، بہت ذی اثر اور قوم کے معتمد، جس کام کو ہات میں لیتے انجام تک پہنچاتے، خاموشی کے ساتھ امور خیر میں حصّہ لینے والے، ہندوستان چھوڑنے سے کچھ ہی پہلے مرحوم سے اسی فنیسی محل میں بہت دیر تک ملاقات رہی تھی، افسوس ایسا مخلص خدمت گزار اور غیر معمولی کارکن اس قدر جلد ہم سے جدا ہو گیا، اس درجے کے کارکن جن میں اجتماعی اور اصلاحی کاموں کی اتنی اعلیٰ صلاحیت ہو کم ہی ہوتے ہیں، مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے تعمیری کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے، صاحبو صدیق مسافر خانہ کی آخری منزل، انجمن خدام البنی، اور دوسری جمعیّتیں سب ہی ان کی خدمات کو یاد کریں گے، آپ کے لیے اور مرحوم کے بچوں اور اہلیہ کے لیے یہ صدمہ خاص طور پر جاں کاہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر و رفا سے نوازیں، ازراہِ کرم ان کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادوں تک کلماتِ تعزیت پہنچادیں۔

اصبرنک صابرین فانما
صبر الہیۃ عند صبرا لہ اس
خیر من العباس صبرک بعدہ
واللہ خیر منک للعباس
علیق الرحمن عثمانی

(۱۰) ۱۹ جون ۱۹۷۷ء مخلص و محترم جناب مولانا دام محمد ہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کرم نامہ پہنچا، ”عرب و ہند عہد رسالت“ جتنے نسخے خدمت گرامی میں پیش کئے گئے تھے، اتنے ہی نسخے اس کتاب کے بھی پیش

کئے جائیں گے، میں نے مولوی محمد ظفر احمد خاں سے کہہ دیا ہے، آپ ان کو وہی پہلے کی تعداد تحریر فرمادیں، شاید ایسا ہوا تھا کہ نقد روپے کے بجائے آپ نے کتابیں لی تھیں، اس کے بعد ہی صورت باقی رہے گی تو تا جراتہ رعایتی معاملہ ہو جائے گا، افسوس آپ کو زحمت انتظار اٹھانی پڑی، پہلا خط میرے سامنے نہیں ہے، امید ہے آپ بخیر عافیت ہوں گے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ والسلام۔

عیتق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۱۱) ۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجد ہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔۔ تہنیت نامہ ملا تھا، مختلف سفر درپیش رہے، جواب میں تاخیر ہو گئی، آپ کے کلمات تہنیت سے قلب پر خاص اثر ہوا ہے، اور ان الفاظ سے تعلق خاص اور روحانی ربط کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا ابے طلب ایک چیز آئی ہے، جس کی نوعیت کسی رسمی خطاب کی نہیں بلکہ علمی اعزاز کی ہے، اس لیے لائق شکر ہے۔ بہت سے اصحاب علم مجھ سے کہیں زیادہ اس اعزاز کے مستحق ہیں، مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے، آپ کا رسمی شکریہ کیا ادا کروں، اسلام اور ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے متعلق تمام مضامین کتاب کی صورت میں آنے چاہئیں، ان پر نظر ثانی فرمائیں، مناسب اضافے بھی ہو جائیں، مسودہ جلد آئے تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کی اشاعت شامل کر لی جائے، ”ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں“ پر ارشاد کی تعمیل میں چند لائین لکھ دی تھیں، عزیزم مولوی خالد کمال سلمہ، بہت انتظار کر کے گھر واپس چلے گئے، ان کے حالات سے تردد ہے، خدا کرے ویرا وغیرہ جلد آجائے مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ فقط، والسلام۔

عیتق الرحمن عثمانی

(۱۲) ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء

مخلصم و محترم جناب مولانا دام محمد ہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا۔ عزیزم مولوی خالد کمال کے بخیریت تمام پہونچنے کی اطلاع ہوئی، نہایت سعادت مند اور قابلِ قدر اور توجہ و جانِ عالم ہیں، ان کے لئے دعا کرتا ہوں، یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ اسلامی ہند سے متعلق مضامین ایک مستقل تصنیف کے روپ میں مرتب ہو گئے ہیں۔ ان کو جلد سے جلد ارسال فرمائیں کتابت فوراً شروع کرادی جائے گی، زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے، جو کام جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے، ان شاء اللہ ۱۹۷۶ء کی مطبوعات میں آجائے گی، کاتب رامپور میں ہیں، مسودہ رجسٹری سے رام پور بھیج دیا جائے گا، جس ٹکڑے میں مزید اضافے کا خیال ہو اس کو بعد میں بھیج دیجئے گا، گھانا اطمینان سے جانا چاہیے مگر جانا چاہیے۔ ایک ضروری کام تھا، آپ اس کو زیادہ بہتر اور سلیقے سے کر سکیں گے: ”ندوة المصنفین“ کے اغراض و مقاصد عربی میں عمدہ اور نفیس ٹائپ میں طبع ہونے چاہئیں، دس بارہ سال ہوئے لیکن میں طبع ہوئے تھے، شاید مولانا عبد الحمید نعمانی نے ان کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ رائے ہوگی تو عربی، اردو دونوں کی کاپیاں بھیج دی جائیں گی، یہاں یہ کام ٹھیک نہیں ہو سکتا، ٹائپ کا دہلی میں کوئی اچھا پریس نہیں ہے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب مستقل بیمار ہیں، کوئی نیا کام ان سے نہیں ہوتا، میری بے فرصتی اور ہجوم کار کا آپ کو اندازہ ہے، ضروری مصارف ادا کر دیئے جائیں گے۔ والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی۔

(۱۳) ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء

مخلصم و محترم جناب مولانا دام محمد ہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ ملا تھا، جواب میں تاخیر ہی ہو جاتی ہے۔ اس درمیان میں متعدد سفر بھی رہے، کیا عرض کر دوں پاکستان سے کاروبار بند ہونے سے ادارہ کا ڈھانچہ بگڑا جا رہا ہے، محض ساکھ ہے کہ گاڑی کھسک رہی ہے، مجموعہ مقالات دو مہینے

قبل آجاتا تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کتاب کو شامل کر لیا جاتا، اب ۱۹۷۰ء کی کتابوں میں شامل ہوگی، بہر حال فوراً بھیج دیں، کتابت میں بھی وقت لگتا ہے، ادھر ۱۹۷۰ء کے بھی تین مہینے گزرنے کو ہیں، ان شاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی، یعنی زیادہ سے زیادہ جولائی تک، اس کے بعد ”العقد الثمین“ کی کتابت ہوگی، بے شک اس طرح آپ کی کتب گرامی کا پورا سیٹ ”ندوة المصنفین سے شائع ہو جائے گا، ”العقد الثمین“ پر زیادہ توجہ دیں تو بہتر ہوگا۔ تحریر فرمائیں کہ اس کا حجم کتنا ہوگا، شاید مناسب ہو کہ مجموعہ مقالات میں دو ایک مقالے غیر مطبوعہ بھی شامل ہو جائیں، بعد میں بھیج دیجئے گا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں برکت عطا فرمائی ہے اور خلوص بھی، امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے، پرسوں احمد آباد کا سفر ہے اور شروع اپریل میں شاید کیرالا کا، ایک بڑی مسجد کا افتتاح کرنا ہے، بمبئی سے گزرنا ہوگا، مگر غالباً صرف دو گھنٹے ہوائی اڈے پر ٹھہرنا ہو، بہت دنوں سے بمبئی آنا نہیں ہوا، آپ حضرات سوچ سمجھ کر ایسا پروگرام بنائیں کہ اس بڑے اور اہم شہر سے ادارے کو کچھ لائف ممبر کچھ معاونین خاص کچھ معاونین، کچھ محسن خاص مل جائیں تو ایک ہفتے کے لیے بمبئی آجاؤں، اس سفر میں ادارے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

علیق الرحمن عثمانی۔

(۱۳) ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۷ رجب ۱۳۹۰ھ۔ مخلص و محترم جناب مولانا دام محمد تم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمات نامہ ملا، حالات معلوم ہوئے، قانون فطرت کی رنگینیاں بھی عجیب ہیں، جب قوی جاندار اور مضبوط ہوتے ہیں، فرصت ہی فرصت رہتی ہے، اور جس وقت بڑھاپا اپنی تمام ناتوانیوں اور برکتوں کے ساتھ آتا ہے، بے پناہ لہ پہلے خیال تھا کہ العقد الثمین کا ترجمہ شائع کر لیا جائے، اسی سلسلے میں یہ بات ہے، بعد میں یہ ارادہ ترک کر کے خلافت راشدہ، خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ کے اسلامی بند پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

مشغولیتیں ہو جاتی ہیں، بہر حال جو کچھ بن پڑتا ہے ہو جاتا ہے، پوتے کے درود مسعود پر
 دلی مبارکباد قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ علم و عمر کی دولت سے نوازیں، مولوی خالد کمال سلمہ
 کو میری طرف سے تہنیت لکھ دیں، ”ما اثر و معارف“ کی کتاب غالباً نصف سے
 متجاوز ہو چکی ہے، جلد مکمل ہو جائے گی، ایک مہینے کے بعد مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب
 سے دریافت فرمائیں، آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ایسے کام روز روز نہیں ہو کرتے،
 بنا بریں نہایت مناسب ہے کہ ”العقد الثمین“ ہر حیثیت سے مکمل ہو، اللہ تعالیٰ نے
 آپ کے کام میں برکت دی ہے، ان شاء اللہ جلد ہوگا، اور بہتر ہوگا، ط انصاری صاحب
 کو کتابیں کس پتے پر روانہ کی جائیں۔ فقط، والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی

مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب سلام مسنون پہونچاتے ہیں، پاکستان سے کام
 بالکل بند ہے اس لیے ادارے کی حالت سقیم تر ہے۔ آپ جیسے دوست ہمت بڑھائیں
 تو بمبئی میں کم سے کم ادارے کے ایک صد معادن بن سکتے ہیں، کچھ ہزار کے، کچھ سو کے،
 اور بہت سے چالیس روپے سالانہ کے، ندوۃ المصنفین جیسے ادارے روز روز قائم نہیں
 ہوتے، یہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے، فقط والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی، دفتر برہان، جامع مسجد دہلی۔

(۱۵) ۸ جولائی ۱۹۷۱ء

مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، ۲۵ کتابیں تو شاید جا چکی ہیں،
 مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب نے انہی کے متعلق لکھا ہوگا، یوں اُن سے کل دریافت
 کروں گا، اس وقت وہ یہاں نہیں ہیں، در خلافت راشدہ اور ہندوستان کے مسوؤے
 کا انتظار ہے، آپ کی کتاب شائع کر کے مجھے مسرت ہوتی ہے، افسوس ہے کاروبار
 کی حالت سقیم تر ہے، ہمارے لٹریچر کا حلقہ پاکستان میں زیادہ ہے، اس حلقے کی

وقت خرید بھی زیادہ ہے لیکن برسوں سے یہ سلسلہ منقطع ہے، گفٹ کے نام پر کچھ پکیٹ چلے جایا کرتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، بہت دنوں سے اس ارادے میں ہوں کہ ببئی آکر ادارے کا حلقہ معاویین بنایا جائے، اس مشکل وقت میں اس سے بھی مدد ملے گی، کچھ لائف ممبر کچھ معاویین خاص، اور ایک تعداد معاویوں کی مل جائے گی، بشرطیکہ ایک ہفتے قیام ہو اور کوئی دوسرا کام ساتھ نہ ہو، اور احباب بھی بھرپور تعاون دیں، آپ کے حالات سے تعلق خاص رہتا ہے، خط لکھنے میں کوتاہیوں مکان سے واپس تشریف لے آئیں تو اس پر دو گرام پر غور فرمائیں، مولوی خالد سلمہ امید ہے بخیریت ہوں گے، ”برہان“ کے لیے کوئی نفیس مضمون بھی تحریر فرمائیے۔

حنیق الرحمن عثمانی

(۱۶) ۲۴ اپریل ۱۹۷۷ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام محمد ہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ پہنچا، مبارکباد قبول فرمائیں، شکر ہے بخیریت تمام تشریف لے آئے، پچھلے دنوں ببئی جانا ہوا تھا اور قیام بھی اندازے سے ہو گیا، مقصد وہی ”مددۃ المصنفین“ کی اعانت کی جانب توجہ دلانا تھا، آپ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا وطن تشریف لے گئے ہیں، آپ حضرات کو اب ادارے کی جانب خاص توجہ کرنی چاہیے، نازک وقت آگیا ہے، ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے، کتاب کی بات یہ ہے کہ اس کی کتابت بہت دنوں سے مکمل ہوئی رکھی ہے جیسے ہی کاغذ کا انتظام ہو گا طبع کرادی جائے گی، بنا بریں اب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آخر میں کچھ اضافے ہو جائیں، مسودہ بھیج دیا جائے گا لیکن دشواری یہ ہے کہ پروف ریڈنگ کے وقت اس کی ضرورت ہو گی، یہ کام ہو جائے تو پھر آپ الطینان سے اس پر نظر ثانی کر سکتے ہیں، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں، آپ حضرات کم سے کم

معاونین کے حلقوں کی توسیع کا کام کر سکتے ہیں، حکیم اصلاحی صاحب وغیرہ سے بھی ذکر ہوا تھا،
عتیق الرحمن عثمانی، دفتر ”برہان“ جامع مسجد دہلی۔

(۱۷) ۷ اگست ۱۹۷۲ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمات نامہ ملا، گرامی نامے کا جواب یہاں سے بھیج رہا ہوں، ۲۷ جولائی کو گیا ہے، تعجب ہے وہ خط آپ کو نہیں ملا، ملا ہوگا تو بہت تاخیر سے، اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ ”خلافت امویہ اور ہندوستان“ کا مسودہ فوراً روانہ فرمادیں، جس طرح بھی ہو سکے گا اس کتاب کو ۱۹۷۲ء کی مطبوعات میں شامل کیا جائے گا۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ فقط، والسلام، عتیق الرحمن عثمانی۔

(۱۸) ۲۴ اگست ۱۹۷۲ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ۱۶ اگست کو پہنچ گیا تھا، لیکن مسودہ پر سوں ۲۲ اگست کو پہنچا ہے، پتے پر آپ نے ”ندوة المصنفین“ کے بجائے نیشنل مصنفین لکھا تھا، ہو سکتا ہے اسی وجہ سے تاخیر ہوئی ہو، ان شاء اللہ جلد کتابت شروع کرائی جائے گی، بڑا کام ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، یقیناً آپ نے اس کتاب کی تیاری میں محنت شاقہ برداشت کی ہے، خدا کرے ”ندوة المصنفین“ کسی خدمت کے لائق ہو جائے، بہت دنوں سے بمبئی کے خیال میں ہوں، وہاں ادارے کا بہتر کام ہو سکتا ہے مگر آپ حضرات ہمت نہیں بڑھاتے ہیں، مئی میں ”دار المصنفین“ کی وجہ سے رک گیا کہ اس قدر جلد دوسرا کام شاید نہ ہو سکے، امید ہے حالات کا جائزہ لے کر

دار المصنفین اعظم گڑھ کا ایک وفد اپنے ادارے کے تعاون کے لیے اپریل میں بمبئی گیا تھا۔

تحریر فرمائیں گے، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں اور خود بھی دعا کا محتاج ہوں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۷۰

(۱۹) ۱۹ مئی ۱۹۷۳ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بہت دنوں سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔
پچھلے دنوں کلکتہ جانا ہوا تھا، وہاں حکیم غم زماں صاحب کے پاس آپ کا خط پہنچا تھا،
جس سے معلوم ہوا تھا کہ ان دنوں مکان پر تشریف لائے ہوئے ہیں، اغلب یہ ہے کہ اب
بیمئی واپس ہو گئے ہوں گے، کتاب کی کتابت مکمل ہو گئی ہے، غالباً ۶۵۰ صفحات پر
کتابت ختم ہوئی ہے، اب اور کیا کرنا ہے؟ ان شاء اللہ جلد تمام کاپیاں پریس کو دے
دی جائیں گی، بیمئی میں ادارے کا کچھ کام ہو جاتا تو اچھا ہوتا، یہ دن معمول سے زیادہ سخت
گزر رہے ہیں، فقیہ صاحب، دسونی صاحب، اور حافظ کا صاحب وغیرہ مدد کے لیے تیار
ہیں، دوسری اہم تر بات جس کی وجہ سے خاص طور پر یہ کارڈ لکھا ہے ”برہان کے لیے
مضمون کی ہے، آپ کے مقالات عام طور پر ”معارف میں آتے ہیں“ اور ”برہان“
ان سے محروم رہتا ہے، کیا یہ علمی رسالہ آپ کے مقالات گرامی کے لائق نہیں ہے؟
ازراہ کرم بواپسی اپنے اس رسالہ کے لیے کوئی نفیس مضمون ارسال فرمائیں، میری
دلی خواہش ہے کہ اب آپ دہلی منتقل ہو جائیں، برابر خیال میں ہوں، معمولی سرد سامان
کا انتظار ہے، حالات اور خیریت سے مع مضمون کے مطلع فرمائیں۔ فقط والسلام،
عتیق الرحمن عثمانی

(۲۰) ۱۱ دسمبر ۱۹۷۶ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، ”دیاریہ یورب میں علم و علماء“ کا
مسودہ بھی پہنچ گیا، کیا عرض کروں حوصلہ تو بہت کچھ ہے لیکن مزاج کی افست داور

وسائل کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہوں، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مگر ”ندوة المصنفین“ اسی بے نوائی کے عالم میں ہے، ان دنوں میں اور بھی زیادہ دشواری ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے، ان شاء اللہ آپ کی یہ کتاب بھی ادارے سے شائع ہوگی، جیسے ہی موقع ملے گا، اور یہ موقع جلد آئے گا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا جائے گا، یہ معلوم ہو کر کہ ”خلافت عباسیہ اور ہندوستان“ پر توجہ سے نظر ثانی ہو رہی ہے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی برکات خاص سے نوازا ہے، قلب کو اس سے اطمینان ہوتا ہے کہ ایک مخلص عالم دین اور لائق مصنف کی محنت ”ندوة المصنفین“ جیسے ادارے کے سیلے سے ٹھکانے لگ گئی، امید ہے آپ ہر طرح بعافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی

(۲۱) ۱۹ جنوری ۱۹۸۲ء، مخلصم و برادر دم جناب مولانا قاضی الہر صاحب دام مجدہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ کئی ہفتے ہوئے موصول ہوا تھا، میری طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہو گئی تھی، کھانسی کی شدت کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی تھی، جواب میں تاخیر ہو گئی، معذرت خواہ ہوں، قاضی حیات البنی مرحوم کے سانحہ رحلت کی اطلاع سے بہت صدمہ ہوا، افسوس آپ اپنے دست و بازو سے محروم ہو گئے، مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ کی علمی زندگی کے سکون کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسمی صلاحیتیں اپنی جگہ ہوتی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ باضابطہ مولوی نہ ہو کر بھی بہت سے رسمی علماء سے زیادہ معلومات رکھتے ہوں،

گرامی نامہ سے یہ معلوم ہو کر اور افسوس ہوا کہ مرحوم نہ صرف علمی معلومات رکھتے بلکہ بہت اچھے معاملہ فہم بھی تھے، مرحوم کی جو غیر معمولی صلاحیتیں آپ نے تحریر فرمائی، ان کا

قدرتی تقاضا یہی ہونا چاہیے تھا کہ اُن کی جدائی کا اعزہ و اقربا اور علاقہ کے تمام باشندوں پر غیر معمولی اثر ہو، میں نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے اور ایصالِ ثواب بھی، بلاشبہ یہ صدمہ آپ کے لیے جانکاه ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور آپ کو اور تمام متعلقین کو توفیقِ صبر سے نوازیں، آمین، آدمی چلا جاتا ہے مگر اس کی خصوصیتیں باقی رہ جاتی ہیں، جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہوتی ہیں۔ گرامی نامہ سے والد مرحوم کی جدائی کا صدمہ بھی تازہ ہونا ہی چاہیے تھا، لہٰذا آپ کی صحت و عافیت کے لیے بھی دعا کرتا ہوں، اب آپ جیسے قناعت پسند علماء کم ہی رہ گئے ہیں، میں نے آپ کی زندگی کے مختلف دور دیکھے ہیں اور ہر حالت میں آپ کو مطمئن پایا ہے، فی الحقیقت یہ بہت بڑی نعمت ہے، باقی ضروری باتیں ان شاء اللہ کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ والسلام۔

علیق الرحمن عثمانی، دفتر برہان، اردو بازار، دہلی ۷

مفتی بنام قاضی

(۱) مورخہ ۳ فروری ۱۹۵۹ء

محترم مولانا دادم مجددی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، "درجال السند والہند" مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہو جاتی ہے، مولانا سعید احمد کو مزید تاکید لکھ دوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلا کو پُر کر دیا ہے، بکھرے ہوئے موتی یکجا ہو گئے ہیں، اور سند و ہند کے ارباب علم و حکمت کا ایک خوبصورت ہار تیار ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں،

فقط والسلام،
عیتق الرحمن عثمانی

(۲) ۲۲ دسمبر ۱۹۶۰ء

محترم مولانا دادم مجددی السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محرم نامہ ملا۔ مضمون گرامی بھی پہنچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کر دی گئی ہے، بہر حال معذرت خواہ ہوں، انشاء اللہ جنوری کے "برہان" میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون "برہان" کے معیار پر پورا نہ

اترے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلسلہ کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں۔ ”برہان“ کے صفحات ۶۴ ہیں، اور مضامین کی کثرت ہے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی، برہان آفس، جامع مسجد دہلی۔

(۳۱) مورخہ مارچ ۱۹۶۴ء مخاصم و محترم جناب مولانا دام محمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہنچ گیا تھا، ”برہان“ میں جلد شائع ہوگا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمائیں، کتاب ”ندوة المصنفین“ سے ضرور شائع ہوگی، اس کو مکمل کر لیں، ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہوگی، اس کو صاف کر لیں، رائٹنگ کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھئے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں، پھر بھی خدمت کی جائے گی، میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورت حال ہے، غالباً اگر کو بھٹی آنا ہوگا، حج کمیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ یہ ہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام، عتیق الرحمن عثمانی،

(۳۲) ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ء مخاصم و محترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام محمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمات نامہ ملا۔ مجھے خیال تھا کہ اس دفعہ آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہو سکی، سچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہو سکا، کاموں کے ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بہی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں آنا جانا مشکل ہو گیا تھا، فسوس

۱۔ عہد و ہند عہد رسالت میں، ۲۔ کچھ نہیں۔

آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کر لیتا۔

کتاب کا آخری باب فوراً ارسال فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہو جائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کا تب کو دے دیا گیا ہے، دونوں مضمون محفوظ ہیں، ان شاء ”برہان“ ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آ رہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں۔ آپ کے مضمون گرا نقد رہتے ہیں، واپس کیے ہو سکتے ہیں، امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، خان صاحب گاڑی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا، کیونکہ چھوٹا لڑکا ساتھ تھا۔

(۵) یکم ستمبر ۱۹۶۴ء برادرم و مخلص مولانا قاضی اظہر صاحب دام مجدہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا تھا، لفافہ بھی پہنچ گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے، ان شاء اللہ کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم کوشش کروں گا، نہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، عالمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے ”ابن حزم“ والا مضمون جلد شائع ہوگا، صدارت کا انتخاب ہو چکا ہوگا، ابھی یہاں خبر نہیں پہنچی، کتاب کے سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی بھی ہوگی، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام، عتیق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی۔

لے جناب اے، اے خان صاحب، بمبئی۔

آخری مکتوب

حضرت مفتی صاحب مرحوم بہت دنوں سے چاہتے تھے کہ میں بمبئی جیسے ہنگامی اور خالص کاروباری شہر سے نکل کر ندوۃ المصنفین دہلی کے علمی ماحول میں آجاؤں، جب بھی بمبئی تشریف لے جاتے یا ملاقات ہوتی تو کسی نہ کسی انداز میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے، چونکہ حالات کے پیش نظر میں ان کی خواہش پوری کرنے سے معذور تھا جس کا علم حضرت مفتی صاحب مرحوم کو بھی تھا، اس لیے آخر تک ان کی یہ خواہش افسوس کہ پوری نہ ہو سکی، اور وہ دنیا سے چلے گئے۔

مسلم پرسنل لار بورڈ کے پہلے اجلاس کے موقع پر بمبئی میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور حضرت مفتی صاحب دونوں حضرات نے اس موضوع پر میری موجودگی میں طویل گفتگو کی، مگر بات کسی نتیجہ تک ختم نہیں ہوئی، مولانا محمد عثمان صاحب فار قلیط مرحوم بھی اکثر کہہ کرتے تھے کہ آپ کی جگہ بمبئی نہیں دہلی ہے، وہ اخبار الجعیت سے مجھے منسلک کرنا چاہتے تھے، مگر وہ بھی حالات کے پیش نظر خواہش اور افسوس ہی کرتے رہے۔ گزشتہ سال مارچ میں میرے پاکستان کے سفر کے موقع پر بھی حضرت مفتی صاحب نے اپنی اسی خواہش کا اظہار فرمایا تھا مگر افسوس کہ ان کی تمنا پوری نہ ہو سکی جس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا، ویسے تو کئی حضرات اس قسم کی خوش کن باتیں کیا کرتے ہیں اور آج بھی مجھے بظاہر دعوت دیتے ہیں مگر ان کی دعوت میں وہ جان نہیں ہوتی ہے، جو ان بزرگوں کی خواہش میں ہو کرتی تھی۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب کا یہ آخری خط ان کے خلوص، تعلق، علمی قدردانی اور خوردنوازی کی آخری سند ہے۔

ندوة المصنفین جامع مسجد دہلی۔

۱۴ فروری ۱۹۸۶ء۔

بھی و محترمی جناب مولانا قاضی الطہر صاحب دام مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمات نامہ ۳۰ جنوری سنہ ۱۴۰۷ھ کو مل گیا تھا۔ دو
روز کے بعد میاں حسان احمد اور کبیر احمد سلمہا برائے ملاقات آئے۔ اور گرامی نامہ بھی
لائے، اس وقت اُن سے سرسری بات ہوئی کہ اگلے دن جمعہ کے بعد آئیں گے، مگر
نہیں آئے، غالباً موقع نہیں ملا، خیال تھا کہ ان دونوں کو ایک وقت چائے ناشتہ
پر مدعو کروں، ہمارا آپ کا تعلق رسمی نہیں حقیقی روحانی تعلق ہے، ابھنوں میں گرفتار
رہتا ہوں اور صحت بھی ٹھیک نہیں ہے، ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۵ء سے عرق النساء کے عارضہ
میں مبتلا ہوا تھا، یہ تکلیف کئی مہینے تک قائم رہی۔ بہت دنوں تک تو گھر سے دفتر تک
آنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ بجلی کی سکانی کا بہانہ ہوا اور اس طرح کی معذوری جاتی رہی۔

مولوی محمد ظفر احمد صاحب مرحوم قریب کی مسجد میں جہاں چڑھنا نہ پڑے اپنے ساتھ
رکشہ میں لے جایا کرتے تھے، افسوس وہ بھی ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، آپ نے صحیح
تحریر فرمایا ہے کہ تقریباً چالیس یا بیالیس سال سے ادارہ سے منسلک تھے، ان کی دیانت
وامانت مسلم تھی، متعلقہ کاموں سے بھی پورا اٹھتے تھے، میرے مزاج سے کبھی پوری طرح
واقف ہو گئے تھے، واقعہ یہی ہے کہ ان کا بدلہ مشکل ہی سے ملے گا۔ میری صحت اور
حالات بھی اب ایسے نہیں ہیں کہ ادارہ کے جزوی اور روزمرہ کے کاموں کو دیکھ سکوں،
”خلافت عباسیہ اور ہندوستان“ کی کتابت بھی معلوم ہوا ہے کہ آخری مرحلہ میں ہے،

۱۵ حسان احمد بن قاضی الطہر، کبیر احمد بن قاضی حیات الہی مرحوم برادر قاضی الطہر۔

۱۶ مولوی حکیم محمد ظفر خاں شاہجہاں پوری مرحوم دفتر ندوة المصنفین کے انچارج اور حضرت مفتی صاحب
مرحوم کے معتمد خاص۔

چاہتا تھا کہ صحیح صورت حال معلوم ہو جائے تو آپ کو اطلاع دوں، کتاب کی کتابت منشی وجیہ اللہ صاحب رامپوری کر رہے ہیں، ان کے لڑکے سے معلوم ہوا تھا کہ عربی کے کچھ ٹکڑوں کی کتابت باقی ہے، دارالعلوم جشن صد سالہ تک سفر کے لائق ہوا تو ضرور ملاقات ہوگی۔

اپنی بے توانی پر افسوس ورنہ میری دلی خواہش یہی ہے کہ آپ جیسا صاحب کمال جس کو اب فرصت بھی ہے اور فارغ البال بھی ہے دہلی میں قیام کر کے ادارے کی خدمات انجام دے،

واللہ یحدث بعد ذلک امرًا۔

میاں عید الرحمن کی طرف سے سلام مسنون، میاں حسان احمد اور کبیر احمد کو دعائیں، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ عتیق الرحمن عثمانی۔

مکتوب نمبر: ۲۲ دسمبر ۱۹۶۶ء

محترم مولانا دادم مجددہ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، - محکمت نامہ ملا مضمون گرامی بھی پہنچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کر دی گئی ہے، بہر حال معذرت خواہ ہوں۔ ان شاء اللہ جنوری کے ”برہان“ میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون ”برہان“ کے معیار پر پورا نہ اترے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلمہ کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں، ”برہان“ کے صرف ۶ صفحات ہیں اور مضامین کی کثرت ہے، امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی، برہان آفس جامع مسجد دہلی۔

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

ڈاکٹر محمد یوسف خاں، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآن پاک کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ وہ نازل من اللہ ہے یعنی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جس کی تقدس و پاکیزگی کی وجہ سے قسم کھائی جاتی ہے اور جس کے بارے میں وہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس کے ہر حکم و ہدایت کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے ورنہ وہ مومن یا مسلم کہلانے کا حقدار نہیں مصدقہ و فقہ کے بعض پہلوؤں کے صحت و عدم صحت پر ہم بحث کر سکتے ہیں لیکن دنیا کے اسلام کا ہر شخص اور ہر فرقہ جس چیز کے ہر حرف اور نقطے پر ایمان رکھتا ہے وہ کوئی اور کتاب نہیں صرف قرآن ہی ہے۔

اسلام کے سخت ترین مخالف بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو قرآن آج ہمارے سامنے موجود ہے وہ بالکل حرف بہ حرف ویسا ہی ہے جیسا آج سے چودہ سو سال قبل تھا، اس میں ایک شوشہ و نقطہ کی کمی و بیشی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ انسان کوشش کا نتیجہ ہوتا تو آج اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہوتیں مگر پھر بھی انسانی ذہن قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت کیوں مانگتا ہے؟

ہیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ کچھ لوگ اسلام سے کون وجوہات کی بنا پر بے بہرہ ہیں جو اس طرح کے سوال کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ لوگوں کا دین اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت کے کئی اسباب ہیں جن میں سب سے بڑا اور خراب موجودہ دور میں مسلمانوں کی خستہ حالت ہے۔ مسلم حکومتیں اور قومیں بگڑ کر گمراہ ہو گئیں۔ دین کی حقیقت کے ساتھ ساتھ دنیاوی مصلحتوں بھی بھل عام ہو گیا، یہاں تک کہ مسلمان خود اپنے دشمنوں کے لئے ایک زبردست حجت و دلیل بن گئے جو ان کی حالت کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ اسلام کی نہ دنیا ہی بھلی نہ دین ہی بھلا، اور اس ایک بات پر دشمنان اسلام نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے اور بہت سے مسلم نوجوانوں کو جتلا دیا ہے کہ انہی لوگوں کے ہاتھوں ہی اسلامی چیز کو خواہ عقیدہ ہو یا اخلاق، قانون ہو یا معاشرہ تباہ کر کے کام ہوا ہے اور ہوتا ہے۔

رشید رضا نے ایک معتبر راوی سے سید جمال الدین افغانی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر ہم یورپ کو اپنے دین کی طرف دعوت دینا چاہیں تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ یورپ کو یقین دلادیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، یورپ والے قرآن کے اندر سے ہمیں یوں دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی ہتھیلیاں منہ کے سامنے لیں اور انگلیوں کے ٹکافوں سے دیکھ کر فرمایا۔۔۔۔۔ وہ اس طرح قرآن کے اندر سے ہمیں دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں جہل، نا اتفاقی، کاپی پھینی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ اگر واقعی یہ کتاب اصلاح کی ہوتی تو اس کے ماننے والے اس قدر اثر و پرانندہ ہرگز نہ ہوتے۔۔۔۔۔

سید موصوف کے (۲) قول سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنا مذہب ہی چھوڑ دیا
یہ ایک طنز ہے بدانتہوں نے مسلمانوں کے اس قول سے قرآنی تعلیم چھوڑ کر اس حال پر
کیا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو سید صاحب موصوف کے اس قول سے سبق حاصل کر کے
نہ وہ کو سدھارنا چاہئے کہ ہمیں تبلیغ کی بھی ضرورت نہ پڑے بلکہ لوگ خود بخود
ہمارے طرف آئیں۔

قرآن فصاحت و بلاغت کا ایک بڑا سرچشمہ ہے۔ مومنوں اور نہ فردوں پر
جس کی تاثیر حد اعجاز تک پہنچ گئی۔ قرآن نے اپنی معجزانہ بلاغت سے
عرب میں ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دیا تھا حالانکہ اہل عرب خود اپنی زبان
کی فصاحت و بلاغت پر اس قدر ناناں تھے کہ تمام غیر عرب کو بھی سمجھتے تھے۔
علامہ اسلام نے قرآن کے تمام معجزوں میں اسی معجزے کو لے کر تمام بنی نوع
انسان کو چیلنج کیا تھا اور چونکہ عرب و غیر عرب مبلغ قرآن کے سامنے بے بس ہو گئے
تو علامہ نے اس کو حضور کی سب سے بڑی حجت و دلیل قرار دیا لیکن اب جبکہ اس کو
کئی صدیاں بیت گئیں تو چند متفرق افراد کے سوا کوئی بھی اس حجت یا دلیل کو ماننے
کے لئے تیار نہیں ہے اور قرآن کے بارے میں طرح طرح کے سوال کر لئے ہوئے
جس میں سب سے اہم یہی مباحثہ ہے کہ کیا ثبوت ہے کہ قرآن منزل من اللہ
ہے۔

علامہ فرنگی کے فہم قرآنی کا دار و مدار قرآن کے ترجموں پر ہے۔ کہہ دیجئے
اگر انھیں عربی زبان پر کافی عبور حاصل ہے مگر پھر بھی ان کا وہ ادراک فہم
اہل زبان ہونے کی وجہ سے عربوں کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا اور کوئی
بھی مترجم ان معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہے جو قرآن پاک کی اعلیٰ عبارت
اور اس کے اسلوب سے خود ظاہر ہوتا ہے۔ ہر مترجم دو کوتاہیوں کا شکار

پنڈت دیانند کے متعلق گاندھی جی نے تحریر کیا ہے کہ :

”انھوں نے نہ چین دھرم، اسلام در مسیحیت اور خود نند دھرم

کے متعلق بہت سی غلط بیانیوں کی ہیں۔“^۱

پنڈت ستیہ کیشو پرشاد پرزیدیسر تاریخ گروکل کانگریسی لکھتے ہیں :

بے شک دیگر مذاہب کی تردید کرنے میں سوامی جی نے

نا انصافی کی ہے اور صحیح ترجمہ و مفہوم کو بگاڑ دیا ہے۔“^۲

ایک دوسرے ہندو فاضل لکھتے ہیں :

”بانیان مذاہب میں سے سب سے زیادہ نا انصافی ظلم اگر

کسی پر کیا گیا ہے تو بانی اسلام پر اور کوشش کی گئی ہے

کہ پیغمبر اسلام کو ایک خونخوار اور بے رحم انسان دکھلایا جائے

اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلانی جائے

اس کا بڑا سبب یہ ہوگا کہ محمد کی لائے پر تنقید کرنے والوں

نے اسلامی تاریخ اور بانی اسلام کی سیرت کا صحیح طور پر مطالعہ

کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد

باتوں کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی پوچھا کر دی۔ اگر

وہ اسلامی روایات کو سمجھ لیتے اور سچائی کے اظہار کے لئے

اپنے اندر کوئی ہمت و جرأت پاتے تو یقیناً وہ اپنی رائے

تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے۔“^۳

۱۔ غازیان ہند ص ۱۵۱۔

۲۔ رسالہ بھارت متر ۱۹۲۶ء۔

۳۔ رسالہ مولوی۔ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ، رسولی نمبر ص ۱۴۱۔

کے مشقین اصولوں کی روشنی میں دنیا کی چیزوں سے کام لینا اور پھر ان کے نتائج کو
۲ کے منتقل کرنا اسی قوت کا مرہون منت ہے۔ یہ علم الاشیاء ہم کو قرآن کے
ذریعہ ہی ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَٰ ۙ بَيِّنٰتٍ ۚ

سورج و چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔
قرآن پاک نے چاند اور سورج کے بارے میں ہمیں علم عطا کیا اور خدا کی
عطا کردہ یہ انسانی قوت نگر و تمیز ہے جس کے سہارے انسانی ذہن نے
ایک عرصہ دراز تک اس (علم) پر غور و خوض کیا اور اس غور و فکر کا نتیجہ ہمارے
سامنے ہے کہ آج انسان نے چاند پر قدم جمائے ہیں۔ سائنس کچھ اور نہیں انسانی
عقل و غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ ایک غیر ملکی محقق لکھتا ہے :

”سائنس کو اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے اس لئے اب اس
میں فروتنی اور انکسار بھی آ گیا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا
جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ
ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف) اب تو دنیا نے
سائنس کے مشاہیر اس امر پر مہر ہیں اور بڑی شدت سے مہر
کہ جہاں تک ادراک حقیقت کا تعلق ہے سائنس صرف جبری سا
علم بہم پہنچا سکتی ہے۔“ ۱

اسی بات کو قرآن پاک نے پہلے ہی فرما دیا ہے :

بل کذبوا بہ الذم یحیطوا بعلمہ و لما یا تمحروا ویانہ
کذ الک کذب الذین من قبلہم فانظر کیف

کان عاقبۃ الظالمین ۱

لیکن پھر بھی کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتے
ہیں اور اس کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ یہ سب پہلی
نظر میں تو عین عقل کے مطابق معلوم ہوتا ہے حالانکہ ان کا انحصار صرف جذبات پر
ہوتا ہے۔ دنیا میں آجکل جتنا فتنہ و فساد برپا ہے محض اس لئے کہ ہر شخص اور ہر قوم
اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ ہر ایک کی یہ کوشش
ہوتی ہے کہ دوسرے کو بے وقوف بنا کر اپنا التوسیدہ ہا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے
کہ جس شخص کے سامنے تسکین جذبات ہی مقصد حیات ہوتا ہے وہ علم و عقل کا مالک
ہونے کے باوجود قلاح و سعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے۔ اس کا علم
اور اس کی عقل اس کی صحیح رہنمائی کرنے کے بجائے اس کی تکمیل خواہشات کے
ذرائع پہونچاتا ہے اسی لئے قرآن کریم نے عقل و علم کی اہمیت پر زور دینے کے
ساتھ ہی اس کی حقیقت کو بھی عیاں کیا ہے کہ جب عقل جذبات کے تابع ہو تو
انسان سعادت کی راہ سے محروم ہو جاتا ہے :

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْهَوَا وَاحْنًا اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ
عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَفَّيْهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ
مَنْ بَعْدَ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۲

اس طرح ان لوگوں کا علم جو تکمیل خواہشات کو ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، جذبات کی چہار دیواری میں ہی سمٹ کر رہ جاتا ہے اور وہ بات کی حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے ان کی عقل انہیں حصول مقصد میں غلط راستہ پر بھٹکا دیتی ہے۔ مگر اپنی عقلمندی کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ وہ ٹھیک راہ پر گامزن ہے اگرچہ قرآن پاک نے خود عقل انسانی کے ساتھ ساتھ ادراک و فہم کو بھی مخاطب کیا ہے۔

سائنس عقل ہی کا دوسرا نام ہے مگر اس سائنس سے ادراک و فہم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علم و عقل کا سہارا لے کر سائنس دانوں نے ایک چیز بنائی مگر اس کے اثرات و نتائج نہایت ہی سائنس ایجادات کو دیکھ کر ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ علم و عقل آج کل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے مگر جب ان کے نتائج پر ہم غور کرتے ہیں تو کہتا پڑتا ہے کہ انسان نے زندگی کی آخری حدود کو بھی چھو لیا ہے۔ ایک ساعت میں نہ کہوں انسان خاک و خون کے جہنم میں دھکیلے جاسکتے ہیں۔ پوری بستی و پورا ملک اس طرح ویران و برباد کئے جاسکتے ہیں۔ کاڈا لسم۔ لیکن شیشا من کوٹھا۔ ہر ملک و قوم میں سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے تمام علم و عقل کے سرمایہ کے ساتھ اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہاتھ لگ جائے جس سے دوسرے ملک کے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جاسکے۔ مغربی ممالک اپنے نظام تمدن سے جس کی بنیاد عقل پر تھی تنگ آکر اب ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جس سے لوگوں کو روحانی تسکین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ان ممالک میں ہر طرف سے اپنے کلچر اور اپنی سیاست کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے اور جگہ جگہ سدھار کمیٹیاں بن رہی ہیں۔ وقت کی تیز آمدھی نے انہیں لوگوں کے سامنے جو ہر چیز کو عقل کے ترازو پر پرکھنے

ہیں۔ اس تا فراموش حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ تنہا نفس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی
اسی لئے صرف عقل کی بنیاد پر قائم کیا ہوا نظام کبھی بھی انسانی فطرت سے ہم آہنگ
نہیں ہو سکتا اور انسان اس کے خلاف کبھی نہ کبھی ضرور بغاوت کرے گا۔ عقل
کی بنیاد پر قائم کردہ نظام حیات میں انسان مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے
میں پروفیسر جوڈ کا بیان ہے :

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم
کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی روحانی مادی کو کیسے برائے
نظام معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سے کچھ زیادہ اس کی امید نہیں
نظر آتی اور آتا بھی کچھ ایسے ہیں کہ نا امید ہو کر کھٹا پڑتا ہے
کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئے اخلاقی قدروں کو
پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔“

مغربی فلاسفر لیپکال لکھتا ہے :

”خدا قدرت کے کارخانے میں محال ہے، درمختص مادی دنیا میں
نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی دنیا میں بھی خلاتا ممکن ہے انسان جب
خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور
اچھے نصب العین سے دستکش ہو جائے تو اسے برے راستے
خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دنیا سے نکلتا ہے تو
اس کی طرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی
کی جگہ یقینی اور ایمان سے لے، بے راہ روی ختم ہو جائے

اور یحییٰ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں
سے نبوت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی
ہو اور نہ اخلاقی ضابطوں کی کشش وہ زندگی موت سے
بدتر ہے۔^۱

صرف یہی دلائل نہیں بلکہ اب مغرب کے تمام مفکرین کشاں کشاں اس مقام کی
طرف بڑھے آرہے ہیں جن کی طرف قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی رہنمائی کی تھی۔
اس طرح یہ ثابت ہے کہ قرآن پاک کی تمام باتیں حرف بحرف صحیح و درست ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے قبول نہیں
کرتے مگر وہ دن دور نہیں جب ایسی ہی ذہنیت کے لوگ بھی اس حقیقت کو
جھٹلانے میں عاجز سمجھیں گے۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو علم انسانی کو بلندی کی انتہا تک
پہنچاتا ہے جس کے بارے میں اللہ پاک نے خود اپنے کلام پاک میں
فرمایا ہے :

قَالَ مَبْنٰ اِلٰهِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا ثُمَّ
هَدٰى^۲

پروفیسر سی۔ ایل۔ مارگن نے بھی اپنے مقالہ بعنوان ”ارتقاء نفس“ میں
خدا تعالیٰ کی قوت تخلیق و تہدیب کا تذکرہ کیا ہے۔^۳
اللہ پاک دوسری جگہ فرماتا ہے :

۱۔ معارف القرآن از غلام احمد پرویز (جلد دوم) ۲۰۸ - ۲۰۹
۲۔ سورۃ طہ آیت ۵۰

الذی خلق نسوتی ، والذی قدما فہدی ۱

ایک دوسری آیت کریمہ ہے :

الذی خلقنی فهو یدین ۲

اس طرح ماہر گن کے الفاظ صحیح طور پر قرآن کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن علم انسانی کو کتنی باندیوں پر لے جاتا ہے۔ اگر زمانہ قدیم میں مذہبی محققین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان کی راہیں زیادہ آسان ہوتیں، انھیں ہزاروں سال غلط راستے پر نہ بھٹکنا پڑتا بلکہ ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھتا۔ بہر حال اس طرح دھیرے دھیرے یہ لوگ اپنے آپ قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت پاجامیں گے مگر اس کے لئے انھیں صدیوں اندھیرے میں بھٹکنا پڑے گا جیسے کہ ان کی عادت ہے کہ ایک طویل گمراہی کے بعد جو لوگ راہ راست پر آتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے سائنس میں اگر آج کوئی نیا قدم اٹھتا ہے تو کل کی عزیز تحقیقات اسے غلط ثابت کر کے اس کی تردید کرتی ہے لیکن نبوت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ہر نبی کا تجربہ ادا اس کا نتیجہ اساساً و اصولاً ایک ہوتا ہے ان میں کہیں کوئی اختلاف نہیں ہوتا حتیٰ کہ زمان و مکان کی دوری بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتی ہے اس لئے کہ قرآن خود شہادت دیتا ہے :

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من

بعده و اوحینا الی ابراہیم واسماعیل واسحق

و یعقوب والاسباط و عیسیٰ والیوب و یونس و ہارون

۱۔ سورہ الاعلیٰ آیت ۲-۳۔

۲۔ سورہ الشعراء آیت ۷۸۔

وسیلین و اتینا داؤد نہ ہوگا۔

سہی وجہ سے کہ تمام انبیاء کرام ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے آئے ہیں ہر نئی اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کراتے آئے ہیں کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گذرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے۔ وحی ایک نبی کا بے نظیر تجربہ ہے۔ یہ وحی ہی ہے جس کے ذریعہ نبی ایک حد تک غیب کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور یہ حقیقت اس پر آشکارا ہوجاتی ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ اس علم اور ادراک کی حقیقت کو پہونچکر وہ پھر انسان کی طرف لوٹ آتا ہے اور تبلیغ و نصیحت کے دفتر کھول دیتا ہے مگر جب انسان اسے نہیں سمجھ پاتا تو اس سے منکر ہو جاتا ہے۔ مضراب کی چھڑ سے تاروں سے بچنے والے ارتعاش سے جو الہانہ کیفیات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اسے نہ تو ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو سمجھا سکتے ہیں مگر ہم اس کے وجود سے کبھی بھی انکار نہیں کرتے۔ Huxley لکھتا ہے کہ :

”لیکن اگر تم کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے تو اس کا

مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔“

یہ بالکل غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ وحی علم و عقل کی حریف نہیں جیسا کہ چند اعتراض کرنے والوں نے کہا ہے کہ قرآن سائنس سے بالکل خلاف ہے لیکن اہل مذہب کو ان اعتراضات

۱. سورۃ النساء آیت ۱۶۲۔

Religion without Revelation Juxon Huxley
P. 6

سے گھبراتا نہیں چاہئے کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سائنس ادراک حقیقت کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے جبکہ وحی کامل و مکمل اور مذہب کسی ایک شعبہ زندگی کا نام نہیں ہے۔ تو خالی خیال ہے نہ ہی خالی احساس و غور بلکہ تمام عالم انسانیت کا ترجمان ہے۔ عقل کا ایک محدود دائرہ تحقیق ہے جس کو اسے وحی سہارا ہی لینا پڑے گا جس سے اہل مغرب اور کچھ اہل مشرق بھی ابھی تک دامن چرائے ہوئے ہیں کیونکہ یہ لوگ مذہب کو علم و بصیرت کا دشمن تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ ذرا گہری نظروں سے قرآنی آیات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی مذہب کے متعلق ایسی غلط رائے نہ رکھتے۔ قرآن پاک کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآن کا مخاطب ہی عقل و دانش سے ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل و فہم سے کام نہیں لیتے۔

صم بکم عی فہم لا یعقلون ۱

دوسری جگہ فرماتا ہے :

ان شرالدوات عند الصم الیکم الذی
لا یعقلون ۲

اس طرح کی آیات ہم قرآن میں جا بجا پاتے ہیں لیکن اہل مغرب کے ایک غلط تصور (قرآن علم و بصیرت کا حریف ہے) کی وجہ سے قرآن جیسی سراپا علم و بصیرت کی کتاب کو علم و عقل کے خلاف سمجھ لیا گیا ہے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور

۱۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۷۱۔

۲۔ الانفال آیت ۷۲۔

قرآن جیسی پاک و مقدس کتاب پر بہتان ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن مانتی تحقیقات کی کتاب نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد تکمیل شرف انسانیت ہے جس کی ایک ایک بات عقل و بصیرت پر مبنی ہے۔ قرآن سرتاپا علم و حقیقت ہے اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل و برہان مانگتا ہے۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُونَ
اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُونَ۔^۱

مگر یہ دلیل ایسی ہو جو ظنی اور قیاسی نہ ہو کر حق و یقین پر مبنی ہو کیونکہ اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اِظْمَنُ
لَا يَفْنَىٰ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝^۲

اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ با یقین و علم کے کسی چیز کی پیروی نہ کرو۔

وَلَا تَنْفَعُ مَا نَسِ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ
كُلٌّ اِلٰهُنَّ كَانَ عَنْهُمْ مَسْئُولًا ۝^۳

قرآنی آیات کی کہان تک مثالی دی جا خود قرآن پاک کے الفاظ سے ثابت ہے کہ قرآن نے علم و بصیرت پر کتنا زور دیا ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے

۱۔ الانعام آیت ۱۲۸۔

۲۔ النجم آیت ۲۸۔

۳۔ بنی اسرائیل آیت ۳۶۔

بلکہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ثبوت ہیں کہ قرآن آسمانی کتاب ہے؟ قرآن نے تو اس زمانے میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت کے لئے مایہ ناز سمجھا کرتی تھی جس کا اعتراف دنیا بھر کے دانشوروں نے کیا مگر عقل کا ایک دائرہ ہے جہاں وہ رک جائے تو اسی کو منزل آخر قرار دیتی ہے، اسی لئے قرآن نے عقل کے ساتھ ادراک و فہم اور تمیز کو بھی ہمارے سامنے زندگی کے اصول کی طرح رکھا ہے۔

(باقی)

اسلام کا نظام حکومت

مؤلف: مولانا حامد الانصاری غازی

اس کتاب میں اسلام کو ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ یہ عظیم شان تالیف اسلام کا نظام حکومت ہی پیش نہیں کرتی بلکہ نظریہ ریاست و سلطنت بھی منظر عام پر لاتی ہے۔ ہر تحریر زمانہ حال کے عین مطابق ہے۔

ہمارے لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جو قانون قرآن، نبوت، دستور صواب کے علاوہ اسلام کے علماء اجتماعیات کی بے شمار کتابوں اور عصر حاضر کے نوشتوں اور سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد سامنے آئی ہے۔ صفحات ۳۶۴، بڑی تقطیع

قیمت تیس روپے ۳/-

مجلد اعلیٰ کوالٹی چالیس روپے ۴۰/-

ندوة المصنفین، اردو بان ارجامہ مسجد دہلی

عہد عباسی کے نامور مترجم حنین بن اسحق العبادی

کے

دستیاب طبی مخطوطات

از جناب حکیم سید محمد حسان نگرانی ، ذاکر نگر ، نئی دہلی

ابوزید حنین بن اسحق العبادی عرب قبیلہ بنو عباد کا فرزند تھا ۱۶۴ھ ۶۴۰ء
 میں مملکت عراق کے مقام حیرہ میں پیدا ہوا۔ ستر سال تک طبیب، مترجم اور
 مؤلف کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ طبی کتابوں کے ترجمہ میں اس قدر
 بلند مقام حاصل تھا کہ عباسی حکمرانوں کے قائم کردہ دارالترجمہ بیت الحکمت کا
 افسر اعلیٰ مقرر ہوا اور ترجمہ کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دے کر عربی ترجمین
 قرار دیا گیا۔ اخیر عمر تک تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا بالآخر
 ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء میں اس عظیم طبیب، مترجم اور مؤلف نے جان جان دیا
 کے سپرد کر دی۔

اگرچہ حنین، مترجم، مصنف اور مؤلف تینوں حیثیتوں سے ایک نمایاں مقام
 کا مالک تھا لیکن مترجم کی حیثیت سے اسے زبردست شہرت اور فوقیت حاصل

ہے۔ حنین کو بحیثیت مترجم جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فارسی، عربی، یونانی اور سریانی زبانوں میں تہذیب و مہارت رکھتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی اس کی معلومات بہت گہری تھیں۔ عام طور سے اس سے قبل کے ترجمہ نگار باضابطہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی ترجمہ نگار کا لسانیاتی پہلو مستحکم ہوتا تو وہ فن کے طبی نکات سے بھرپور واقفیت نہ رکھتا اور اگر کوئی فنی نقطہ سے کم ہوتا تو اس کے اظہار و ابلاغ کا لسانی پہلو پوچھ جاتا، اس کے برخلاف حنین بن اسحاق نے لسانی اور فنی دونوں تعلیم پائی تھی، جن کو وہ اپنے ترجمہ میں برت کر شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف افلاطون، ارسطو اور ایٹولیس کی کتابوں کے ترجمے کئے بلکہ طبی سائنس کے تین اہم ترین مصنف بقراط، جالینوس اور دسقیویدوس کی اکثر کتابوں کے تراجم کئے جو براہ راست طب یونانی اور طب عربی دونوں کے لئے بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اگر حنین نے ان تراجم کے ذریعہ علوم کا احیاء کیا ہوتا تو مشرق میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اتنی تنہا اور میر حاصل طریقہ پر حصہ لیتا۔ حنین کے ساتھ ایک پورا گروہ ترجمہ کے کام میں مصروف تھا۔ المتوکل نے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر ترجمہ کے کام پر مامور کر کے اصطفیٰ بن بسیل، موسیٰ بن خالد اور یحییٰ بن ہارون جیسے مشہور علماء کو اس کے ساتھ کر دیا تھا، یہ علماء جب کام کر کے لاتے تو حنین ناقدانہ نظر سے تمام تفصیل کو دیکھتا تھا۔

حنین ترجمہ اور تالیف دونوں ملا کر ۱۳۵ اہم کتابوں کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ جن میں ۶۰ ترجمے، جن میں جالینوس کی ۳۹، بقراط کی ۸، ارسطو کی ۷، افلاطون کی ۲، فلاس الا جانیلی کی ۲، اریبا سوس کی ۴ اور جو جیس اور دسقیویدوس کی ایک ایک کتاب شامل ہے۔

پیش نظر معنوں میں دنیا کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب حنین بن اسحق کے طبی مخطوطات کی تفصیل بھی درج کی جا رہی ہے جو تصنیفی اور تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں طبی مخطوطات

پیش نظر فہرست میں حنین بن اسحق کے ۵۰ سے زائد طبی مخطوطات کی تفصیل درج کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ صرف ۱۰ مخطوطات ہندوستان کی لائبریریوں میں دستیاب ہیں باقی دنیا کی مختلف لائبریریوں کی زینت ہیں ان میں سے بعض اتنے اہم ہیں جن کے مطالعہ سے بقرط اور جالینوس کی بنیادی طبی کا ایک بار پھر سائنٹفک جائزہ لینے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ بعض مخطوطات امراض چشم اور اخلاط کے موضوع پر ملتے ہیں جو بہر حال اخلاط کے متنازعہ بحث پر بڑی حد تک معاون ہو سکتے ہیں اور امراض چشم پر آج کی طبی دنیا اہم معلومات کا اضافہ کر سکتی ہے

۱۔ کتاب مسائل حنین : امراض چشم پر اہم ترین تصنیف ہے اس کا مخطوطہ برلین، قونیہ، میونخ، لیڈن کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

۲۔ کتاب ترتیب العین : اس کا مخطوطہ فریڈرکس، برٹش میوزیم، لیڈن اور دارالکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۳۔ کتاب العین : اس کا مخطوطہ تیموریہ، لینڈنگراڈ اور دارالکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۴۔ کلام جمعہ حنین بن اسحق لاسطوطا لیس : مخطوطہ دارالکتب مصریہ اور حلب کی خطاط لائبریری کی زینت ہے۔

۵۔ کتاب الاغذیہ : اس کا مخطوطہ خدا بخش پٹنہ میں دستیاب ہے۔

- ۶۔ رسالۃ فی تدبیر الصحۃ : اس کا مخطوط طہران کے سنار اور حلب کے مکتبہ حکیم کی زینت ہے۔
- ۷۔ کتاب الفوائد فی تنويع الفوائد : اس کا مخطوط آصفیہ حیدرآباد اور فدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔^۹
- ۸۔ معانی استخراج احنین من کتب البقراط وجالینوس : البقراط مخطوط طہران کے مکتبہ ملی میں دستیاب ہے۔
- ۹۔ کتاب الکرمۃ : اس کے مخطوطات اباصوفیہ، احمد ثالث، تیموریہ اور دارالکتب مصریہ کے ذخیرے میں شامل ہیں۔
- ۱۰۔ اختصار کتاب جالینوس فی الادویۃ المفردۃ : احمد ثالث، مصری استانبول اور نور عثمانیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔
- ۱۱۔ کتاب اختلاف الاعضاء لجالینوس : مخطوط استانبول میں دستیاب ہے۔
- ۱۲۔ کتاب ترکیب الادویۃ لجالینوس : اس کا مخطوط پیرس، احمد ثالث اور اسکوریاں کے کتب خانوں کی زینت ہے۔
- ۱۳۔ اساس الطب : مخطوطات رضارام پور، نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ اور آصفیہ حیدرآباد میں دستیاب ہیں۔
- ۱۴۔ کتاب الاخلاط لالبقراط : بیروت کے قدیس یوسف کے ذخیرہ میں شامل ہے۔
- ۱۵۔ تفسیر جالینوس کتاب الفصول البقراط فائیکان : رضارام پور، شتائیشاپور کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔
- ۱۶۔ کتاب الغبن المتعلمین : جاریت اور مجلس طہران کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۷۔ جوامع مقالات: جالینوس فی التدبیر الملقف : اباصوفیا میں محفوظ ہے۔

۱۸۔ کتاب الاعضاء الآئمة لجالینوس : اس کا مخطوطہ دارالکتب مصر، تیموریہ، اسکوریال میونخ اور اڈنبرہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۹۔ کتاب فی علامات البحران لجالینوس : استانبول کے جلالیہ کتب خانہ کی زینت ہے۔

۲۰۔ کتاب شفاء الامراض جلالیہ رضا رام پور، اباصوفیا اور مجلس طہران میں اس کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

۲۱۔ کتاب ترکیب الادویۃ بحسب الموانع الالہیہ : اس کا مخطوطہ استانبول اور احمد ثالث کی ماہریری میں دستیاب ہے۔

۲۲۔ شارح تفسیر جالینوس لکتاب البقراط فی تدبیر الامراض الحارثیہ اباصوفیا میں موجود ہے۔

۲۳۔ شمار کتاب البقراط فی الموانع الدینی الثانیۃ اشہر : میونخ، پیرس اور اسکوریال کے ذخیرہ کی زینت ہے۔

۲۴۔ جوامع الاسکنان، انبیاء السنتہ عشر لکتاب جالینوس : مخطوطہ رضا رام پور اور اناضول کی منیا ماہریری میں دستیاب ہے۔

۲۵۔ مقالۃ فی الدغدغۃ : اباصوفیا اور مجلس طہران کی زینت ہے۔

۲۶۔ کتاب ثبت الکتاب النبی لحریدہ کرہا جالینوس فی فہرست کتب، اباصوفیا میں دستیاب ہے۔

۲۷۔ کتاب قوی الاعضاء یہ : نور عثمانیہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۲۸۔ کتاب فرق الطب لجالینوس : جاریت طہران میں دستیاب ہے۔

۲۰۔ جوامع جالینوس فی اسرار النساء : مکتبہ دانشگاه طهران کی
زینت ہے

۲۱۔ کتاب مقدمة المعرفة : اس کا مخطوطہ پیرس ، ابا صوفیا ، پلڈیہ
اسکندریہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۲۲۔ تفسیر کتاب الایمان بمیا جالینوس : برلین ، دمشق ، آصفیہ کے
ذخیرہ میں شامل ہے۔

۲۳۔ ابدال الادویۃ المفردۃ : مخطوطہ ابا صوفیا میں محفوظ
ہے۔

۲۴۔ آلات الغذاء : اس کا مخطوطہ مکتبہ ملی اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں
شامل ہے۔

۲۵۔ تحفة الاطباء و ذخیرۃ الاطباء : رباط میں محفوظ ہے۔

۲۶۔ کتاب الحیات : حکیم حلب اور جارا اللہ میں دستیاب ہے

۲۷۔ کتاب فی تدبیر المستقین

۲۸۔ کتاب تدبیر السودا و بین

۲۹۔ مقالۃ فی الاجن

۳۰۔ مقالۃ فی الحمام

۳۱۔ مقالۃ فی تولد الحصاة

۳۲۔ مقالۃ فی دق النفاس

۳۳۔ مقالۃ فی قرص العود

۳۴۔ مقالۃ فی قرص البنفسج

۳۵۔ کتاب فی البقول

ان ساری کتابوں کے مخطوطات
حلب کے مکتبہ حکیم کی
زینت ہیں۔

۴۵۔ کتاب اصلاح الجبن : مکتبہ قاہرہ میں دستیاب ہے ۔
 ۴۶۔ معارف قوۃ الابدان : آصفیہ اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں
 شامل ہے ۔

۴۷۔ دفع مضار الابدان : آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے ۔
 ۴۸۔ کتاب التشریح الصغیر : حکیم سید ظل الرحمن علی گڑھ کے ذاتی
 کتب خانہ کی زینت ہے ۔

۴۹۔ کتاب المزاج : یہ بھی حکیم صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں شامل ہے ۔
 ۵۰۔ شرق الطب : طبیبہ کالج قروہ لبلہ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔

مصادر

- ۱۔ طبقات ابن جلیل ص ۶۸
- ۲۔ عیون الاختیار، ابن ابی اصیبعہ ص ۲۶۸
- ۳۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد اول ص ۴ کمال سامرائی
- ۴۔ ارسطین میڈسین، ای جی براؤن ص ۸۱
- ۵۔ بیت الحکمت کی طبی خدمات — وسیم احمد اعظمی
- ۶۔ ڈی کیمرج میٹری آف اسلام پی ایچ ویٹ ص ۷۸
- ۷۔ میٹری آف پرشیا، الگڈ ص ۱۰۴
- ۸۔ تاریخ الحکماء جمال الدین قفلی ص ۲۳۶
- ۹۔ ہندوستان کے کتاب خانوں میں غیر مطبوعہ طبی مخطوطات ص ۳۵
 خدائش اور نیل پبلک، لاہوری چٹنہ ۱۹۱۳ء

بغداد کی وجہ تسمیہ

از جناب مقصود احمد صاحب لکچرار شعبہ عربی یونیورسٹی بڑودہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی بات یوں ہی مشہور ہو جاتی ہے اور آگے چل کر وہ سند یا کم از کم ایک رائے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ بعینہ یہی صورت شہر بغداد کی وجہ تسمیہ سے متعلق پیش آئی۔ حمہ الشرق وینی نے اپنی کتاب ”تزیینہ القلوب“ جو ۱۳۳۹ھ کی تصنیف ہے میں نوشیرواں کو بغداد کا بانی قرار دیا اور اس کو اس کے باغ داد (باغ عدل) سے مشتق بتایا اور عام طور پر یہی مشہور ہو گیا۔ بعد کے مؤرخین نے اس خیال کی تائید کر کے اس کو مزید تقویت بخشی حتیٰ کہ علامہ شبلی حلیسے بلند پاریہ مؤرخ و محقق نے بھی اس کو تسلیم کر لیا چنانچہ ”الماملون“ میں وہ یوں رقمطراز ہیں :

”بغداد کی وجہ تسمیہ میں یہ روایت غالباً زیادہ اعتبار کے قابل ہے کہ اس کے قریب نوشیرواں کا ایک باغ تھا جہاں پیٹھ کو وہ مقدمات فیصل کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ باغ داد یعنی انصاف کا باغ مشہور ہو گیا۔“

(جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۷ء ص ۱۲۶)

ان کے علاوہ سید امیر علی متوفی ۱۹۲۸ء و دیگر مؤرخین بھی اس سے مشتق ہو گئے

A Short History of the Saracens, London, ۱۹۶۱ء، ص ۶۱۵

مگر نہ تو نوشیرواں اس کا، صل بانی ہے اور نہ ہی اس کے نام نہاد یاغ واد سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بغداد نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا۔ مرحوم پروفیسر عبدالستار صدیقی ۱۹۷۱ء — ۱۹۸۵ء، سلیق صدر شعبہ عربی و فارسی، المہ آبلدیو میوٹی کے مطابق فردوسی نے شاہنامہ میں اس کا ذکر کوئی چار جگہ نوشیرواں سے پہلے کے بادشاہوں کے حال میں کیا ہے یہی نہیں بلکہ پروفیسر صاحب یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ فردوسی نے خود نوشیرواں کے حال میں بغداد کا نام ایک جگہ بھی نہیں لیا ہے اور نہ ہی کہیں یہ کہا ہے کہ نوشیرواں کسی یاغ میں بیٹھ کر داری کیا کرتا تھا۔ فردوسی کے علاوہ مؤرخین میں سے بھی کسی نے نوشیرواں کے حال میں کہیں بغداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار صدیقی کے مطابق ”بغداد“ یاغ اور واد بمعنی یاغ عدل سے نہیں بلکہ یاغ بمعنی بت یا دیوتا اور واد بمعنی علیہ سے مشتق ہے اور سنسکرت کے الفاظ ”بھگوان“ اور ”بھگوت“ وغیرہ کا پہلا جز ”بھگ“ اور ”یاغ“ ایک ہی لفظ ہے۔ موصوف کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) ”بغداد“ یاغ اور واد (بت کا علیہ) سے مشتق ہے۔ عبدالعزیز واد، الامم ابن قتیبہ، ابو عید الشمر محمد بن احمد الخوارزمی، الجوالیقی، یاقوت الحموی کے علاوہ فارسی و الہ نے بھی یاغ کے معنی بت بتائے ہیں۔ یاغ کی صورت اوریتا میں یاغ اور بگ اور یعنی کیتوں میں یاغ ہے۔ ایران میں لفظ یاغ مذہبی مذہب سے پہلے رواج تھا اور اس زمانہ سے تعلق رکھتا تھا جب وہاں بت کی پرستش کی جاتی تھی۔

(۲) بغداد کا نام زردشت کے زمانے سے پہلے کا ہے یعنی نوشیروان سے
گیارہ بارہ سو برس پہلے کا ہے۔

(۳) فردوسی نے اس کا ذکر کچھ غصرو: فریدون اور دوشیر باکان کے حال میں
کیا ہے جو شیروان سے پہلے بادشاہ ہوئے ہیں۔

(۴) نوشیروان کے حال میں فردوسی نے اس کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ نوشیروان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) پہلوی اور سریانی ماخذوں میں بھی اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے کہ
نوشیروان اپنے کسی باغ میں ہفتے کے ایک دن بیٹھ کر مظلوموں کی داد رسی کیا کرتا تھا۔
اول تو یہی مشتبہ ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن ایک باغ میں بیٹھ کر داد رسی کیا کرتا
تھا اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو وہ ایسا اپنی دادرار حکومت مدائن (طیسفون) میں
کرتا ہوگا۔

(۶) یہ بات عقل سے دور اور بہت دور ہے کہ دارالسلطنت مدائن کے
آرام دہ محلوں کو چھوڑ کر وہ ہر ہفتے بغداد جاتا جو مدائن سے کوئی پچیس میل کی دوری
پر واقع تھا۔ خود بھی اتنی مشقت اٹھاتا اور عدل خواہ مظلوموں اور محسروں کو بھی مصیبت میں
ڈالتا۔ اس کے ڈر سے شاید بہت سے مظلوم نوشیروان کے عدل سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے ہوں۔

۱۔ دیکھئے مقالات صدیقی حصہ اول، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۳۔

۲۔ ایضاً صفحات ۱۲۵ — ۱۲۶۔

۳۔ ایضاً ص ۱۲۷۔

۴۔ ایضاً صفحات ۱۲۹ — ۱۳۰۔

۵۔ ایضاً صفحات ۱۳۰ — ۱۳۱۔

مندرجہ بالا دلائل و شواہد کی روشنی میں بغداد کو توشیروان کے نام نہاد باغ داد کے مقابلے میں یخ اور داد (بت یا دیوتا کا عطیہ) سے مشق مانتا زیادہ قریں قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ اس کا نام بغداد کیونکر پڑا تو اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا انتہائی مشکل ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ خطہ زمین یخ مافی دیوتا کے کسی پجاری کو کسی بادشاہ سے بطور عطیہ ملا ہو گا اور اس پجاری نے ازراہ امتنان و لشکر اس کا نام اپنے دیوتا کے نام پر بغداد رکھ دیا ہو گا اور بعد میں یہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

حوالہ کتب

- ۱۔ علامہ شبلی نعمانی، المامون، جلد دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء۔
- ۲۔ سید امیر گل، *A Short History of the Saracens*، مطبوعہ لندن، ۱۹۶۱ء۔
- ۳۔ عیدالستار صدیقی، مقالات صدیقی، حصہ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم، شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لکھنؤ

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس قائم کیا تھا جسے اکابر دیوبند کی سرپرستی حاصل تھی۔ آزادی کے بعد مولانا خیر محمد صاحب ملتان تشریف لے آئے اور یہاں انھوں نے از سر نو خیر المدارس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے کا شمار ملتان کے اچھے مدارس میں ہوتا ہے۔ موصوف وفات کے بعد اپنے مدرسے ہی میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے :

۷۸۶

مرقد مبارک

استاد العلماء مولانا خیر محمد جالندھری نور اللہ مرقدہ
بانی مدرسہ عربی خیر المدارس

خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ وفات

۳۰ شعبان ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء
برذر پنجشنبہ بوقت چاشت در مدرسہ خیر المدارس

مادہ تاریخ
تَسْقِلُ خَيْرٌ

آقا بیدار بخت کا شمار نامور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے علوم شرقیہ کی بڑی خدمت کی ہے اور ہزاروں انسانوں کو تربیت و تعلیم سے آراستہ کر کے ان کا مستقبل بنایا ہے۔ ان کا مزار گلبرگ کے قبرستان میں ریلوے لائن کے قریب ہے۔ آقا بیدار بخت کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
آقا بیدار بخت

ماہر تعلیم، شاعر و ادیب، دانشور
بانی دارالعلوم السنۃ الشرعیہ لاہور
تاریخ پیدائش: ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء
تاریخ وفات: ۳۰ اپریل ۱۹۸۱ء
میرے اللہ نے بھیجا مجھے پیغامِ قضا
نالہ شب کا فلک بوس اثر ہو کے رہا
شان و شوکت سے گریزاں تھا ہمیشہ بیدار
آخر کار وہ خود خاک بسر ہو کے رہا

آقا بیدار بخت کی قبر سے تھوڑے ہی فاصلے پر جانب شمال مغرب،
جانب جسٹس ایس اے رحمن کی آخری آرام گاہ سے جانب جنوب اندازاً ۳۰
میٹر کے فاصلے پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، گورنمنٹ کالج لاہور کے
پرنسپل اور مشہور انگریزی داں پروفیسر سراج الدین کی قبر ہے۔ ان کے لوح

مزار پر یہ مختصر سی عبارت کندہ ہے :

برد فیسز معراج الدین

ولد

میاں معراج الدین

پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء

وفات ۲۸ اگست ۱۹۸۶ء

مولانا سید حامد میاںؒ کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۸۶ء کو ہوا موصوف مشہور عالم دین اور مؤرخ سید محمد میاں صاحبؒ ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ کے فرزند اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ راشد تھے۔ ان کی قبر پر لکھا ہے کہ ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے :

آخری امام گاہ

شیخ طریقت شیخ الحدیث

حضرت اقدس

مولانا سید حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

میاں صاحب کے مزار منور سے سات میٹر جانب جنوب مشہور شاعر سلامت جالندھری کی قبر ہے۔ راقم نے انھیں دیکھا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

یا اللہ

یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شاعر ملت

۱۔ مخارج بنید سلامت علی شاہ سلامت جالندھری

مصنف تصویر انقلاب و درکس جیات

تاریخ وفات ۲۷ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

۲۔ مرزا جلال

دل کے نشیہ نو نذر احیاء بصیرت سے تیرا

رہنہ خاک میں پوشیدہ ہیں لاکھوں گوہر

سلامت جالندھری

میں گزشتہ کئی برسوں سے ثواب صحاح الدین احمد خاں سائل کے قرند قطب صاحب کی قبر کی تلاش میں تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج مرزا غلام مجدد کے ساتھ ان کی قرابت داری ہے۔ میں نے ایک بار مرزا صاحب سے ان کی قبر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ گلہا ہے اور ان کی قبر بھاتے رہتے ہیں لیکن محل وقوع کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ اتنے بڑے قبرستان میں ان کی قبر تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ دو تین روز ہوئے میں اپنے ایک استاد کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مجھے اچانک ہی تکبیر کہاں میں قطب صاحب کی قبر مل گئی۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

یا محمد

یا اللہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا علی رضی

مرقہ

مرزا غلام قطب الدین ابن سائل

تاریخ وفات ۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ
مطابق ۵ مارچ ۱۹۷۲ء

نواب سراج الدین احمد نقی سائل کا انتقال ۵ ستمبر ۱۹۷۲ء کو دہلی میں
ہوا اور وہ قطب صاحب کی درگاہ میں اپنی خاندانی ادوار میں دفن ہوئے۔
ان کی اہلیہ لاڈلی بیگم آزادی کے بعد لاہور چلی آئیں۔ قطب صاحب ان کے
فرزند تھے۔ دلخ دہلوی کی صلیبی اولاد میں ایک بیٹا احمد نامی تھا جو ان کی زندگی ہی میں
فوت ہو گیا تھا۔ احمد کی وفات کے بعد داغ نے اپنی سالی کی تو اسی لاڈلی بیگم کو جو
لے لیا تھا۔ ان کا عقد سائل سے ہوا۔ سائل کو داغ کی دامادی پر بڑا فخر تھا اور ان کے
متعدد اشعار میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ لاڈلی بیگم اپنے فرزند قطب صاحب کی قبر کے
سر لانے دفن ہیں۔ ان کے بلوچ حجازی یہ بھارت دروچ ہیں۔

۷۸۶

لاڈلی بیگم

دختر

نواب سراج خان داغ

زوجہ

میرا سراج الدین احمد نقی سائل دہلی

تاریخ وفات

۲۵ ستمبر ۱۹۷۲ء

بقیہ طبی مخطوطات

۱۰۔ فہرست مخطوطات طب الاسلامی فی مکتبات ترکیا

دکتر اکمل الدین احسان اوغلی ۱۹۸۴ء

۱۱۔ علی گڑھ کے ذخیروں میں محفوظ غیر مطبوعہ طبی مخطوطات

حکیم سید ظل الرحمن سندھ شعبہ علم الدویہ حکیم اجن خاں طیبہ کالج علی گڑھ

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

لمصنفین دینی کا علمی و دینی کام ہوتا
مدوۃ الابد

سُرگال

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مرتب
عمید الرحمن عثمانی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مِطْبُوعَانِدِ الْمَصْنِفِ

۱۹۳۹ء اسلام میں حرز کی کشفیت، و سلام کا قصہ دی نظم، قانون مشربیت کے خلاف کا مسئلہ۔

تعمیت سدر در سبکی توام به سوشلزم کی میاد حقیت

۹۳۰۔ عربوں اسلام - عرب ائمہ افواج : حضرت محمدؐ کی حیاتِ معصومہ میں یہ واقعہ رونما ہوا کہ

۹۳۱۔ فیض شریف جلد اول۔ دی سی۔ حدیث میں مذکور سیاسی معومات کا خلاصہ۔

۹۳۲ فصل عربی جلد دوم - مدد کا فنہ و فہم (طبع امرتسری غلطی سے سردی، صافیت)

مسئله ویرایش و تدوین - تاریخ نگارش و چاپ - خلاصه و نتیجه گیری.

۵۴۳ عین بدست خزان چاه فرستاد و بعد از آن اسرار کاظم و کتب - سیزده تایی است بمطالع و حرمی میرزا

۹۳۴ فصل در بیان معجزات حضرت علی علیه السلام و کائنات و تفسیر و تفسیر و کمال

۱۴۳۵ھ: قصص القرآن اربعہ جلد - قرب و رشتہ - سلام کا قصہ دی حد مرہق و محسوس پیرایہ میں، خدائے کبریا

۱۳۳۹ شمسی ۱۳۳۹ هجری قمری ۱۳۳۹ میلادی ۱۳۳۹

۴۴۴ مسللوں کا طرہ سلطنت۔ مسللوں کا عزت و رد و ملحق رہا جس میں بیگزور صلحت کا ہوا انکا کیا ہی

ادھر سے، وہ بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم، حضرت شاہ عظیم ہند دہلیؒ

۱۹۴۸ء جون شہ عہد دوم : در زمانت حقہ چارم خلافت سپید تریک مت حقہ پنجم خلافت عباسی اول

۱۹۴۹ء قراچی دسلی کے ٹیسٹوں کی علیحدہ ایک ریکارڈ بک شائع ہوئی۔

تاریخات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خلافت و سید دوم بعثت از۔

۱۹۰۰ء: تاریخ ختم حضرت محمدؐ - تاریخ قمر و معر - قصی - تدوین قرآن - اسلام کا نام مساجد۔

مشت غلت سدره یعنی دیبا می، اصطلاح کوثر مجید.

۹۵ عاتق علی محمدی، عرب در سه مرتبه، بیست و هفتمین حدیث فی سبیل تاریخ بزرگداشت.

شیراز، سده یکم طراز - مظهر - فلسفہ کی ہے، جدید میں، قومی سیاسی سطوات جلد ازں دس کم

سید، مرتبہ درسیگریں منقولہ: ص ۲۰۲ پ ۱ ہے۔ کتابت حدیث

۱۵۸۰: از شات نایب منت. کرتی اور تعمیر ستیگر۔ محل دور کی طرف ہندوؤں کا امام۔

برہان

جلد ۱۰۲ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۸ء شماره ۳

- | | | |
|----|---|--|
| ۲ | عمید الرحمن عثمانی | نظرات |
| ۷ | پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور | ۱۔ اے مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم |
| ۲۵ | ڈاکٹر محمد یوسف شعبہ عربی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۲۔ کیا قرآن آسمانی کتاب ہے ؟ |
| ۴۲ | محمد شاعر الشرفاں صاحب
انگوری باغ، رام پور | ۳۔ جامع مسجد، رام پور |
| ۵۸ | جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۴۔ اسلامی عہد میں
اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت |
| ۶۲ | | ۵۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی
چوتھی برسی کی یاد |

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کے ہمراہ کئی اعلیٰ فوجی آفیسر ۱۸ اگست کو بھاؤل پور کے قریب ایک فضائی حادثہ کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گئے۔
ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

پروانہ کے چنلے کے بعد ہی طیارہ میں زبردست دھماکہ ہوا اور مرحوم کا صدر طیارہ آٹا فائنا ٹوٹ کر بکھر گیا۔ طیارہ کے تمام مسافر، امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافل، پاکستان کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء، پاکستان کے دو لفٹننٹ جنرل، تین میجر جنرل، پانچ بیگم، ایک کرنل، ایک اسکورڈران سمیت ۱۳۷ افراد لقمہ اجل بن گئے۔

حادثہ کی وجوہات کیا ہیں؟ اعلیٰ پایے پر تحقیقات جاری ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون اور سی، آئی، اے کے ذریعہ تحقیقات میں مدد کی پیش کش کی ہے۔

اس بھیانگ حادثہ اور بین الاقوامی سازش کے جو بھی ذمہ دار ہوں حقیقت ہے کہ صدر طیارہ الحق اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء میں پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہرہ دون کے دون اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا جہاں قبلہ جناب پروفیسر مولانا سعید اکبر آبادی مرحوم سابق مدیر ”برہان“ سے بھی مرحوم صدر کو استفادہ کا موقع ملا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل ضیاء حضرت اکبر آبادی سے تمام زندگی بے متاثر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں دہرہ دون کی رائل ملٹری اکیڈمی سے فراغت کے بعد فوج میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء تک وہ ایک جوئیر انسر تھے جنرل ٹکا خان

مائٹ ہونے کے بعد مسٹر بھٹو نے ان کو جیل بنا دیا۔ ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء بھٹو کا تختہ الٹ کر خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد چیف ایڈمنسٹریٹر حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں مرحوم باضابطہ پاکستان کے رہن بن گئے۔ ۱۹۸۳ء میں مرحوم نے ریفرنڈم کرایا جس کا نتیجہ ان کے حق میں نکلا، ان کے بعد انھوں نے پھر ملک کے منتخب سربراہ کی حیثیت سے صدر کے عہدہ ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس دوران انھوں نے جو بھی اقدامات اٹھائے وہ اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے پاکستانی عوام کی فلاح و بہبودی کے لئے اٹھائے۔ بلا شرکت سے پاکستان کے سب سے بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے ثابت کر دکھایا وہ ایک اعلیٰ درجہ کے سیاست دان، ہوش مند قائد اور مدبر و منظم بھی ہیں جنھوں نے انفرادیت، خودی اور تشخص کو ہر حال میں قائم رکھا، اور جس کا اعتراف آج ہم کی وفات کے بعد ملکی، بین الاقوامی اور عالمی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ ذالک فضل اللہ تبارک من تیشاء۔

مرحوم کی شہادت کی وجوہات سے قطع نظر جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت اور عظمت کسی بھی مشابہ سے بالاتر ہے۔ بلاشبہ صدر پاکستان مرحوم برصغیر کی حالیہ سیاسی تاریخ کی اہم ترین سیات میں سے تھے۔ پاکستان اور یورپی ممالک کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام لئے ان کی موت ایسا دردناک سانحہ ہے جس کے اثرات طویل مدت تک محسوس کیے جائیں گے۔

یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ ان کی موت کا حادثہ پاکستان کی سیاسی تاریخ اتنی ہی اہم موڑ ثابت ہو گا جتنا کہ گیارہ سال پیشتر ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی موت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ اندرونی و بیرونی مخالفت و مزاحمت اور ستان میں متحارب قوتوں کی اقتدار کے لئے رتہ کشی اور سازشوں کے باوجود مرحوم صاحب طویل عرصے تک بڑی شان اور وقار کے ساتھ برسر اقتدار رہے، اور اس پر ان مادی، انتظامی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان کے استحقاق کے لئے زبردست

کو ششیں کیں، اور اسے بین الاقوامی برادری میں ایک ممتاز اور منفرد مقام دلایا۔
 صدر ضیاء نے پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان کے ساتھ برادری اور
 خیر سگالی کے تعلقات رفتہ رفتہ معمول پر لانے کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا سے
 تعلقات اور روابط میں بھی صدر مرحوم نے مناسب، موزوں اور متوازی حکمت عملی
 (STRATEGY) اپنائی تھی

وہ اگرچہ بعض توسیع پسند اور طاقت ور ملکوں کے لئے ہمیشہ ان کی راہ میں
 ایک رکاوٹ رہے۔ ان ممالک کی اندرونی سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود
 کامیابی اور استقلال کے ساتھ ملکی نظم و نسق سنبھالتے رہے۔ پاکستان کی
 تاریخ میں اتنا طویل دور حکومت کس اور حکمران کو نصیب نہیں ہوا۔ اقتدار کی
 اس طویل مدت میں ان کے کٹر سے کٹر سیاسی مخالفین بھی ان کی دیانت و امانت یا
 ذاتی نوعیت کے کسی معاملہ میں ان کا نام کبھی ملوث نہیں کر سکے۔ اپنے قریب ترین عزیز
 اقارب اور دوستوں کو بے جا مراعات یا مالی منفعت پہنچائی ہو۔ جالندھر (پنجاب) میں
 پیدا ہونے والے اس پیشہ ور سپاہی اور مجاہد کے لئے پاکستانی جغرافیائی وطن نہیں
 بن سکتا تھا پاکستان مرحوم کے لئے ایک نظریاتی وطن تھا "مرحوم ضیاء کی ذاتی زندگی میں
 اخلاص اور پاکیزگی اور عوامی زندگی میں فرض شناسی اور دیانت داری کا اعتراف دوست
 دشمن سب کو رہا۔ یہ اسی "آئیڈیل ازم" کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کو ایک تاریخی وراثت،
 ایک نظریہ، ایک فلاحی ریاست اور مثالی مملکت اور نظریات کی بنیاد پر قبول کیا جانے والا
 وطن سمجھتے تھے۔

جنرل ضیاء مرحوم کے گیارہ سال پر محیط دور اقتدار کا تجزیہ فی الوقت ممکن نہیں
 ہے۔ مرحوم نے ملک کے سیاسی اور انتظامی ڈھلچے میں جو مثبت، تعمیری اصلاحات
 کیں، ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔
 اسلام کو بحیثیت ایک نظام (SYSTEM) اور پاکستان میں اسلامی شریعت کے

نفاذ اور اس ملک کو اسلام کا نمائندہ ملک بنانے میں جنرل ضیاء الحق ذاتی طور پر بڑے مخلص اس کے پرجوش حامی اور داعی تھے اور اس تعلق سے وہاں جو کچھ بہتری نظر آرہی ہے وہ مرحوم کی ذاتی کوشش اور خواہش ہی کا نتیجہ ہے۔ نئی حکومت "اسلامی شریعت کے نفاذ" کے تعلق سے کیا پالیسی اپناتی ہے ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ صدر مرحوم کی ہلاکت کے پیش نظر فی الحال پورے ملک میں ایمر جنسی نافذ کی گئی ہے اور عام لوگوں کے بنیادی حقوق معطل اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلم ممالک سے روابط اور تعلقات میں صدر ضیاء کے دور میں قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ مسلم سربراہ کانفرنس میں صدر مرحوم نے خصوصی مقام حاصل کیا۔ وہ امن کمیٹی کے چیرمین (Chairman) تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ مصر کو دوبارہ کانفرنس کا رکن بنانے کا ذریعہ بنے اور اس سے تعلقات استوار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے سکریٹری جنرل کے عہدے پر پاکستان کا نمائند منتخب کیا گیا۔ پاکستان غیر جانبدار تحریک کا رکن بنا۔ افغانستان کے مسئلہ کا باوقار اور پرامن حل اب وہاں سے روسی افواج کے انخلا کے معاملہ میں بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری اور جرأت مندانہ موقف نے صدر مرحوم کو ایک پاؤگار اور بلند وقار عطا کیا۔ پاکستان نے ۲۰ لاکھ افغان مہاجرین کو پناہ دے کر اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کر کے جو عظیم انسانی کارنامہ انجام دیا ہے، اسے دنیا بھر میں قد و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اقوام متحدہ میں اس کی پیش کردہ قراردادوں پر ۱۲۳ ممالک نے حمایت میں ووٹ ڈالے جو مسلم اور غیر مسلم دنیا اور متعدد اشتراکی ممالک کی جانب سے اظہار اعتماد کا ایک شاندار اور قابل فخر ریکارڈ ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آج کا پاکستان دنیا کی نظروں میں کل کے پاکستان سے بہت بلند مقام پر فائز ہے۔

پاکستان کے سیاسی افق سے صدر ضیاء کے اچانک غائب ہو جانے سے پاکستان کے سامنے کئی اہم ترین موڑ آ گئے ہیں اور فی الحقیقت پاکستان مسائل اور آنا لٹنوں سے دوچار ہو گیا ہے۔ صدر ضیاء کی ہلاکت سے طاقتوں کا ہر توازن اثر انداز ہوا ہے۔ سیاست کی وہ ساری بساط الٹ گئی ہے۔

پاکستان کے تین پیشہ ور سپاہیوں کی ایک ساتھ موت، پاکستان ہی نہیں بلکہ مغربی ایشیا اور وسط ایشیا تک سیاست بدل گئی ہے۔ اب افغانستان، ایران، سعودی عرب، عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں سیاست کا رخ بدل سکتا ہے۔ مرنے والے کی نظر بڑی وسیع، ذہن بڑا دڑاک اور تعلقات بڑے وسیع تھے۔ ان کی سیاست، دانائی، تدبیر، فراست اور معاملہ بھی مسلمہ تھی۔.....

بہر حال مرحوم کی المناک فضائی حادثے میں شہادت سے ایک ایسے دور کا خاتمہ ہو گیا جسے مستقبل کا مورخ کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چونکہ صدر مرحوم ایک جوانی حادثہ کا شکار ہو کر اللہ کے حضور پہنچے ہیں اور شریعت اسلامی کے اعتبار سے ایک مسلمان جب کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر مرتا ہے تو اس کو "شہادتِ حکمی" کا عظیم مرتبہ ملتا ہے۔ اس معنیٰ کو صدر ضیاء کی موت ایک شہید کی موت ہے اور روزِ محشر میں شہید سے کوئی پوچھ کچھ نہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم اور ان کے رفقاء کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں ان کے درجات بلند فرمائیں، اپنے دیدار سے نوازیں اور سوگواری خاندان، ہم سب کو اور پاکستانی عوام کو اس حادثہ کا نگاہ کو برداشت کرنے کی توفیق دہمت دیں۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکستان کے موجودہ حاکموں کو پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ حالات میں سدھار لانے کی توفیق دے اور پاکستانی قیادت اور باشعور عوام جلد از جلد اس خلا کو پر کر سکیں جو صدر مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ دراصل ایک متحد، مضبوط، پائدار اور اندرونی اعتبار سے مستحکم پاکستان سے ہی ہندوستان اور برصغیر کے لوگوں کا وسیع تر مفاد وابستہ ہے!!!

اے مجموعہ خوبی بچہ نامت خوام

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پہلی بار میں نے مفتی صاحب کو ۱۹۵۴ء میں دیکھا۔ اُن دنوں میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ہمارے استاد ڈاکٹر حمید الدین مرحوم مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ کے تلمیذ الرشید تھے۔ انھوں نے سینٹ اسٹینس کالج میں اُن سے فارسی پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے طلبہ کے ایک گروپ کو بھارت کے تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لائے تھے۔ دہلی میں ہمارے قیام کا مسئلہ تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ شاید ندوۃ المصنفین میں قیام کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے۔ میں ڈاکٹر حمید الدین کے ساتھ مفتی صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ اس وقت تک میں ان کے نام اور مقام سے ناواقف تھا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ اتنے بڑے گروپ کے لئے دفتر برہان میں قیام کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ جامع مسجد کے علاقے میں ہنوز ناز، تاج اور وکیل نام کے ہوٹل تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ مفتی صاحب سے مل کر ہم کو چہرہ رحمان پہنچے۔ وہاں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی سے ملے۔ انھوں نے بی ماراں میں پانامہ ہوٹل میں، جو نواب لوہاروی کی حویلی میں قائم ہوا تھا، ہمارے قیام کا انتظام کرا دیا۔ اب یہ ہوٹل ختم ہو چکا ہے اور وہاں غالباً کوئی سکول

نیا ہے۔

۱۹۵۵ء میں کلکتہ میں میری ملاقات مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے ہوئی اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برہان پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آتا تھا۔ میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے چندہ بھیجا آسان تھا اس لئے میں برہان کا باقاعدہ خریدار بن گیا۔ انگلستان کے قیام کے آخری زمانہ میں ریچانہ کے ساتھ میری نسبت طے پا گئی۔ نہ ہی مولانا اکبر آبادی مرحوم نے میرے والدین کو دیکھا تھا اور نہ ہی میرے والدین ان سے متعارف تھے۔ مولانا نے میرے توسط سے والد مرحوم کو خط لکھا، والد ماجد نے ہاں کر دی، یوں نسبت طے پا گئی۔ میں فروری ۱۹۶۷ء میں نو سال بعد وطن واپس آیا۔ مارچ کے اوائل میں والد مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ چلے جاؤ اور نکاح کر کے ریچانہ کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ میں لاہور سے کراچی گیا اور وہاں سے ہر مارچ کو جڑی کی ایئر لائن لفٹھانزا میں سیٹ ریزرو کر لائی اور ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچ گیا۔ ایئر پورٹ سے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سوا پانچ بجے جتنا ایکسپریس طے لگی اس سے پہلے علی گڑھ جانے کے لئے کوئی ٹرین نہیں ہے۔ میں نے سامان کلرک روم میں جمع کر دیا اور چاندنی چوک اور درمیں سے گزرتا ہوا جامع مسجد پہنچ گیا۔ اردو بازار میں ان دنوں میرا کوئی جانتے والا نہ تھا۔ میں کٹرہ نظام الملک میں داخل ہوا۔ ندوۃ المصنفین کے دروازے پر چھٹی پڑی تھی۔ اس لئے میں اندر جانے سے ہچکچایا۔ میں دروازے پر کھڑا تھا کہ کسی راہگیر نے کہا اندر چلے جائیے، یہاں مردانہ ہے۔ میں چتا اٹھا کر اندر داخل ہوا، مفتی صاحب حسب معمول اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی اس لئے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں

چند قدم آگے بڑھا لیکن ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی اور میں چپکے سے واپس چلا آیا۔

شادی کے بعد میں اور ریحانہ علی گڑھ سے دہلی آئے۔ ریحانہ کا پاسپورٹ بنوانا تھا اور پھر پاکستان جانے کے لئے ویزا بھی حاصل کرنا تھا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے مفتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ انہیں کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیں، گھر میں نہ لکھیں۔ ہمارے دہلی پہنچنے سے پہلے مفتی صاحب نے جامع مسجد کے قریب ناز ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست کر دیا۔ یہیں جو کمرہ ملا اس کی یا لکٹی جامع مسجد کے رخ تھی۔ مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنے گھر سے کئی چیزیں پہنچا دیں تاکہ یہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ جناب محمد احمد شمس مرحوم دن میں دو تین بار اپنی بچی سلمیٰ کو ساتھ لے کر ہماری خیریت معلوم کرنے آتے۔ پانچ روز میں پاسپورٹ اور ویزا مل گئے۔

اب میں ہوٹل چھوڑنے سے پہلے کاؤنٹر پر بل ادا کرنے گیا تو مینجر صاحب نے ایسا کہ میرا بل ادا ہو چکا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرا بل کس کرم فرمانے ادا کیا ہے؟ مینجر صاحب سے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے کہا، "بس آپ جائیے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ ہوٹل کے مالک محمد حسین نے مفتی صاحب کے یہاں سمجھ کر بل لینے سے صاف ٹکا کر دیا۔ جب مفتی صاحب نے ان سے کہا کہ اگر کمرے کا کرایہ نہیں لیتے تو جو کچھ ہول نے کھایا پیسا ہے اس کا بل تولے لیں۔ محمد حسین صاحب نے جواب دیا، مفتی صاحب میں بل لے کر آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" یہ تھا مفتی صاحب کا احترام لی میں۔

میرے پاس برٹش پوسٹل آرڈرز تھے۔ یہ انہیں بھجنانے کی غرض جی پی او لے متعلقہ کلرک نے کہا کہ انہیں کراس ہونا چاہئے تھا اور اس پر کمیشن کروانے والے نام بھی لکھا ہونا چاہئے تھا۔ میں وہاں سے مایوس ہو کر جامع مسجد کے ڈاکخانے گیا۔

وہاں جانے سے پہلے میں نے ان پر اپنا نام اور دہلی لکھ لیا تاکہ اب کوئی اعتراض نہ کرے۔
متعلقہ کلرک نے کہا "ہم آپ کو نہیں جانتے۔ کسی ایسے شخص کو ساتھ لائیے جو ہمیں بھی جانے
ہو اور آپ کو بھی۔" میں نے کہا، میں مسافر ہوں۔ میں ایسے شخص کو کہاں سے لاؤں جو
بھی جانتا ہو اور آپ کو بھی۔" اس پر وہ کہنے لگا "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" میں نے
کہا "دفتر برہان میں۔" کلرک نے کہا کہ ان کے پیچھے مفتی صاحب سے تصدیق کرالیں
کہ آپ ہی اسلم ہیں۔ ہم ان کے دستخط پہنچانے ہیں۔ میں دفتر برہان آیا۔ مفتی صاحب
نے تصدیق فرمائی اور وہ پوسٹل آرڈرز لے کر دوبارہ ڈاکخانے پہنچا۔ کلرک
مفتی صاحب کے دستخط دیکھ کر پوسٹل آرڈرز کیش کر دیئے۔

۱۱ مارچ کو میرا نکاح اتنی عجلت میں ہوا کہ مفتی صاحب اس میں شریک نہ ہوئے۔
۱۸ مارچ کو میں اور ریحانہ پاسپورٹ اور ویزا لے کر علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹ مارچ کو مولانا
اکبر آبادی مرحوم نے استقبال دیا۔ دہلی سے مفتی ضیاء الحق، اور مفتی صاحب تشریف
لائے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے جن کا نام اب یاد نہیں رہا۔ اس تقریب میں
مفتی صاحب توجہ کا مرکز بنے رہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، آل احمد سرور، مولانا
امینی، قاضی مظہر الدین بلگرامی، نواب احمد سعید چھتاری، نواب مجید الرحمن خاں شرو
ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر عبد العظیم اور علی گڑھ کے بہت سے اساتذہ اس تقریب میں
ہوئے۔ مفتی صاحب کے ان سب کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔ مفتی صاحب تقریب
اختتام پر علی گڑھ میں رہے کہ نہیں اور مفتی ضیاء الحق کی کار میں واپس لوٹ گئے۔ بعد میں
نے بتایا کہ رات کو دس بجے کے قریب کار خراب ہو گئی۔ وہ علاقہ غیر محفوظ تھا۔ وہاں آنا
کی آبادی ہے جو چوری چکاری اور لوٹ مار کے لئے بدنام ہیں۔ اس لئے جب تک کار در
نہیں ہو گئی، خوف و ہراس طاری رہا۔ جب مفتی صاحب سے میری بے تکلفی ہو گئی تو
روز فرمانے لگے، "تمہارا ساتھ ریحانہ کے نکاح کے متعلق مولوی صاحب

نے مجھ سے بھی مشورہ کیا تھا اور میرے ہی مشورہ پر انہوں نے تمہارے والد کو خط لکھا تھا۔ میرے والد مرحوم سے مفتی صاحب کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب مفتی صاحب پاکستان تشریف لائے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن مولانا اکبر آبادی مرحوم کے خط کے جواب میں انہوں نے جو خط تحریر فرمایا تھا۔ وہ مولانا مرحوم نے مفتی صاحب کو دکھایا تھا۔ صرف اسی خط کی بنا پر مفتی صاحب تازیت والد مرحوم کی شرافت اور علوِ مہمت کے معترف رہے۔

میں اگست ۱۹۶۹ء میں بھارت کا دورہ ختم کر کے لاہور جا رہا تھا۔ اس زمانے میں حسینی والا (فیروز پور) کا بارڈر کھلا تھا۔ ریحانہ اور زفر جن کی عمر اس وقت نو ماہ تھی۔ میرے ساتھ تھے۔ مفتی ضیاء الحق صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ شام کو کھانے پر بلایا۔ میں نے عرض کیا کہ نوبت پنجاب میل نئی دہلی سے روانہ ہوتی ہے اس لئے آپ کھانا وانا نہ کھائیے کیونکہ نیچے ہر صورت میں ساڑھے آٹھ بجے تک اسٹیشن پہنچ جانا چاہئے۔ مفتی ضیاء الحق بھلا کب ماننے والے تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب کو بھی مدعو کر لیا۔ کھانے کے بعد مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنی کار میں ہمیں بٹھایا اور ندوۃ المصنفین لے آئے۔ جلدی بلدی کار میں سامان رکھا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اتھیری گیٹ کے قریب پہنچ کر کار خراب ہو گئی۔ مفتی ضیاء الحق کار درست کرنے لگے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے میں ۲۰ منٹ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اجازت دیں تو ہم ٹیسی میں سوار ہو جائیں، موصوف لبند تھے کہ بس ابھی انجن درست ہو جاتا ہے۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ میں نے اگلے روز لازمی طور پر سرحد عبور کرنا تھی۔ اگر ٹرین چھوٹ جاتی تو میں مشکل میں پھنس جاتا۔ مفتی صاحب لبند تھے کہ بس ابھی انجن درست ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہم پانچ منٹ کم نوبت اسٹیشن پر پہنچے۔ سامان قلیوں نے اٹھایا اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ ریحانہ نے بھی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب نے زفر کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ مفتی ضیاء الحق پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے چلے گئے۔

ہم جو نہی اپنی بونگی کے قریب پہنچے گا رڈ نے وہیل دے کر ڈرائیور کو سبز رنگ کا سگنل دے دیا۔ ریکانہ جلدی جلدی ٹرین میں سوار ہوئی۔ مفتی صاحب نے زفر اسے نکھایا۔ چلتی ٹرین میں قلیوں نے سامان رکھا اور میں نے انھیں مزدوری دی۔ تب کہیں میری جان میں جان آئی۔

اس شب مفتی صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ زفر کو گود میں اٹھا کر پلیٹ فام پر تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ رہے ہیں۔ کئی سال بعد مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے۔ وہاں سے لاہور آنے کا پروگرام تھا۔ ان کا قیام سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ شام کو لاہور میونسپل کارپوریشن نے مندوبین کے اعزاز میں استقبال دیا۔ میں اور زفر وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مندوبین تشریف لانے لگے۔ مفتی صاحب کار سے نکلے تو میں آگے بڑھا۔ زفر بھاگ کر ان کے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے عرض کیا "حضرت یہ وہی بچہ ہے جسے آپ گود میں اٹھا کر نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر بھاگے تھے۔" فرمانے لگے "ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گیا ہے۔" میں استقبال میں مدعو نہ تھا۔ انشلی مجلس کے لوگ بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے زفر کا بازو تھاما۔ اب ہمیں گیسٹ پر روکنے والا کون تھا، ڈیڑھ گھنٹہ ہم مفتی صاحب کے ساتھ رہے۔

اگلے روز مفتی صاحب سرکاری گاڑی لے کر غیب خانے پر تشریف لائے۔ ریکانہ سے ایسے ملے جیسے اپنی بیٹی سے ملتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔ ریکانہ سے کہنے لگے "بھئی چائے واٹے کے چکر میں نہ پڑو۔ ابھی ناشتہ کر کے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔" یوں گھنٹہ کے قریب قیام فرمایا، ہمارا گھر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ رخصت ہوتے وقت جیب سے کچھ رقم نکالی۔ ریکانہ نے کہا بھی کہہنے دیجئے۔

آپ کو ضرورت ہوگی۔ ہم تو دہلی آتے ہی رہتے ہیں، لیکن مفتی صاحب نے فرمایا، "بھئی بیٹی کا معاملہ ہے کیسے رہنے دوں۔" پھر بڑے اصرار کے ساتھ وہ رقم اُسے تھادی۔

مفتی صاحب اپنے پرانے دوست کرنل خواجہ عبدالرشید سے ملنا چاہتے تھے۔ آزاد کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں انہیں خواجہ صاحب کے ہاں لے گیا۔ تیس تیس سال بعد پہلی بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔

عجب رنگینیاں باتوں میں کچھ ہوتی ہیں اے انشا

بہم ہو بیٹھتے ہیں جب سعادت یارِ خاں اور ہم

یہ سلسلہ کی بات ہے۔ ان دنوں مولانا سعید احمد اکبر آبادی تعلق آباد میں قیام پذیر تھے۔ میں لاہور سے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ فلائنگ میل سے رات نو بجے نئی دہلی پہنچا۔ ہمارے ساتھ انڈین آرمی کے ایک میجر اور دہلی کے ایک بڑے تاجر اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان سے تعلق آباد کا محل وقوع پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ جگہ دہلی سے بہت دور ہے اور مناسب یہی ہے کہ ہم رات کو ٹیکسی میں سفر نہ کریں۔ رات کسی عزیز کے ہاں یا ہوٹل میں بسر کر لیں اور صبح کو تعلق آباد جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے جاننے والے تو دہلی میں بہت ہیں لیکن ہم بے وقت کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کسی ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔ ہم اسٹیشن سے باہر نکلے۔ سامان ایک تانگے پر لدا لیا اور پہاڑ گنج کے پل کی طرف جاتے ہوئے ایک اچھا سا ہوٹل نظر آیا۔ ہم اس میں ٹھہر گئے۔ صبح پہلے کوکے میں نے اپنے بیٹے زفر کو، جس کی عمر اس وقت سات سال تھی، اپنے ساتھ لیا اور اہلیہ سے کہا کہ میں مفتی صاحب سے اتنے پتہ معلوم کر کے ٹیکسی لے کر آتا ہوں اتنے میں بچوں کو تیار کر لینا۔ ہم دونوں رکشا میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچے۔

مفتی صاحب اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں زفر کو ساتھ لے کر آگے بڑھا اور سلام کر کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے دیکھا تو فوراً کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھ مصافحہ اور معافہ کے بعد زفر کو پیار کیا۔ فرمانے لگے "کب آئے؟" میں نے عرض کیا کہ ابھی دہلی پہنچا ہوں۔ ریکانہ اور بچے نئی دہلی میں ہیں۔ آپ ایسا کیجئے کہ کسی وقت ٹیکسی والے کو مولانا اکبر آبادی کا پتہ سمجھا دیجئے جو ہمیں باسائی وہاں پہنچا دے۔ مفتی صاحب نے فرمایا "چائے نہیں پیو گے؟" میں نے عرض کیا ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ اس وقت سب اہم مسئلہ تعلق آباد پہنچنے کا ہے۔ مفتی صاحب میرے ساتھ باہر آئے۔ جامع مسجد کے باہر کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مفتی صاحب نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ تعلق آباد میں ہمدرد کا کپلیکس جانتا ہے۔ میں ٹیکسی میں سوار ہو کر ہوٹل پہنچا اور بچوں کو ساتھ لے کر تعلق آباد پہنچ گیا، اسی اشار میں مفتی صاحب نے مولانا اکبر آبادی کو فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔

میں نے ۳۶ روز تعلق آباد میں قیام کیا۔ اس زمانے میں وہاں اتنی ہماہمی نہ تھی جتنی ان دنوں ہے۔ ایک گھنٹے بعد دہلی جانے والی بس وہاں سے گذرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں ناشتہ کر کے دہلی جانے کے لئے سڑک پر آیا۔ جب بس آئی تو دیکھا کہ اندر کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں ہے اور لوگ چھت پر سوار ہیں تو میں یہ کہنے ہوئے واپس لوٹ گیا کہ کل دیکھا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں تعلق آباد سے مہرولی چلا جاتا اور وہاں سے شہر کی جانب جانے والی بس مل جاتی۔ میں تعلق آباد سے شہر آتا تو پہلے مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کچھ دیر وہاں رکتا اور پھر گھومنے نکل جاتا۔ دوپہر کو دفتر برہان آجاتا۔ حکیم ظفر احمد مرحوم بڑے دالان کا تالہ کھول دیتے اور میں وہاں سو جاتا۔ سہ پہر کے قریب سوکر اٹھتا اور نہا کرتا زہ دم ہو جاتا۔ ظہر کی نماز بڑے دالان میں ادا کر کے اجازت کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ عصر سے ذرا قبل مفتی صاحب بھی تشریف لے آتے۔ کبھی میں

ان کے اصرار پر چائے پی لیتا اور کبھی معذرت کر دیتا۔ موصوف کبھی چائے گھر سے منگوا لیتے اور کبھی فلورا ہوٹل میں آرڈر دے دیتے۔ عصر کی نماز میں مفتی صاحب کی اقتدار میں ادا کرتا۔ مرحوم میرے امام ہوتے اور میں ان کا واحد مقتدی۔ نماز کے بعد میں تعلق آباد چلا جاتا۔

انہی دنوں ایک روز میں ندوۃ المصنفین آیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ مفتی صاحب نے کھانے پر اصرار کیا۔ کھانا کھاتے کھاتے دیر ہو گئی۔ میں جامع مسجد میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہاں نماز ذرا جلدی ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ مفتی صاحب نے میری پریشانی دیکھی تو فرماتے لگے: ”فکر نہ کریں، میں نے بھی نماز جمعہ ادا کرنی ہے۔“ ہم دونوں دفتر برہان سے مکملے اور مفتی صاحب مجھے میاں محل میں سے ہوتے ہوئے کریم ہوٹل کی طرف لے گئے۔ آگے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ مفتی صاحب کے مکان کے عقب میں ہونی چاہئے۔ مسجد کچھ کچھ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور تیل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، ہمیں دیکھ کر نمازیوں نے ہمارے لئے جگہ بنادی اور ہم نے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔

ایک روز میں حسب معمول دس بجے کے قریب ندوۃ المصنفین پہنچا۔ مفتی صاحب اپنی نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا تو فرماتے لگے ”میاں! اچھے وقت پر آئے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے روسی سفارت خانہ سے دو دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔ ایک میرے نام آیا ہے اور دوسرا مولوی سعید (مفتی صاحب عام گفتگو میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے) کے نام یہ مولوی سعید کا دعوت نامہ لے لو۔ ان سے کہنا کہ امام بخاری کا ہزار سالہ جشن ولادت منایا جا رہا ہے۔ جب اپنا مقالہ لکھو تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ میرے لئے بھی لکھ لینا۔“ مفتی صاحب نے کئی موقعوں پر اپنے ”کو تاہ قلم“ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مرحوم کو تاہ قلم نہ تھے۔

انہوں نے ندوۃ المصنفین کے ابتدائی دور میں ابن الجوزیؒ کی صید الخاطر کا اردو میں بڑا عمدہ ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں امام ابن تیمیہؒ کی الکلم الطیب مفتی صاحب نے اپنے تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کی۔ ”منار صدقہ“ کے عنوان سے ان کے جو مقالات ڈاکٹر عنوان چشتی نے مرتب کئے ہیں، ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ہجوم کار نے انہیں ”کو تاہ قلم“ بنا دیا تھا۔

میں وہ دعوت نامہ جیب میں ڈال کر خانقاہ شاہ ابوالخیرؒ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں شیریں بھون کے مالک میاں تاج الدین سے ملاقات ہو گئی۔ ان کے بڑے بھائی میاں شجاع الدین لاہور میں قصر شیریں چلا رہے ہیں۔ میاں تاج الدین نے اس روز کسی کی فرمائش پر قلاتند بنائی تھی۔ اس زمانے میں دودھ کی مٹھائی بنانے کی مانگت تھی۔ میاں صاحب نے مجھے نصف کلو کے قریب قلاتند بطور تحفہ دی۔ شام کو میں تعلق آباد پہنچا تو اس وقت مولانا اکبر آبادی مرحوم ملازمہ میں مگن تھے۔ میں نے ڈبہ کسول کو ان کے سامنے کیا۔ انہوں نے بغور قلاتند کو دیکھا اور ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ پھر حسب عادت اس کی بڑی تعریف کی۔ جب مولانا منہ میٹھا کر چکے تو میں نے دعوت نامہ پیش کیا۔ مرحوم بہت خوش ہوئے اور سب اہل خانہ کو جمع کر کے فرمانے لگے: ”دیکھو یہ میاں اسلم کتنے قاندے کے آدمی ہیں۔ پیہے میرا منہ میٹھا کرایا، پھر دعوت نامہ دیا۔ تم بھوتے تو یونہی منہ اٹھائے چلے آتے۔“ چند لمبے سکوت کے بعد میں نے کہا کہ مفتی صاحب فرماتے تھے کہ جب اپنا مقالہ لکھیں تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ ان کے لئے بھی لکھ دیں۔ اس پر مولانا اینٹھ گئے اور فرمانے لگے ”لو اور سنو! کانفرنس میں مفتی صاحب شرکت کریں اور مقالہ میں لکھیں۔ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے۔ ایک روز میں تعلق آباد سے دہلی آیا تو مفتی صاحب نے فرمایا ”میں آج شام

کے جہاز سے سری نگر جا رہا ہوں۔ شیخ محمد عبداللہ نے بلایا ہے۔ وہاں حضرت بل میں ایک مدرسہ ہے مدینۃ العلوم۔ اس کا معاہدہ کر کے سفارشات مرتب کرنی ہیں۔

میاں یہ تو بہانہ ہے کشمیر بلانے کا۔ چلو گے؟ یہ بات میرے دہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں بھی کبھی سری نگر جاؤں گا۔ حالانکہ میں ان دنوں برطانیہ کا شہری تھا اور میرے وہاں جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ چلتے۔ میں کل صبح دہلی سے روانہ ہو کر پسون شام تک سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ آپ کا قیام کہاں ہوگا؟ فرمانے لگے ”وہاں مدینۃ العلوم حضرت بل میں ہی قیام ہوگا۔ اس کے پرنسپل ہمارے دوست مولانا ابوالعرفان ندوی ہیں۔“ میں اسی وقت تعلق آباد روانہ ہو گیا اور اہل خانہ کو بتا دیا کہ میں چند روز کے لئے حسب عادت سیاحت کے لئے نکل رہا ہوں اس بار پنجاب کی طرف جاؤں گا۔ شام کو میں نے اپنا سامان اٹھایا اور بس میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچ گیا۔ رات وہاں گزاری۔ صبح چھ بجے کے قریب ایک ٹرین پانی پت جاتی تھی۔ میں اس میں سوار ہو کر دس بجے کے قریب پانی پت پہنچ گیا سامان ٹلوک روم میں رکھ کر قلندر صاحب کی درگاہ دیکھنے گیا۔ بعد ازاں مولانا عالی قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء، ابراہیم لودھی اور حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے مزارات پر حاضری دی اور دوپہر کے وقت ایک سجر ٹرین میں سوار ہو کر شام تک انبالہ پہنچ گیا۔ نصف شب کے قریب کشمیر میں وہاں پہنچی۔ جالندھر تک تو اس میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔ جالندھر پہنچ کر ٹرین قریب قریب خالی ہو گئی اور مجھے سونے کے لئے برتھ مل گئی۔ صبح نو بجے میں جہوں پہنچ گیا۔ وہاں سے بس میں سوار ہو کر رات کو عشار کے وقت سری نگر پہنچ گیا۔ ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور وہ مجھے حضرت بل لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مفتی صاحب قریب ہی کشمیر یونیورسٹی کے صدر دروازے کے سامنے ٹھہرے وقت

کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اس وقت مولانا ابوالعرفان صاحب
ساتھ کسی کے ہاں ضیافت پر تشریف لے گئے ہیں مفتی صاحب نے میرے آنے
اطلاع مدد سہ کے ذمہ داروں کو کر دی تھی چنانچہ مجھے مہمان خانے پہنچا دیا گیا۔ جو
کے آخری دن تھے تاہم رات کے وقت سردی تھی اور پانی بھی کافی حد تک سرد
تھا۔ طلبہ نے مجھے چائے بنا دی۔ میں چائے نوش کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد
مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان بھی پہنچ گئے۔ مفتی صاحب مجھے وہاں دیکھ کر بہت
خوش ہوئے اور فرمانے لگے ”اچھی گذرے گی۔“ مولانا ابوالعرفان کے ساتھ میرا
تعارف کرایا۔ میں نے عرض کیا کہ کل سے آپ کسی کے ساتھ میرا تعارف نہیں کرا سکیں
گے، میں خود اپنا تعارف کراؤں گا۔ سری نگر میں احتیاط ضروری ہے۔

اکھلی صبح ناشتہ کے بعد لوگ ملاقات کے لئے آنے لگے۔ پہلے مفتی عبدالغنی اور
شعبہ عربی، کشمیر یونیورسٹی تشریف لائے، پھر مولانا ابوالعرفان آ گئے۔ تھوڑی دیر میں آپ
والوں کا تانا بندھ گیا۔ مفتی صاحب نے عبدالغنی صاحب سے کہا کہ راقم کو یونیورسٹی
دکھالائیں۔ موصوف مجھے یونیورسٹی لے گئے۔ شعبہ کشمیریات میں پروفیسر سعید گیلانی سے
ملایا، پھر شعبہ تاریخ میں ڈاکٹر محب الحسن سے ملاقات کرائی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار
بھی ملے۔ انھوں نے مجھے شعبہ تاریخ میں ملازمت کی پیشکش بھی کی۔

شام کو مفتی صاحب، مولانا ابوالعرفان اور میں راجوری کدل میں جناب میرزا
محمد فاروق کے ہاں گئے۔ مفتی صاحب کے میرزا اعظم محمد یوسف مرحوم کے ساتھ دوستا
مراہم تھے۔ وہ آزادی کے بعد مظفر آباد چلے گئے اور آزاد کشمیر میں عہدہ صدارت پر بھی فائز
رہے۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صاحب کا سری نگر جانا نہیں ہوا تھا۔ مفتی صاحب
میرزا اعظم محمد فاروق کے ہاں ان کی تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ موصوف دیر تک
مرحوم کی خوبیاں بیان فرماتے رہے۔ اتنے میں سداوار میں کشمیری چائے آگئی۔ اہل کشمیر

مولانا نکین چائے پیتے ہیں اور وہ چائے میں شکر ملانی بدعت بلکہ شرک گردانتے ہیں۔ اگر کوئی غیر کشمیری چائے میں ملائے کے لئے ان سے شکر مانگ لے تو یہ ایک طرح سے گالی سمجھی جاتی ہے۔ مفتی صاحب نکین چائے پینے کے عادی نہ تھے اور اس رواج سے بھی ناواقف تھے۔ انھوں نے نکین چائے کی ایک چٹکی لے کر میری طرف دیکھا۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ میں نے میرا غلطی کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ کشمیری سے چائے میں ملائے کے لئے شکر طلب کرنا الی دینے کے مترادف ہے لیکن مفتی صاحب نکین چائے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ میرا غلط مسکرائے اور انھوں نے خادم کو اشارہ کیا اور وہ چینی لے آیا۔ پھر مولانا ابوالعرفان اور راقم نے بھی چائے میں چینی ڈالی۔

میرا غلط نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ان کے ساتھ گلرگ چلیں۔ اگلے روز میرا غلط اور مفتی بشیر الدین صاحب دو کاروں میں بیٹھ گئے۔ میرا غلط، مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان ایک کار میں سوار ہو گئے اور میں مفتی بشیر الدین صاحب کی کار میں بیٹھ گیا۔ گلرگ پہنچ کر ہم کچھ دیر کے لئے ریسٹ ہاؤس میں رُکے۔ باہر لان میں کوسیا لگا دی تھیں۔ راقم نے بھی بات چیت میں حصہ لیا۔ میرا غلط فرمانے لگے آپ تو بڑے کام کے آدمی ہیں، اب آپ ہماری کار میں بیٹھئے گا۔ مفتی صاحب نے ان کی اس میں ہاں ملائی اور میرے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم گلرگ پہنچ گئے۔ وہاں کالف کلب میں کھانے کا انتظام تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور نماز ظہر ادا کر کے واپس ہوئے۔

واپسی پر میرا غلط نے فرمایا کہ اگر ہم چاہیں تو ایک دن رات ان کے مہمان کی حیثیت سے ہاؤس بوٹ میں قیام کر لیں اور اگر وہاں نہ رہنا چاہیں تو چشمہ شامی پر جمعہ سہائے جنگل میں ایک دن رات گزار لیں۔ ہم نے ایک ہاؤس بوٹ دیکھا لیکن چشمہ شامی

کے بیگلے میں رہنا پسند کیا۔ عصر کے بعد میر واعظ بھی تشریف لے آئے اور ہمیں چٹہ شامی
پہ لے گئے۔ اس چٹے کا پانی صحت کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ
بھی ہے اور ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک بیرا چٹے کا پانی صاف و شفاف گلاسوں میں
لے آیا۔ وہ بار بار آتا اور کپڑے سے میز صاف کر جاتا۔ اس کی حرکات سے ترشح ہوتا
تھا کہ وہ جاسوس ہے۔ میر واعظ نے بھی اس کی تصدیق کی۔

مغرب کی نماز ہم نے بیگلے کے لان میں مفتی صاحب کی اقتدار میں ادا کی اور وہیں کرسیوں
پر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد میر واعظ کے گھر سے کھانا آ گیا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا
اور دس بجے کے قریب میر واعظ تشریف لے گئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب میر واعظ دوبارہ تشریف لائے۔ ہم باہر لان
میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیگلے کا ملازم، جو جاسوس بھی تھا، یہاں نے بہانے سے ہمارے
گرومنڈ لاتا پھرتا تھا۔ میر واعظ اور مفتی صاحب سیاست کے موضوع پر گفتگو کرتے
لگے تو میں اور مولانا ابوالعرفان بہانہ کر کے دوسری جگہ جا بیٹھے۔

ایک روز شام کو صوفی نذیر احمد نے ہمیں بربر شاہ میں مسجد اہلحدیث میں مدعو کیا۔
ہم نے مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ اس کے بعد انھوں نے پیشری اور چائے سے ہماری
تواضع کی۔ صوفی صاحب جتنی گھنی اور لمبی داڑھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ
بیٹھتے تو داڑھی بلا مبالغہ زمین کو چھوتی تھی۔ میں نے اجازت لے کر اسے ہاتھ لگایا تو
مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا، ”میاں اچھی طرح دیکھ لو پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں
آئے گا۔“ صوفی صاحب بھی مسکرا دیئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بل میں رسول اکرم صلی
کا چھوٹا ساموئے مبارک موجود ہے اور خانیاہ شریف میں حضرت شیخ عبدالقادر
جیلانی کا ٹوئے مبارک ایک چھوٹی سی شیشی میں ڈال کر رکھا ہوا ہے۔ صوفی صاحب
کی ریش مقدس کا ایک بال بھی کسی مرتبان میں سنبھال کر رکھ لینا چاہئے۔ میری

بات سن کر دونوں حضرات مسکرا دیئے۔

اگلی صبح ہم مدرسہ نصرت العلوم دیکھنے گئے جسے میرا عظم چلا رہے ہیں۔ وہیں ہماری ملاقات مفتی عبدالکبیر مرحوم سے ہوئی۔ مفتی صاحب انھیں پرانی باتیں یاد دلا کر ہنساتے رہے اور خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ مفتی عبدالکبیر نے حضرت بل میں بنگلہ تعمیر کرایا تھا۔ انھوں نے وہاں آنے کی دعوت دی لیکن مفتی صاحب نے وقت کی کمی کا غدار کر کے معذرت طلب کی۔

ایک روز شیخ عبداللہ نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ایک روز پہلے گام ہو آئیں۔ ان کا ایک معتقد عبدالسلام دیوہ شیخ صاحب کی گاڑی لے کر آگیا۔ ہم صبح نو بجے کے قریب سری نگر سے چلے۔ راستے میں پانپور اور اونتی پور ہوتے ہوئے اسلام آباد (انت ناگ) پہنچ گئے۔ وہاں داراشکوہ کا تعمیر کردہ تالاب دیکھ کر ہم اچھا بل چلے گئے۔ وہاں دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے کر ہم کو کرناگ روانہ ہوئے۔ ہمارے لئے چشمے کے کنارے ایک چنار کے گھنے درخت کے نیچے کرسیاں لگادی گئیں اور چشمے کا پانی پینے کے لئے پیش کیا گیا۔ تاحہ نظر گلاب کی کیاریاں نظر آرہی تھیں۔ ہم کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ کو کرناگ میں رُک کر اچھا بل چلے گئے۔ ریٹ ہاؤس میں کھانا تیار تھا۔ میرے اصرار پر ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی بجائے ہم نے ریٹ ہاؤس کے لان میں ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانا تناول کیا اور اسی چشمے کے پانی سے وضو کر کے مفتی صاحب کی اقتدار میں نماز ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد ہم پہلے گام کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پام ویو ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ ایک کمرے میں مفتی صاحب نے ڈیرہ جمایا۔ دوسرے کمرے میں میں اور مولانا ابوالعرفان ٹھہرے۔ عبدالسلام اور ڈرائیور نے تیسرے کمرے میں اپنا سامان رکھ لیا۔ پہلے گام کا موسم قدرے خشک تھا۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی ہم سو گئے۔ عصر سے تھوڑی

دیر پہلے بیدار ہوئے۔ وضو کر کے چائے نوش کی اور بازار کی طرف نکل گئے۔ بازار کے ایک طرف دریا بہتا تھا جسے لدھرو کہتے تھے۔ دوسری جانب گنتی کی چند دکانیں تھیں۔ اس زمانے میں تیس پینتیس سے زائد نہ ہوں گی۔ امرنا تھ جی کی یا ترا کو جانے والے سادھو پہلے کام پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دریا کے کنارے امرتسر کے تاجروں کی تعمیر کردہ مسجد تھی۔ عصر کی نماز ہم نے اس مسجد میں ادا کی۔ اتنے میں ڈرائیور گاڑی لے آنا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو کر امرنا تھ جی جانے والی سڑک پر چھ سات میل گئے ہوں گے کہ آگے بارش کی وجہ سے سڑک خراب ہو چکی تھی، اس لئے واپس لوٹ آئے۔ مغرب کی نماز بھی اسی مسجد میں ادا کی۔ پھر ہوٹل کے لان آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کی نماز مفتی صاحب کی اقتدار میں ادا کی اور کھانا کھا کر سو گئے۔ اگلے روز ناشتہ کر کے سری نگر روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب دریا کے لدھرو کا نام پھول جاتے تھے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ موصوف بار بار مجھ سے پوچھتے ”کیوں بھی؟ اس دریا کا بھلا کیا نام تھا؟“ میں عرض کرتا ”لدھرو“ پھر خود بھی ایک دوبارہ یہ نام دہراتے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتے۔

اسی شام شیخ عبداللہ کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ موصوف نیڈو ہوٹل کے عقب میں ایک اینکس میں رہتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم ان کے ہاں پہنچے۔ ایک وسیع کمرے میں فرش نشست کا انتظام تھا۔ ہمیں وہاں بٹھایا گیا۔ چند منٹ بعد شیخ صاحب مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا اور کرتے کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی واسکٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کی تصاویر اور کارٹون بہت دیکھے تھے لیکن زندگی میں پہلی بار بالمشافہ ان سے اسی روز ملاقات ہوئی تھی۔ تصاویر کے برعکس ان کے چہرے پر بڑا بھولپن تھا۔ شیخ صاحب ہم سے ملے اور فردا فردا سب کی خیریت دریافت کی۔ اتنے

میں انگلستان میں مقیم چند کشمیری نوجوان ، جو آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے وہاں آگئے۔ ان کے آنے کے بعد کھانا شروع ہوا۔ شیخ صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ وازہ وان تیار کرایا تھا۔ ایک بڑی سینی میں ایلے ہوئے چاول ہمارے سامنے رکھے گئے۔ مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان آمنے سامنے بیٹھے۔ میں اور شیخ صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے۔ اکیس کورس کا وازہ وان تھا۔ جب وازہ ہمارے سامنے سالن لا کر ڈالتا تو شیخ صاحب اس سالن کا نام بتاتے۔ رات گیارہ بجے کے قریب یہ تقریب سعید و دلپذیر انجام پذیر ہوئی۔

اگلی صبح میں اور مفتی صاحب شاپنگ کے لئے بازار چلے گئے۔ عبدالسلام دیوہ نے ہمیں رعایتی نرخوں پر شالیں دلوادیں۔ شام کو مفتی بشیر الدین صاحب کے ہاں ہمیں وازہ وان کھلایا گیا۔ ایک روز مفتی صاحب کے کسی معتقد نے ایسا ہی پر تکلف کھانا ہمیں کھلایا۔ ایک رات رینیہ واڑی میں متو خاندان میں شادی کی تقریب تھی، ہم بھی اس میں مدعو تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کشمیری رسم و رواج کا مشاہدہ کیا۔

ایک دن مولانا محمد سعید مسعودی ہمیں ملنے آئے۔ ان کی وارٹھی بڑی طویل و عریض تھی۔ مفتی صاحب ان پر فقرے چست کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا ”حضرت! یہ کون بزرگ ہیں۔“ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ”بزرگ و زرگ کچھ نہیں یہ محمد سعید مسعودی ہیں۔ کافی عرصہ تک لوک سبھا میں کشمیر کی نمائندگی کر چکے ہیں، یہ بزرگی تو اب انھوں نے اپنے اوپر طاری کی ہے۔“ مولانا مسعودی بھی یہ فقرہ سن کر محفوظ ہوئے۔

قصہ کوتاہ ایک ہفتہ کشمیر میں قیام کر کے مفتی صاحب دہلی جانے کے ارادے سے رخت سفر باندھنے لگے۔ جانے سے قبل مدرسہ کے بارے میں

تجاویز لکھ کر شیخ صاحب کو بھجوانا تھیں، مجھ سے کہنے لگے، "میاں! یہ کاغذ اور قلم سنبھال لو۔ میں بولتا جاؤں گا، تم لکھتے جانا۔" مفتی صاحب نے رپورٹ لکھوائی۔ میں نے پڑھ کر سنائی۔ اس میں چند ترمیمات کیے اور مجھ سے فرمایا "اب اسے صاف کر کے لکھ دو۔" میں نے رپورٹ لکھ کر پیش کی۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور دستخط فرما دیئے۔ مفتی صاحب دہلی روانہ ہو گئے، میں مزید چند روز کے لئے سری نگر میں رک گیا۔ اب میں تھا اور مولانا ابوالعرفان۔ ہم نے جی بھر کر سری نگر اور اس کے مضافات کی سیر کی۔

(باقی)

اسلام کا اقتصادی نظام

تالیف: مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمن

ایک عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام معاشی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ نکالا ہے اور جس پر عمل کرنے کے بعد سرمایہ و محنت کی کشمکش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔

صفحات ۴۰۸ بڑی تقطیع قیمت -/۳ روپے

جلد -/۲ روپے

مندوة المصنفین، اردو بانا ر جامع مسجد دہلی

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(۲)

ڈاکٹر محمد یوسف، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قرآن ہی وہ کتاب ہے جو ہم کو ہماری فطری جذبات، فطری قابلیت اور اچھی زندگی کے اصول کو اجاگر کر کے اس پر عمل کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن گم کردہ راہ انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے:

فی قلوبہم مروطۃ اور وحی خداوندی اس مریض کی دوا ہے۔ شفاء لما فی الصدور۔ کہیں انہیں گمراہ لوگوں کے متعلق کہتا ہے علی قلوبہم اکتۃ کہیں فرماتا ہے: ام علی قلوب اقفالہا۔ دوسری جگہ ہے:

- ۱۔ البقرہ آیت ۱۰
- ۲۔ یونس آیت ۵۷
- ۳۔ بنی اسرائیل آیت ۴۶
- ۴۔ محمد آیت ۴۶

وَعَلَىٰ الْإِنسَانِ عَشَاوَةٌ ۱

ایک جگہ ہے ۱

فِي إِذَا نَحْمُ وَفَرٌ ۲

پھر دلوں کے غلاف وٹالے یہ آنکھوں کے پردے اور کانوں کی ڈاٹیں ان کی گراہی کی وجہ بن جاتے ہیں۔

وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مَّعْرُضُونَ ۳

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے بارے میں خود فرمایا ہے: ان هذه تذکرات
تذکرہ کے معنی وہ چیز جو بھولی بات یاد دلانے میں طرح کوئی شخص بھولی
بات کو یاد دلا کر کوئی نئی۔۔۔۔۔ نہیں بتاتا بلکہ اس بھولنے والے کے دماغ میں
چھپی ہوئی بات پم سے نیاں کا پردہ ہٹا دیتا ہے۔ اسی طرح وحی یا قرآن بھی سونے
فطرت انسانی کو جگاتی ہے۔ اس طرح دین اسلام ایک فطری دین ہے اس میں کسی قسم
کوئی تنگی یا سختی نہیں ہے۔ صاحب وحی صرف وہی شخص ہوتا ہے جس کو اس
لئے خاص کر دیا ہو، اس میں کسب و ہنر کا بالکل دخل نہیں۔ ایک صاحب وحی اپنے
فراست سے اس میں کی بیشی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن خود اس کو (نزل)
سے تعبیر فرماتا ہے۔ قرآن پاک کو ہم شروع سے آخر تک دیکھیں تو ہر مقام پر یہی
کہ آیات قرآنی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

۱۔ البقرہ آیت ۷۔

۲۔ محکم السجدہ آیت ۴۴۔

۳۔ الانبیاء آیت ۱۔

۴۔ المزمل آیت ۱۹۔

تنزیل العزیز الرحیم :-

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

تنزیل الكتب من الله العزيز الحكيم ۵ انا انزلنا اليك الكتاب بالحق ۶

اس پر کچھ لوگ یہ بے بنیاد شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شے اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہو تو قرآن نے خود ہی تمام شکوک کو رفع کر دیا۔

قل من كان عادوا لجبيل فانه نزل على قلبك باذن الله

مصدقاً لما بين يديه، وهدى لبشرى للمؤمنين ۷

حضورؐ نے جو ایک امی تھے جب اہل مکہ کو قرآن پاک کے ذریعہ توحید کی دعوت دی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ کلام تو ایک شاعر کا ہے، محمدؐ تو ایک جادوگر ہے، مجنوں ہے، کاہن ہے، غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ ایک مرتبہ تنگ آکر کفار مکہ نے سردار قوم عتبہ بن ربیعہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اس نے کہا:

اے محمد صلعم تم نے اپنی قوم کو بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے

تم نے ان کی جماعت کو پراگندہ کر رکھا ہے ان کی عقلوں کو

ناکارہ بنا دیا ہے، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے اور

ان کے دین کی مذمت کی ہے۔

حضور صلعم نے فرمایا: اے ابوالولید! پھر تمہارا کیا مقصد ہے؟

۱۔ الزمر آیت ۱-۲، پلین آیت ۵۔

۲۔ الزمر آیت ۱-۲۔

۳۔ المہقرہ - آیت ۹۷۔

عتبہ نے کہا: اے محمدؐ تم نے جو ڈھونگ رچایا ہے اگر اس سے مقصد دولت حاصل کرنا ہے تو ہم تمہارے لئے دولت جمع کر دیں، اگر عزت کی خواہش ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار بنالیں اور اگر تم پر کوئی اوپری اثر ہے تو اس کا علاج کرا دیں۔ آپ نے عتبہ کی بکو اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ سورۃ سجدہ کی کچھ آیتیں سنائیں جنہیں سن کر عتبہ کی عجب حالت ہو گئی اور وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ کفار کے اصرار پر اس نے کہا: اے قوم قریش تم میری بات مانو اور اس کے پیچھے نہ پڑو ورنہ اس کا یہ کلام بے اثر نہ ہوگا۔

اس طرح نہ جانے کتنے موقعوں پر دین اسلام کے مخالفین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ قرآن ایک موثر کلام ہے یہ نہ تو کسی جادوگر کا جادو ہے اور نہ کسی کاہن کی کاہنت۔ اب اس ایک مندرجہ بالا قصہ پر غور کیجئے کہ اہل مکہ کے جملے خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر کسی کے اوپر کسی شے کا اثر ہوگا تو کیا اس سے سوال کیا جائے گا کہ ”آپ کا علاج کرا دیں۔“ ان کے اس جملے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یقین تھا کہ محمدؐ برحق نبی ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں حقیقت ہے۔ مگر اگر اہل عرب اس حقیقت کو اتنی آسانی سے مان لیتے تو پھر ان کی ہٹ دھرمی اور ضد پر رتبہ نہ آ جاتا۔ اپنی انہیں خوبیوں کی وجہ سے اہل کفار نے عتبہ سے کہا: ابوالولید معلوم ہوتا ہے تم پر بھی جادو ہے۔“

اگر وحی کسب و ہنر سے حاصل کی جاتی تو رسول کے ماحول میں اور لوگ بھی بیوتے ہیں وہ ایسا کیوں نہیں کر پاتے اگر ایک شخص کسب و ہنر سے صاحب ہوگا۔

ہو سکتا ہے تو دوسرے کے لئے اس کا امکان کیوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن وحی ایک
اکتسابی نہ ہو کر ایک وہی چیز ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ اس ماحول میں سے
ایک برگزیدہ ہستی کو منتخب کرتا ہے۔

اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ ما یشاء ومن الناس ط ان اللہ
سمیع بصیرہ^۱

رسول جب وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے لوگ حیران ہوتے
ہیں کیونکہ نزول وحی کے ساتھ پیغمبر کی باتیں غیر متوقع ہوتی ہیں اور وہ گھبرا کر
غیر انسان سمجھنے لگتے ہیں جبکہ پیغمبر کی شخصیت بھی اللہ کے سامنے کوئی زیادہ اہم
نہیں۔

وَلَمَّا شَتَّالْنٰهُ هَبْنَا بِالَّذِیْ اَوْحِیْنَا اِلَیْكَ شَهَادَاتٍ
لِّكَ بِہٖ عَلَیْنَا وَكَلَامًا^۲

خود حضور کی ذات پاک کو وحی سے پہلے علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور
ایمان کسے کہتے ہیں۔

مَا كُنْتَ تَدْرٰی مَا بِالْكِتَابِ وَلَا الْاٰیْمَانِ^۳

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَقْلُوْا مِنْ قَبْلُ مِنْ كِتٰبٍ وَتَخْطُبُ بِیْمٰنِكَ^۴

۱۔ المؤمنون آیت ۷۵۔

۲۔ بنی اسرائیل آیت ۸۶۔

۳۔ الزخرف آیت ۵۲۔

۴۔ العنکبوت آیت ۴۸۔

حدیہ ہے کہ اس کی توقع تک نہ تھی کہ کتاب نہ پڑھنے والا صاحب کتاب ہو جائے گا۔

وما كنت ترجو ان يلقى اليك الكتاب الا هجرت من مدينتك
تاریخ اور قرآن شاہد ہے کہ پیغمبر اسلام اُمّی تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ محمدؐ کی تخلیق ہے۔ نہ جانے کتنے شرار، مبین اور کامیوں نے اپنے کلام کو قرآن کا مقابل بنا کر نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر دنیا نے اسے قبول نہیں کیا۔ آج تک کوئی بھی ایسا ثبوت مہیا نہ کر سکا کہ قرآن من جانب اللہ نہیں بلکہ انسانی کلام ہے حالانکہ اس سلسلے میں بڑی کوششیں کی گئیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے اس بات کو ہم ایک اور طرح سے سمجھا سکتے ہیں کہ جس طرح کسی چیز کا مالک اپنی چیز کی یا برتن بنانے والا اپنے برتنوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح اللہ پاک جو قرآن بلکہ ساری دنیا کا مالک ہے اپنے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے اور یہ وعدہ برحق ہے کہ آج چودہ سو سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے پر یہ وہ دلیا ہی ہے جیسا تھا انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصحاء عرب اور امراء نے قرآن کو مٹانے اسلام کو ختم کرنے کے لئے گال گلوچ، مار پیٹ اور لاپچ یعنی ہر طرح کی ناکام تدابیر کیں مگر جب صاحب قرآن نے لکھا کہ اگر یہ کلام یعنی قرآن منزل من اللہ نہیں ہے ایک انسانی کلام ہے تو تم سب مل کر ایک ہی سورد بنا لاؤ، یہ سن کر سب خاموش ہو گئے کیونکہ ایسا ان کے لئے ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ پاک نے اپنے کلام کی بنیاد

اس شان پر رکھی ہے کہ کیا باعتبار عبارت کیا باعتبار معانی و مطالب تمام مخلوق اس کی مثال بنانے سے عاجز ہے۔ اس میں کسی انسانی کلام کا گزیر نہیں۔ عام انسان تو عام ہے خود رسول کا اس میں ایک لفظ نہیں۔ جس جگہ بھی حدیث میں قرآن کا کوئی جملہ آگیا ہے وہاں دونوں کلام علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں جس حفاظت سے قرآن ہم تک پہنچا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ایسی مقدس ہستی (محمدؐ) نے پیش کیا ہے کہ جس کے وجود سے کسی کو انکار نہیں اور جس کی مقدس زندگی ہر قسم کے عیب پاک ہے قرآن وہ کتاب ہے جس نے انتہا درجہ کے تاریک زمانہ میں نازل ہو کر دنیا میں ظاہری و باطنی روشنی پھیلانی اور علم و ادب، عدل اور تہذیب و تمدن کا علم بلند کیا۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کی شرح صد ہا علوم وجود میں آئے۔ *Life of Mohammed* کا مؤلف لکھتا ہے :

”دنیا میں آسمان کے نیچے قرآن کے علاوہ اور کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے جس کا متن ابتداء سے لے کر اس وقت تحریف سے پاک ہو۔“

قرآن وہ کتاب ہے جو ایسی زبان میں ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور یہ زبان دنیا کی زبانوں میں سے سب سے زیادہ وسیع باقاعدہ اور خوبصورت ہے۔ قرآن خود صاف لفظوں میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے ہوں اور خدا کا کلام ہوں۔

دوسری آیت اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہے:

وَهْدَىٰ وَهْمَهُ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۚ

قرآن کے نزدیک ہر انسان برابر ہے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ نظام حیات میں انسان کی انفرادی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ انفرادیت اور اجتماعیت کو ایک دوسرے سے اس طرح غلط ملط کر دیا گیا ہے کہ باہمی تعاون و تناصر اور نظم و ضبط کی ایک بے مثال فصاحت جاتی ہے اور اس فصاحت میں ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا موقع ملتا ہے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے اس میں کسی کی طرفدار کی مقسود نہیں ہوتی۔ قرآن انسانی تقسیم صرف کفر و ایمان پر کرتا ہے اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی بلکہ یہ تفریق اس طرح ہوتی ہے کہ قرآنی اصولوں کو ماننے والی ایک جماعت اور اس کے خلاف جانے والی دوسری جماعت ہوتی ہے۔ اس تفریق کی بنیاد صرف انداز فکر و عمل پر ہوتی ہے۔ مذہب اسلام نے اسی وحدت فکر و عمل کی بنیاد پر مساوات کی اتنی بلند عمارت کھڑی کی ہے کہ اہل مغرب اسے عیسائی مساوات سے بہت بلند مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم ڈی سیٹ ٹیلر کہتا ہے:

اسلام کی بڑی خوبی اس کی مساوات ہے۔ اسلام سے قبل کوئی یہ جانتا

بھی نہ تھا کہ مساوات کیا ہے؟ مگر اسلام نے اللہ کی کل مخلوق کو

خواہ وہ کسی رنگ و نسل کے ہوں اس کا معنوی گنبد قرار دے کر

برابری عطا کر دی ہے اور یہ اسلام کا اتنا بڑا احسان ہے جسے
دنیا شاید کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔“

اسی حقیقت کا اعتراف Dr. Maude Royden نے اپنی کتاب
The Problem Palestine میں کیا ہے۔

تعجب تو اس بات کا ہے کہ یہ انقلابی نظام حیات اس زمانے میں پیش کیا گیا
جبکہ تمام دنیا میں تصورات زندگی بالکل اس کے برعکس تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس
وقت لوگوں نے اس نئے انقلاب کی ہر طرح مخالفت کی مگر اس مخالفت کا نتیجہ صفر
ہی رہا، بلکہ اب انسان ایک طویل مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اصول حیات
کی طرف آرہا ہے جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اب بھی کچھ لوگ عقل
کو رہبر مان کر زندگی کی راہوں پر چلتے ہیں مگر کچھ غرور بعد وہ خود ان اصولوں کے ہاتھوں
تنگ آکر انہیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں جس میں اسے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں لیکن
جب بھی انسان آگ و خون کے دریا میں سے ابھر کر نکلتا ہے تو خود بخود اس نظام
حیات کی طرف بڑھتا ہے جس کی کرن جیٹھ سدھی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمین
عرب میں پھوٹی تھی۔ ان تمام حقائق کو انگریز سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا
کہ انسانیت غیر فطری طرز زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمانے کے بعد اور اسے
تاریک پانے کے بعد وحی یا قرآن کے چراغ کی طرف کھینچی آرہی ہے۔ کیا اتنے
تمام حقائق پر مبنی ثبوت مل جانے کے بعد وحی یا قرآن کے متعلق کسی اور دلیل کی
ضرورت ہے۔

چودہ سو سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا تھا کہ اس تعلیم فطرت

اور دین فطرت کو اس لئے نہ جھٹلاؤ کہ یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی (کیونکہ تمہاری آنکھوں اور دلوں پر جہالت کے دبیر پردے پڑے ہوئے ہیں جو دھیرے دھیرے ہٹیں گے) یہ تو سرتاپا بصیرت و حکمت پر مبنی ہے۔ اسی لئے جوں جوں انسان کی عملی و عقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ کتنا سچا ہے مگر اس کے باوجود یورپ نے پورے طور پر قرآن کے نظام کو نہیں اپنایا ہے بلکہ کہیں کہیں سے مستعار لے لیا ہے۔ وحی کے متعلق طرح طرح کے سوالات ذہنوں میں اٹھ کر اب بھی انسان کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔ یہ سب ایمان کے فقدان کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے آج ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے۔ انسانوں کو ذہنی و داسکون میسر نہیں ہے۔ صحیح و نیک عمل کے لئے ایمان بہت ضروری ہے اور ایمان صرف اس چیز پر لایا جاتا ہے جو حق اور ہر اعتبار سے بلند ہو اور ایمان ہی کے صحیح و صادق ہونے پر مذہب کا صحیح و صادق ہونا موقوف ہے۔

وحی کے لغوی معنی اشارہ و کرنا، پیغام دینا اور دل میں ڈال دینا وغیرہ ہے۔ لفظ استعمال کے لحاظ سے دیگر معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ حیوانات اپنی جسمی قوتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں قرآن میں اس کے لئے بھی لفظ وحی استعمال ہوا ہے مثلاً (ادھی ربك الى النحل)۔ اسے وحی نظری کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کی دوسری کیفیات وجدانی ہوتی ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وارد محترمہ کے متعلق ہے ان ادحینا الى اهلك مایوسی۔

۱۔ النحل آیت ۶۸۔

۲۔ معارف القرآن، غلام احمد پرویز جلد ۲ ص ۲۸۳

۳۔ ظہر۔ آیت ۳۸

اس کے بعد وحی کی آخری شکل ہے جو بنی نوع انسان کے لئے بطور ضابطہ حیات ہے اور قانون زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوئی۔ اور قرآن پاک اس وحی کا نام ہے۔ اس وحی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا میں انسان کو ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور آخر میں مکمل شکل میں قرآن کریم محفوظ ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے انسانی رشد و ہدایت کا نصاب بن گیا۔ وحی ہر رسول پر نازل ہوئی۔ انبیاء کرام اسی وحی کے ذریعہ انسانوں کو ان کے اعمال کے انجام سے آگاہ فرماتے تھے، انسان کو بھینے کا طریقہ بتاتے تھے۔ رسول کا کام صرف وحی کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اس پر عمل کر کے ایک نمونہ بن کر دکھانا پڑتا تھا کیونکہ یہ مشہور مقولہ ہے کہ اپنے قول پر پہلے خود عمل پیرا ہو تب کسی کو اس کا سبق دو یہی بات اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ

اگر کسی کتاب یا گروہ کی صداقت و بلندی کا اندازہ لگانا چاہے تو ہمیں چاہئے کہ اس کے لکھنے والے بانی یا لیڈر کے کردار اور زندگی کو پرکھیں کیونکہ ہر چیز اپنی اصل پر ہے۔ اگر ہم کو قرآن کی صداقت کا پتہ لگانا ہے تو ہمیں اس کے لانے والے کی زندگی اور کردار کو ہر کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ رسول کی زندگی خود اس کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ اس کی تعلیم منزل من اللہ ہوتی ہے۔ جب رسول سے ان کی صداقت کی دلیل مانگی گئی تو آپ نے فرمایا کہ میں تم میں سے ایک انسان ہوں نہ کبھی کسی معلم سے پڑھا نہ کبھی کسی ادبی محفل میں شامل ہوا جسے تم بخوبی جانتے ہو تو کیا یہ تمہارا جاننا

صدائق کا ثبوت نہیں کیا کوئی ان پڑھ اور ایسا شخص جو میرے جیسے حالات میں پیدا ہوا ہو اور تربیت پائی ہو قرآن جیسی کتاب پیش کر سکتا ہے۔ نبوت سے پہلے اور بعد کی تاریخ اس کی شاید ہے کہ آپ نے کبھی کسی شخص سے جھوٹ مذاقاً بھی نہ بولا تو کیا آپ خدا اور اس کی وحی کے متعلق جھوٹ کہہ سکتے تھے ان باتوں پر اگر ہم دل سے غور کریں تو جواب نفی میں ملے گا۔ آپ کی صداقت کے آپ کے دشمن بھی معترف ہیں۔ انھیں لوگوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے :
 فَانْهَرُوا لِيَكُنْ بُرْهَانٌ لَكُمْ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بَايَتُوا اللَّهَ يَحْمِلُونَ - قرآن
 کو آپ اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ انھیں الفاظ میں پہنچا دیئے تھے جو قرآن کی طرف سے نازل ہوتے تھے حتیٰ کہ لفظ قل بھی جیسے قل هو الله احد۔ ہاں جب کبھی آپ اپنی گفتگو میں قرآنی باتوں کے ذریعہ تبلیغ کرتے تو لفظ قل نہ فرماتے بلکہ مقصد بیان کر دیتے جیسا کہ قیصر وغیرہ کے خطوط میں آپ نے فرمایا :
 يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا خَالِدُكُمْ آيَةُ لَفْظِ قُلْ مِنْ شُرُوعٍ هُوَتْ -
 خود قرآن پاک کے ذریعہ یہ ثابت ہے کہ قرآن محمدؐ کا کسب ہنر نہ تھا بلکہ
 خدا نے اس کے ذریعہ آپ کی تربیت کی اور علم سکھایا۔
 وَانْزِلْ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ
 تَكُنْ تَعْلَمُ -

۱۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۲۵۶۔

۲۔ الانعام آیت ۳۳۔

۳۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۲۵۶۔

۴۔ بنی اسرائیل آیت ۵۵۔

یہی قرآن آپ کی فروگزاشتوں کو درست کرتا تھا کبھی نرمی کے ساتھ
..... تو کبھی سختی کے ساتھ قرآن میں خدا اپنے رسول کو مخاطب
کر کے کہتا ہے :

ان الازقناك ضعف الحیاة وضعف المہات ثم لا تجدك
نصیرا۔ اللہ نے اس آیت میں ایک عام انسان کی طرح اپنے رسول کو مخاطب
کیا ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بھی انسان ہیں اور یہ جملہ دیا کہ ان
سے بھی بھول ہو سکتی ہے۔ خدائے پاک قرآن میں جا بجا اپنے رسول کو اسی بات
کی نصیحت کرتا ہے جس کی نصیحت لوگوں کو کرنے کے لئے چاہتا تھا۔
قرآن کو خدائی ہونے کے بارے میں ساری دنیا کو چیلنج دیا کہ فاقوا سورۃ
من مثله۔ چنانچہ ساری دنیا ہٹکا بٹکا رہ گئی۔ چنانچہ جب مشرکین نے حضور سے
اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لانے کا مطالبہ کیا تو خدا نے آپ کو
حکم دیا۔

قل ما یكون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان ابع ا لا
ما یوحی الی۔

میں تم میں پورے چالیس برس سے جی رہا ہوں نہ علم میں نہ زبان میں
تم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ قرآن میں
اپنے دل سے بنایا ہے اور جب چاہوں اسے بدل کر دوسرا قرآن پیش کر دوں

۱۔ بنی اسرائیل آیت ۷۵۔

۲۔ یونس آیت ۱۵۔

۳۔ وحی محمدی رضا ص ۴۶۵

اس سلسلے میں ایک اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیوی حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی جس میں منافقوں کے ساتھ بعض مومنوں نے بھی یقین کر لیا تھا۔ یہ تہمت آپ کے لئے اب تک کی تمام تکالیف میں سب سے بڑی تھی۔ بہت دنوں تک وحی کا نزول بند رہا۔ پھر حضرت عائشہؓ کی برأت میں سورہ برأت نازل ہوئی۔ اگر نزول وحی میں حضور کی ذاتی استعداد کو دخل ہوتا تو اس بڑی مصیبت میں وحی ہرگز اتنے روز بند نہ ہوتی۔ چنانچہ بہت پہلے ہی کوئی ایک آیت بنا کر (غیر ذی اللہ) اپنے دل کو سکون بخشتے اور منافقوں کی زبان پر قفل لگا دیتے۔

یہ سچ ہے کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو اللہ نے ایک مخصوص طریقہ سے اپنے رسول کو ادا کی۔ دنیا کے تمام دانشوران محمد صلعم جیسا کوئی دوسرا انسان پیدا نہ کر سکے اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ تو کیا ان کی یہ بے بسی اس دعوے کے لئے کافی نہیں؟ اس وحی کو جھٹلانے کے لئے مشرکین و منکرین نے جو کچھ بھی کہا ہے ان میں سے بعض خود تاریخ پر تہمت ہے اور بقیہ باطل ہے۔ آج صدیاں گزر جانے کے بعد کسی یقینی دلیل سے اس کی بنائی ہوئی کسی خبر کی تردید و تکذیب نہیں ہو سکی مثلاً قرآن نے کائنات کے مادے کو دھان کہا ہے جو سائنس کی اصطلاح میں ایٹم ہے اور فرمایا کہ آسمان و زمین دونوں فقار تھے یعنی ایک ہی مادہ تھے جو باہم پیوست و متصل تھا پھر خدا نے ہر ایک کو جدا جدا صورت دیدی اور ان میں جاندار پھیلا دیئے اور فرمایا کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا ہے اور یہ کہ خدا نے کام نباتات و حیوانات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔^۱

اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآن پاک سے دی جاسکتی ہیں۔ قرآن نے اجتماعی زندگی کے مختلف قانون بھی بنا دیئے ہیں۔ قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنیادیں قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں صرف اخلاق انسانی کی اصلاح کے لئے بہترین رہنمائی موجود نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف، انتظامی معاملات اور مالیات کے بارے میں قوانین موجود ہیں اور جس کی بنیاد خدمتِ خلق اور خدائے واحد کے یقین پر قائم کی گئی ہے۔

ہمارا ایمان ہونا چاہئے بلکہ ہے کہ قرآن کتاب اللہ ہے، کلام اللہ ہے۔ یہ انسانی پیداوار نہیں، یہی تو کتاب ہے جس میں تمام بنو نوع کی رشد و ہدایت ہے۔ اس میں وہی حقائق بیان کئے گئے ہیں جن کے مسدقات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ قرآن کی پیش کردہ مساوات اور اخوت کسی ملک و قوم یا کسی رنگ و روپ کو نہیں دیکھتی۔ آج دنیا میں صرف قرآن ہی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے کہ وہ جس طرح جس زبان میں نازل ہوئی اسی میں محفوظ ہے۔ اس حیثیت کی کوئی کتاب آج دنیا میں موجود نہیں۔

اگر کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس کے نتائج سے لگایا جاسکتا ہے یعنی اس بات سے کہ آدمی کے سو بھاؤ کے گہرے سے گہرے اور اچھے سے اچھے پہلوؤں پر کیا اثر پڑا تو ضروری ہے کہ قرآن کو دنیا کی عظیم سے عظیم کتب میں ایک منفرد درجہ دیا جائے۔

فرانسیسی دانشوروں کے قرآن کے بارے میں الفاظ ہیں:

"It is therefore The first
Arabic Prose work - one that

raised The idiom of That being
to the right of a civilized -
while at the same time its dec-
lamatory style provide a
rhythm and an inspiration
for the whole of Moslem life."

آرتھر جیفری کہتا ہے:

"The scripture of no other com-
munity, not even The old testa-
ment among The Jews, has had
quite The same influence on
the life of the community as
the Quran has had in
Islam."

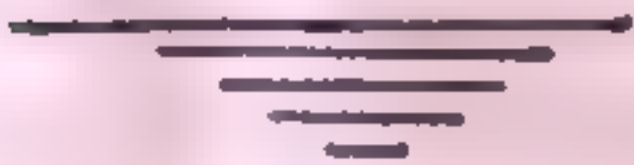
اس طرح اہل اسلام کے ساتھ ساتھ بعض غیر قوم کے دانشوروں نے
بھی قرآن کو دوسری کتب آسمانی سے بڑا مانا ہے اور بالفاظ دیگر یہ ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے مگر پھر بھی لوگ اس

Dominique Soudeh Translated by -
Dunglass cult. Islam.

The Quran as scripture. Arthur Jeffery -

اس حقیقت کو جھٹلانے میں عار نہیں سمجھتے۔ حضورؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے فوراً بعد بہت سے لوگوں نے قرآن کو جھٹلایا جن میں مسلمہ اور متنبی وغیرہ کا نام مشہور ہے۔ ان لوگوں نے اپنی شاعری کے مجموعہ کو قرآن کا مثل بنا کر پیش کیا۔ لیکن زمانے نے اس کو قبول نہیں کیا۔ صرف انہیں پر کیا موقوف ہے شیطان نے تو قیامت تک اللہ سے مہلت مانگ رکھی ہے۔ ہر دور میں ایسے ولید اور مسلمہ پیدا ہوتے رہیں گے جو قرآن کو اکتسابی ہنر بنا کر خود اس کے مدعی بن بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وحی نہ تو کسب و ہنر سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی انسانی قوت و فکر سے۔ یہ تو خالص وحی اور منزل من اللہ ہے۔ اللہ پاک خود فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ابْنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ
الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۖ



جامع مسجد رام پور

جناب محمد شاعر اللہ خاں صاحب، انگری باغ رام پور

علم پور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں بہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم

غالب

شہر مصطفیٰ آباد جو ریاست رام پور کے نام سے جانا جاتا ہے ہمیشہ سے مرکز علم و فن اور گہوارۂ تہذیب رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کو اگر آپ ہندوستان کے نقشہ پر دیکھیں گا ارادہ کریں تو کافی جستجو اور تلاش کے بعد چند نقطوں سے زیادہ طول و عرض نہ دیکھ پائیں گے۔ پھر اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ۱۷۷۳ء میں نواب فیض اللہ خاں صاحب نے اس کو پایۂ تخت قرار دے کر باقاعدہ آباد کیا تھا۔ اس حساب سے اس کی عمر صرف دو سو نو سال کی ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں اس مختصر سی آبادی نے اپنا نام عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ہے اور محتاج تعارف نہیں رہی۔ جس کی پہلی وجہ تو خدائے برتر کا کرم اور علمائے کرام و خاصانِ خدا کا وجود مسعود ہے اور دوسری وجہ تعلیم دین اور شاعر اسلام سے دلچسپی و رغبت کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اہل علم نے اپنی زبان و قلم سے کبھی اس خطۂ رام پور کو

راموش نہیں کیا ماضی قریب میں بھی اور ماضی بعید میں بھی۔

احقر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہاں اوراق پر آن منتشر حالات و واقعات کو جا کرے جن کا تعلق اسلام کی اس عمارت سے ہے جو ہر مسلم آبادی کے لئے ضروری ہے۔ جسے مسجد الجامع کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عذران پر اب تک باقاعدہ نہیں لکھا گیا ہے بلکہ عمارات رام پور کے تحت ذیلی طور سے بہت مختصر تعارف کرایا گیا ہے اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ مفصل طور سے اس پر لکھا جائے چنانچہ اب تک کی مائل شدہ معلومات کو سپرد قلم کر رہا ہوں۔

جامع مسجد رام پور کی بنیاد عہد فیض اللہ خانی سے مانی گئی ہے جس کو اکثر مصنفین تسلیم کیا ہے لیکن کسی نے تاریخ کا تعین نہیں کیا ہے۔ نجم الغنی خاں (م ۱۹۳۲ء) لکھتے ہیں:

نواب (فیض اللہ خاں) صاحب کے عہد میں مسجد میں بکثرت

تعمیر ہوئیں جامع مسجد قدیم انھیں کی تعمیر کرائی ہوئی تھی۔“

تیرہ مئی (م ۱۹۰۰ء) بھی اسی طرح کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عہد دولت میں مسجد میں بکثرت تعمیر ہوئیں اور ایک مسجد ایسی

عالی شان بنی کہ اس سرزمین پر بے نظیر ہے حسن نیت سرایا برکت

سے آج تک دن رات مصلیوں کی جماعت سے رونق پذیر

ہے۔“

ریخ کے تعین کے سلسلے میں پہلی بار کلب علی خاں قائل رام پوری نے اپنے مضمون

مدرسہ عالیہ رام پور میں یہ انکشاف کیا ہے کہ میرے مرحوم چچا احمد رضا خاں (ولادت

۱۸۸۸ء وفات ۱۹۷۲ء) نے بتایا کہ جامع مسجد فیض اللہ خانی کے دروازہ کی محراب

میں مصرع تاریخ کندہ تھا،

یک مسجد فیض کعبہ نو "۳۳"

۱۱۸۰ھ

ہجری سال ۱۱۸۰ کا عیسوی ۱۷۶۶ء برآمد ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ رام پور کے پایہ تخت قرار پانے سے پہلے اس کی تعمیر ہوئی۔ اس کا مزید ثبوت جسٹس ارشاد اللہ خاں (م ۱۹۷۹ء) کی تحریر سے بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

نواب فیض اللہ خاں صاحب مع مولوی (غلام جیلانی خاں) صاحب اور دیگر پٹھانوں کے سرداروں کے ساتھ رام پور آئے تو انھوں نے رام پور شہر میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ ۳۳

فیض اللہ خاں کے رام پور آنے سے مراد وہ وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ اور ان کے بھائی عبداللہ خاں احمد شاہ ابدالی کی قید سے اپنے والد علی محمد خاں کے انتقال سے تین سال بعد ۱۷۵۲ء میں رام پور آئے تھے اور یہ مسجد انھوں نے ورود رام پور کے دس پندرہ سال بعد بنوائی ہو۔ اس طرح سال ۱۱۸۰ھ کی صحت پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

اس مسجد کی بنیاد ہمیشہ علما و صوفیاء کے ہاتھ سے رکھی جاتی رہی ہے چنانچہ فیض اللہ خاں مسجد کی بنیاد کے سلسلے میں ایک واقعہ کی کتاب حالات خاندان مولوی غلام جیلانی خاں مصنفہ جسٹس ارشاد اللہ خاں میں ملتا ہے۔ ۳۴

اس کے علاوہ اس مسجد کی بنیاد رکھنے والوں میں حافظ سید محمد ایوب صاحب بھی تھے جو قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۳۵

بہر حال یہ خوبصورت جامع مسجد ۱۱۸۰ھ میں تیار ہوئی جو اس وقت کی آبادی اور شاندار رہائشی عمارتوں کے لحاظ سے یقیناً بے مثل رہی ہوگی۔

منشی امیر اللہ تسلیم (م ۱۹۱۱ء) اس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اسی عہدِ دولت میں شام و سحر

بنیں مسجدیں جا بجا بیشتر

خصوص ایک مسجد ہے وہ دل پذیر

نہیں جس کا ہندوستان میں نظیر ۷

لیکن جب آبادی میں اضافہ ہوا اور رہائشی عمارتوں نے شان و شوکت اختیار کی تو خدائے برتر کی عبادت کے گھر کی توسیع اور تعمیر جدید کی بھی ضرورت پیش آئی چنانچہ جامع مسجد کو وسیع کرنے کے لئے برابر کی جگہ حاصل کی گئی اور اس جگہ پر ایک خوشنما دالان کے پانچ دروازوں والی لاثانی عمارت تعمیر کی گئی جس پر تین گنبد اور چار مینار تعمیر کئے گئے جن پر کلس ہائے طبع طلائی نصب کئے گئے اس طرح یہ مسجد الگ مکمل حیثیت کی الگ ہو گئی اور جامع مسجد کہلائی۔ ”کلب علی خاں (م ۱۸۸۷ء) نے قدیمی جامع مسجد کے برج گرا دیئے اور وہ اس کی بغل میں سما گئی۔“ ۸

اس نو تعمیر کے بارے میں نجم الغنی خاں صاحب رقم طراز ہیں کہ

”کلب علی خاں نے ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ۲۲ شعبان ۱۲۹۱ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو علماء و فضلاء اور اولیاء شہر کے ہاتھ سے اس کی بنیاد کی اینٹ رکھوائی اور ۱۲۹۲ھ میں بن کر نیا رہ گئی۔ عمارت خوشنما اور وسیع تھی جس کے معمار کی تعداد نو اسی ہزار دو سو تینتیس روپے پونے دو لاکھ تھی۔ تفصیل اس کی یہ ہے: تعمیر میں بیاسی ہزار آٹھ سو چار روپے سوائین آنے۔ کلس ہائے طبع طلائی چھ ہزار چار سو اٹھارہ روپے ساڑھے چودہ آنے۔“ ۹

لیکن ایوب قادری صاحب نے اپنے ایک مضمون عماراتِ روئیں کھنڈ میں امپیریل گزیٹیر
جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۳ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ کلب علی خاں نے جامع مسجد کی تعمیر
پر تین لاکھ روپے صرف کئے تھے۔

منشی امیر المذلت سیم اس تعمیرِ جدید کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں :

سراپا دلہن کی طرح دلِ کریم
ملک دیکھ کر دل میں ہوں ناشکیب
وہ تعمیر کی مسجد لا جوا اب
کہ عالم میں نکلے نہ جس کا جواب
یہ رفعت نہ دیکھی سنی خواب میں
کہ نہ چرخ سا جد ہیں محراب میں
فضا صحن مسجد کی ایسی کہ دل
تمنائے جنت سے ہو منفعل
اگر آنکھ پڑ جائے دیوار پر
صفا سی نظر آئے عکسِ نظر
وہ پائی ہے عظمت کہ میں کیا کہوں
بجا ہے اگر گھر خدا کا کہوں
ہزاروں مسلمان اہل نیاز
جماعت سے پڑھتے ہیں باہم نماز
مقرر ہیں روز و شب و صبح و شام
خطیب و مؤذن مکبیر امام

مسجد کے آئین میں داہنے اور بائیں جانب کمرے بنائے گئے جن میں ۱۹۰۰ء کے قریب

۴۶
مدرسہ عالیہ بھی آگیا تھا جو ۱۹۱۲ء تک رہا اور پھر گنج قدیم میں منتقل ہو گیا جہاں سے ۱۹۲۹ء میں یہ کلب گھر کی عمارت میں منتقل ہوا اور اب تک وہیں ہے۔

ایک صدر دروازہ تعمیر کرایا جس پر ایک گھنٹہ دو روپہ نصب ہے کہ اندر اور باہر والے ایک ساتھ اس میں وقت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ گھنٹہ ۱۸۷۶ء میں خصوصی طور سے پرنس آف ویلز کے لئے بنایا تھا اور اسے لندن کی جے بی بینسن کمپنی نے بنایا تھا جو بزرگوں کی روایت کے بموجب کلب علی خاں صاحب نے لندن سے سیکنڈ ہینڈ منگوا یا تھا اور یہاں لگوا یا۔ اس گھنٹہ پر دو تختیاں نصب ہیں جن پر یہ تحریر ہے:

پہلی تختی

*Watch and Clock Maker by special
Appointment To H. R. H. The Prince
of Wales*

دوسری تختی

*J. B. Benson Ludgate Hill and old
Bondst LONDON.*

اس گھنٹہ کی آواز میلوں دور تک سنی جاتی ہے۔ بزرگوں کی زبان سنا ہے کہ نواب کلب علی خاں خود بھی نماز جمعہ کے لئے مسجد شریف لاتے تھے۔

زمانہ کے شب و روز گزرتے رہے بالآخر نواب حامد علی خاں کی نوابی کا زمانہ آیا جنہیں تعمیرات کا بے حد شوق تھا۔ حسن اتفاق سے انہیں کرنل رائٹ نامی ایک فرانسیسی انجینئر مل گیا جس کے ذریعہ انہوں نے تعمیرات کا کام کرایا۔

رام پور کی اکثر سرکاری عمارات اندرون قلعہ رنگ محل، حامد منزل (رضا لاٹری میں)
 پچھلی بھون (گرلز ڈگری کالج) امام باڑہ و مسجد اندرون قلعہ صدر کچہری
 کوٹھی خسرو باغ (رضا ڈگری کالج) کوٹھی شاہ آباد، کوٹھی بے نظیر، کوٹھی
 خاص باغ، اسٹیٹ ہائی اسکول (حامد انٹر کالج) وغیرہ سب اسی عہد کی یادگار
 ہیں۔ ان تمام تعمیرات کے ساتھ نواب حامد علی خاں نے جامع مسجد کو بھی از سر نو تعمیر
 کرائے کا ارادہ کیا۔ اخبار دبیرہ سکندری لکھتا ہے :

”نواب غلام اشیاں (کلب علی خاں) کی تعمیر کردہ جامع مسجد
 جو اب مخدوش حالت میں تھی نواب حامد علی خاں نے اپنی
 غلوہمتی سے براہ رعایا نوازی منہدم کرا کے از سر نو نہایت
 خوشنما و شاندار جامع مسجد تعمیر کرائے کے لئے کئی لاکھ روپے
 کی منظوری صادر فرمائی اور انہدام کا کام شروع ہو گیا
 اور طے پایا کہ مسجد کی تعمیر کی تکمیل تک نماز جمعہ
 موتی مسجد میں ہو۔ چنانچہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق
 ۱۵ نومبر ۱۹۱۲ء کو پہلی مرتبہ نماز جمعہ موتی مسجد میں ہوئی۔
 موتی مسجد جامع مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے
 اور کافی وسیع ہے اور مسجد کے اندر حوض بھی
 ہے۔“

جامع مسجد منہدم کے برابر قدیمی جامع مسجد تھی جسے نواب فیض اللہ خاں صاحب
 نے بنوایا تھا۔ نواب کلب علی خاں نے ۴ ۱۸۷۷ء میں تعمیر نو کے وقت اس کا
 الگ وجود پر قرار رکھا تھا لیکن نواب حامد علی خاں نے اس موقع پر اس مسجد
 کا کچھ حصہ موجودہ جامع مسجد میں شامل کر دیا اور باقی حصہ کو الگ ایک

دالان کی شکل میں چھوڑ دیا جس میں عورتیں اب بھی جمعہ کے روز نماز ادا کرتی ہیں۔

میرے نانا خطیب اعظم حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحب (م ۱۹۸۷ء) نے میرے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ قدیمی جامع مسجد کا کچھ حصہ شامل کرنے سے جامع مسجد کا دالان تو ضرور وسیع ہو گیا لیکن صحن ٹیڑھا ہو گیا جس سے اس کی خوبصورتی جاتی رہی۔ اگر حامد علی خاں پرانی مسجد کو اس میں شامل نہ کراتے تو اس کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل ہوتی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صحن کی ٹیڑھ مسجد کی خوبصورتی پر اثر انداز ہے۔

الغرض مسجد کی تعمیر کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔

نواب حامد علی خاں نے چاہا کہ نماز جمعۃ الوداع اپنے قدیمی مقام پر ہو اور مسلمانوں کو عظیم الشان جماعت کے برکات حاصل ہوں۔ لہذا شب و روز تعمیر کا کام کرایا گیا اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء کو نماز جمعۃ الوداع جدید تعمیر شدہ جامع مسجد میں پورے اسلامی کرد فر اور شان و شوکت کے ساتھ ہزار ہا مسلمانانِ رام پور نے ادا کی۔^{۳۷}

اس کے اختتام پر عبدالحکیم خاں مضطر نے یہ تاریخ لکھی:

شاہ اورنگِ عدالت نور چشم دین و داد
ظیلِ او بر فرقہ بادا الہی دامن
مسجد جامع وسیع و دافع تعمیر کرد
فی المثل گوئی کہ بر فرش ست عرش کبریا
طرفہ تاریخہ مضطر باقی القانود
از سر ذکر و صلوة و منبر و بانگ و دعا^{۳۸}

جامع مسجد کا محل وقوع بہت عمدہ ہے۔ چاروں طرف بازار ہے اور قلبِ شہر میں واقع ہے۔ شمالی جانب میں قلعہ معلیٰ ہے نیچے بازارِ صرافہ ہے۔ جنوب مشرقی میں بازارِ صفدر گنج ہے۔

مسجد کافی وسیع ہے اندرونی حصہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ساڑھے تیرہ ہزار افراد آسانی نماز یا جماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اندرونی حصہ میں سنگ مرمر کا سیفہ کالا فرش شطرنج کی بساط کی طرح بچھا ہوا ہے جو ہر زمانہ میں ٹھنڈا رہتا ہے اور اس پر خوبصورت دریاں کھینچی رہتی ہیں، مسجد کے درمیانی حصہ میں تین شاندار منبت کاری کی سنہری و روپہلی کام سے مزین محرابیں ہیں۔ بیچ میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور دائیں بائیں پتھر کے تراشیدہ خوبصورت منبر ہیں۔ ابھی حال میں بیچ کی محراب میں رنگین ٹائلز (TILES) لگ گئی ہیں جن سے محراب کی رونق دو بالا ہو گئی ہے مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے کے لئے محرابی شکل میں بہترین کی منبت کاری سے مزین طویل و عریض سات شاندار دروازے ہیں، درمیان دروازہ نسبتاً بڑا ہے۔ سب پر انتہائی شاندار تانبہ کے کوارٹر جڑے ہوئے ہیں۔ اندرون حصہ کے درمیان میں خوبصورت قسم کے چھ ستون ہیں پہلے ان پر پلاں اور رنگ کیا ہوا تھا ابھی ۱۹۸۰ء میں ان پر مزیک (MOSAIC) کیا گیا۔ جس سے اس کی خوشنمائی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ان ستونوں کے درمیان سنہری کام کے بہت عمدہ بلوری جھاڑ زنجیروں کے ذریعہ چھت میں آویزاں ہیں ان پر سونے کا پانی کیا ہوا ہے اور بجلی کے بلب نصب ہیں۔ اس کے علاوہ خانہ تعداد میں بجلی کے پتکے بھی آویزاں ہیں جو گرمی کے زمانہ میں نازلوں کو بہت آرام پہنچاتے ہیں۔

مسجد کا صحن بھی بہت وسیع ہے جس میں تقریباً ڈھائی ہزار افراد بیک

ازاد کر سکتے ہیں اس کا فرش سرخ پتھر کا ہے۔ درمیان صحن میں دو خوبصورت کھمبے نصب ہیں جن پر روشنی کے لئے لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ پورے صحن میں رید کھمبے بھی نصب ہیں جن پر تار کھینچے ہوئے ہیں ان پر دھوپ وغیرہ سے بچنے کے لئے سائبان لگا دیئے جاتے ہیں۔ شرقی جانب صدر دروازہ مسجد کے مناسب ورثاندار طریقہ پر بنا ہوا ہے۔ اس پر کھنڈ بھی نصب ہے۔ وضو کرنے کے لئے جنوب کی سمت میں کافی وسیع و مرلیض حوض بھی ہے جس کے نیچے میں دو فوارے نصب ہیں اس میں رنگین پھلیاں تیرتی رہتی ہیں اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایک شکی بھی بن گئی ہے جس سے نمازیوں کو مزید آسانی ہو گئی ہے۔

صدر دروازے کے علاوہ دو چھوٹے دروازے ایدر بھی ہیں جو ہر وقت آمد و رفت کے لئے کھلے رہتے ہیں ان میں تحصیل کی جانب کے صدر دروازہ کی تعمیر جدید اگست ۱۹۳۹ء میں ہوئی ہے۔ جنوب مشرقی جانب میں اذان دینے کے لئے ایک میزبن (اذان گھر) ہے جہاں سے اذان لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ دیا جاتی ہے، لاؤڈ سپیکر نظام یہاں ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا۔

جامع مسجد کی ایک خاص تقریب جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو ہوتی ہے اس میں قرآن خوانی، قل اور جلسہ سیرت کے پروگرام مرتب ہوتے ہیں بعد ازاں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس جشن کو عام طور سے اہل رام پور لڈوقانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جشن برسہا برس سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

اس مسجد کا انتظام و انصرام ہمیشہ سے ریاست کے زیر نگرین رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں انصام ریاست کے بعد اسٹیٹ و فٹ آفس اس کی دیکھ بھال کرتا رہا جس کے ذمہ دار نواب صاحب رام پور تھے۔ اب یکم اپریل ۱۹۷۶ء سے اس کا انتظام شہر کے

زعماء کی ایک کمیٹی کو یہی ہے جس کا یوپی سٹی سینٹرل وقف بورڈ لکھنؤ سے الحاق ہے۔

اس کمیٹی کے قیام سے جامع مسجد کے انتظام و انصرام میں کافی بہتری آئی ہے۔ کمیٹی نے بہت سی جدید تعمیرات بھی کرائی ہیں جیسے اندر کے حصہ میں دوبارہ مکمل پلاستر، ستونوں پر موزیک، آئین میں مکمل لکڑی کی تعمیر اور جدید مارکیٹ کا قیام، جس سے کہ آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ انتظام اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

آخر میں جامع مسجد کے اماموں کی تفصیل درج ذیل ہے :

- ۱۔ قاری سید علی حسین نقشبندی محدث
آپ $\frac{1211}{1244}$ ھ میں پیدا ہوئے۔ وفات
آپ کی $\frac{1293}{1304}$ ھ میں ہوئی۔ آپ
فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
- ۲۔ مولوی حافظ عبدالشکور
آپ $\frac{1256}{1282}$ ھ سے $\frac{1282}{1304}$ ھ تک فیض اللہ
خانی جامع مسجد کے امام رہے۔
- ۳۔ مولوی شہار اللہ
جمادی الاول $\frac{1285}{1304}$ ھ تک زندہ تھے
آپ فیض اللہ خانی جامع مسجد کے
امام رہے۔

$\frac{1285}{1304}$ ھ میں تعمیر نو کے وقت آپ نے کلب علی
خال صاحب کی خواہش پر صرف ایک جمعہ
پڑھایا۔ غصہ کا ایک شعر یہ ہے کہ
اے دل من گناہ کہ تحقیق مردہ نیست
اعمال نیک کن کہ قیامت رسیدہ نیست

۴۔ مولوی سید منیر علی قادری

۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۲ء تک آپ نے
بحیثیت خطیب صرف جمعہ پڑھایا۔ ۸ جولائی
۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کا نام امام کی حیثیت سے ۱۸۹۱ء
میں ملتا ہے^{۱۹} اور انتقال ۲۳ جولائی
۱۹۱۳ء کو ہوا^{۲۰} لہذا آپ کلب علی خانی
جامع مسجد کے امام رہے۔

آپ کا ذکر بھی ۱۸۹۱ء میں ملتا ہے^{۲۱}۔ لہذا
آپ بھی کلب علی خانی جامع مسجد کے
امام رہے۔

آپ کا نام ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک
پیش امام کی حیثیت سے آتا رہا ہے^{۲۲}۔ لہذا
آپ کلب علی خانی جامع مسجد کے امام
رہے۔

آپ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۲۳ء تک نائب امام
کی حیثیت سے رہے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد
آپ امام اول ہو گئے۔ ۹ فروری ۱۹۲۶ء
کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کا ذکر ۱۹۰۹ء میں آیا ہے۔ نومبر
۱۹۰۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔^{۲۳}

آپ ۱۹۱۳ء میں امام اول مقرر ہوئے

۵۔ مولوی سید نثار علی قادری

۶۔ سید ارتضیٰ علی صاحب

۷۔ سید فتح علی صاحب

۸۔ حافظ سید محمد شاہ صاحب

۹۔ سید جمیل حسن قادری

۱۰۔ حافظ حاجی کلن صاحب

۱۱۔ سید ابراہیم حسن صاحب

اور ۱۹۲۳ء میں مستعفی ہو گئے۔

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دی اس کے بعد موتی مسجد میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد ہی پھر آپ کو جامع مسجد میں بلا لیا گیا۔ جہاں کچھ مدت رہے۔

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے صرف ایک ماہ کام کیا اس کے بعد آپ کا تبادلہ کربلا کی مسجد میں کر دیا گیا۔

نائب امام کی حیثیت سے آپ کا ذکر دہریہ سکندری شمارہ ۲۷ اگست ۱۹۳۴ء میں ملتا ہے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں آپ امام اول ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ء میں آپ پاکستان چلے گئے۔

ابتداء ۱۹۴۶ء میں ایک ماہ کے لئے نائب امام مقرر ہوئے لیکن یہ سبب اختلاف عقائد ناپسندیدہ برطرف کر دیئے گئے۔

آپ بھی ۱۹۴۶ء میں صرف تین چار ماہ ہی بحیثیت نائب امام رہے۔

۱۹۴۶ء میں بحیثیت نائب امام آپ کا تقرر ہوا اور ۱۹۵۱ء میں امام اول بنائے گئے۔

۱۲۔ حافظ صدیق صاحب

۱۳۔ مولوی جلال میر صاحب افغانی

۱۴۔ قاری محمد امین الدین صاحب

۱۵۔ مولوی محمد افضل صاحب افغانی

۱۶۔ حافظ محمد وحید الرحمن صاحب مجددی

۱۷۔ قاری عبدالحق خاں صاحب

لیکن ۱۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو بوجہ اختلاف علیحدہ ہو گئے۔

آپ کا باضابطہ تقرر ۱۹۵۱ء میں بحیثیت نائب امام ہوا۔ اس سے پہلے آپ مؤذن کے عہدہ پر تھے۔ یکم مئی ۱۹۵۲ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں مستعفی ہو گئے۔

یکم مئی ۱۹۵۳ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا لیکن دسمبر ۱۹۵۷ء کو آپ برطرف ہو گئے۔

۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء میں آپ باقاعدہ امام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس سے پہلے آپ مختلف اوقات میں خطیب کی حیثیت سے کام انجام دیتے رہے۔ یکم نومبر ۱۹۷۷ء کو آپ اس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔

ویسے تو آپ ۱۹۵۸ء سے بحیثیت نائب امام تھے لیکن آپ کا باضابطہ تقرر ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ہوا ہے جس پر آپ فائز ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۸۰ء سے بحیثیت خطیب آپ کا تقرر ہوا ہے۔

آپ کا تقرر ۷ مئی ۱۹۸۴ء کو بحیثیت امام ہوا ہے۔

۱۸۔ سید نورالحسن صاحب قادری

۱۹۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی

۲۰۔ خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب قادری مجددی

۲۱۔ مفتی محبوب علی صاحب قادری (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ رام پور)

۲۲۔ مولوی سید احمد علی صاحب چشتی نظامی

۲۳۔ مولوی مظاہر اللہ خاں

حوالہ جات

- ۱۔ اخبارالصنادید حصہ اول مولفہ نجم الغنی خاں مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۵۹۸۔
- ۲۔ انتخاب یادگار مولفہ امیر احمد مینائی مطبوعہ تلج المطابع (رام پور) ۱۹۲۹ء صفحہ ۳۷۔
- ۳۔ مضمون ”مدرسہ عالیہ رام پور“ از کلب علی خاں قانع شائع شدہ علم و آگہی کراچی علمی ادارے نمبر ۴۵-۴۴ء صفحہ ۲۹۔
- ۴۔ حالات خاندان مولوی غلام جیلانی خاں جسٹس ارشد اللہ خاں مطبوعہ کراچی صفحہ ۷۔
- ۵۔ تذکرہ کمالان رام پور مولفہ احمد علی شوق رام پوری مطبوعہ ہمد و پریس دہلی ۱۹۲۹ء صفحہ ۷۶۔
- ۶۔ تاریخ بدیع مصنفہ امیر اللہ تسلیم مطبوعہ حسنی پریس رام پور ۱۲۹۸ھ صفحہ ۱۰۔
- ۷۔ اخبارالصنادید ایڈیشن ۱۹۰۷ء مطبوعہ خادم التعليم اعظم پریس لاہور صفحہ ۸۳۶۔
- ۸۔ اخبارالصنادید جلد دوم ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۸۳۔
- ۹۔ مضمون ”ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟“ غارات روحیل کھنڈ“ از محمد ایوب قادری، شائع شدہ رسالہ ”اعلم کراچی“ جلد ۳ شماره ۲ صفحہ ۸۱۔
- ۱۰۔ تاریخ بدیع صفحہ ۲۱۱۔
- ۱۱۔ ہفتہ وار دیدہ سکندری رام پور جلد ۲۸ مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۳۔
- ۱۲۔ دیدہ سکندری جلد ۲۹ شماره ۳۸ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۳۔
- ۱۳۔ اخبارالصنادید حصہ اول ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۴۵۸۔

۱۵ دیدہ سکندری مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۳۹ء

۱۶ تذکرہ کاملانِ رام پور صفحہ ۲۵۳

۱۷ خودنوشت بیاض مولوی منور علی صاحب ملوکہ صغیر احمد صاحب (مرحوم)

۱۸ تواریخ آئینہ تصوف از محمد حسن صابری، لاہور آرٹ پریس لاہور،

۱۹۷۱ء صفحہ ۵۰۹۔۔

۱۹ رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۹۱ء۔

۲۰ دیدہ سکندری جلد ۲۹ شمارہ ۳۴ مورخہ ۲ اگست ۱۹۱۳ء۔

۲۱ رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵۔

۲۲ رام پور اسٹیٹ گزٹ ۱۹۰۳ و دیدہ سکندری ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۱ء

۲۳ دیدہ سکندری جلد ۲۵ شمارہ ۴۴ مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ء

اسلام کا اقتصادی نظام

• تالیف : مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمن

ایک عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام معاشی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ نکالا ہے اور جس پر عمل کرنے کے بعد سرمایہ و محنت کی کشمکش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔

صفحات ۴۰۸ بڑی تقطیع قیمت ۳/- روپے مجلد ۴۰/- روپے

ندوة المصنفین، احمد دہانہ ارجامع مسجد اہلی

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شمالی افریقہ کی مکمل فتح کے بعد وہاں کی مسلم حکومت نے اسپین کی طرف توجہ کی۔ اسپین میں سیاسی اور سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں کے عوام موجودہ حکمرانوں کے ظلم و ستم سے نجات پانے کے متمنی تھے۔ شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے ابتداء میں اسپین کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے پانچ سو افراد پر مشتمل ایک دستہ کے ساتھ اپنے ایک معتمد فوجی ظریف کو بھیجا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد ان کے ہمراہ اپنے مسلم غلام اور فوجی بربر کو جس کا نام طارق بن زیاد تھا، اسپین کی فتح کے لئے پانچ ہزار فوج لیکر روانہ کیا۔ طارق نے اپنی فوج کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر اسپین کے ساحل پر قدم رکھا اور یہ کہہ کر اپنی کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا کہ ہم اسپین کو فتح کر سکیں گے یا اسی سرزمین پر شہید ہو جائیں گے اس جگہ کو آج تک جبل طارق (GIBRALTER) کہا جاتا ہے۔ طارق کو یہاں تیزی کے ساتھ فتوحات حاصل ہوئیں اور ایک سال سے کم ہی مدت میں طارق نے نصف سے زیادہ اندلس کو فتح کر لیا۔ بہت سی جگہوں پر بغیر کسی لڑائی کے لوگوں نے اپنے شہزادہ قلعے مسلم فوج کے حوالے کر دیئے۔ جن شہروں کو طارق نے فتح کیا ان میں زیادہ اہم

قرطبہ، طلیطلہ، غناطہ تھے۔ طارق کو موسیٰ کی طرف سے مدد ملتی رہی۔ مگر کچھ دنوں بعد موسیٰ بن نصیر خود بھی الگ فوج لے کر اسپین پہنچ گئے۔ اور باقی اسپین کو موسیٰ اور طارق نے مل کر فتح کیا۔ دو سال سے کم ہی مدت میں پورا اسپین مسلمانوں کے ہاتھوں میں آچکا تھا۔ یہ بنو امیہ کی فلاح کا زمانہ تھا اور شام کے پایہ تخت دمشق میں ولید کی حکومت تھی۔

۱۵۰ء میں ولید کا بھائی سلیمان خلیفہ بنا اور اس نے اپنی خفگی کی وجہ سے شمالی افریقہ اور اسپین کی گورنری سے موسیٰ بن نصیر کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اس کے بعد چالیس سال تک اسپین میں حکومت تو مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہی لیکن آپس کے جھگڑے شروع ہو گئے جس کی وجہ سے آئے دن گورنر بدلتے لگے۔ یہاں تک کہ عرب قبیلوں کے اس جھگڑے کی وجہ سے پچیس چالیس سال کے درمیان اتنے ہی گورنر آئے اور گئے۔ آٹھویں صدی کے وسط میں اسلامی دنیا میں سیاسی سطح پر ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ زمام حکومت بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس نئی حکومت نے اپنے دار السلطنت کے لئے بغداد کا انتخاب کیا۔ مگر شمالی افریقہ اور اسپین پر عباسیوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ چنانچہ اسپین کے گورنر یوسف الفہری نے اپنی رازدادشاہت قائم کر لی اور اسپین عباسی حکومت سے الگ ہو گیا۔

بنو امیہ کے ہر فرد کو عباسیوں نے ۷۵۰ء کے انقلاب میں چن چن کر مار ڈالا۔ لیکن بنو امیہ کے شاہی خاندان کا صرف ایک نوجوان لڑکا جس کی عمر پندرہ سال تھی کسی نہ کسی طرح جان بچا کر شمالی افریقہ پہنچ گیا اور پانچ سال تک یہ نوجوان جس کا نام عبدالرحمن تھا۔ شمالی افریقہ کے مختلف دیہاتوں میں چھپ چھپ کر وقت گزارتا رہا۔ آخر اس نے اپنے ایک غلام کو جس کا نام بدر تھا۔ یہ معلوم کرنے

کے لئے اسپین بھیجا کہ وہاں کے عرب قبیلے عبدالرحمن کو اسپین بلا سکتے ہیں یا نہیں، اور اس کا ساتھ دیں گے یا نہیں۔ بدرجو جواب لے کر آیا اس سے عبدالرحمن کا چھل بلند ہو گیا اور وہ خاموشی سے اسپین پہنچ گیا۔ یہاں کے عرب قبیلے جو بنو امیہ کے خاندان سے بہت ہمدردی رکھتے تھے، عبدالرحمن کا پورا ساتھ دیا۔ اسپین کے آزاد گورنر یوسف الفہری اور عبدالرحمن کے ساتھ ”زلا قہ“ کے میدان میں زبردست جنگ ہوئی جس میں عبدالرحمن فتح یاب ہوا۔ اس طرح ۵۶۱ء میں اسپین میں بنو امیہ کی حکومت دوسری بار قائم ہو گئی جس کا پہلا بادشاہ عبدالرحمن تھا۔ عبدالرحمن نے باہر آکر اسپین کو نئے سرے سے فتح کیا اس لئے لوگوں نے اس کو الداخل کا خطاب دیا یعنی باہر سے داخل ہونے والا۔

عبدالرحمن نے اسپین میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو ختم کیا اور بہت نظم و ضبط کے ساتھ حکومت شروع کی۔ اسپین میں بنو امیہ کی یہ حکومت ۵۶۱ء سے ۷۵۵ء تک تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ اس مدت میں یہ حکومت نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ بعض کمزوریاں راہ پاتی رہیں لیکن موقع بہ موقع ان کا مداوا بھی ہوتا رہا۔ مثلاً تین نسلوں کے بعد یہ حکومت جو آپسی جھگڑوں کا شکار ہو کر کمزور اور محدود ہونے لگی لیکن دسویں صدی کے آغاز میں عبدالرحمن سوم نے جس کو الناصر کہا جاتا ہے، دوبارہ اس حکومت کو مستحکم کیا۔ یہ عبدالرحمن سوم ۹۱۲ء سے ۹۱۶ء تک حکمراں رہا۔ ۹۲۹ء تک بنو امیہ کی یہ حکومت اسپین میں ”امارت“ کے نام سے معروف رہی اور اس کے بادشاہوں کو امیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن ۹۲۹ء میں جب عبدالرحمن التامر کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی تو اس نے بنو امیہ کی اس حکومت کو ”امارت“ کے بجائے ”خلافت“ میں بدل دیا اور اپنے لئے امیر کے بجائے خلیفہ کا لقب پسند کیا۔ اس کے بعد سے آخری دن تک

بنو امیہ کی حکومت اموی خلافت کہلاتی۔ اس طرح سے بنو امیہ کی اسپین میں امارت کا زمانہ ۷۵۵ء سے لے کر ۹۲۹ء تک ہے۔ اس کے بعد ۹۲۹ء سے ۱۰۳۱ء تک کا زمانہ خلافت کا کہلاتا ہے۔ لیکن آخری دنوں میں بنو امیہ کی یہ حکومت اتنی کمزور ہو گئی کہ اکثر گورنروں نے اپنے اپنے شہروں میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ یہاں تک کہ بنو امیہ کی حکومت جو سب سے پہلے اپنے دار الحکومت قرطبہ میں محدود ہو گئی تھی وہ بھی آخر کار ختم ہو گئی۔

(باقی)

اسلام کا نظام حکومت

مؤلف : مولانا حامد الانصاری غازی

اس کتاب میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان تالیف اسلام کا نظام حکومت ہی پیش نہیں کرتی بلکہ نظریہ سیاست و سلطنت کو بھی منظر عام پر لاتی ہے۔ طرز تحریر نہایت حال کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

ہمارے طرزِ تحریر میں یہ پہلی کتاب ہے جو قرآن، نبوت، دستور صحابہ کے علاوہ اسلام کے علماء و اجتماعیات کی بے شمار کتابوں اور عصر حاضر کے نوشتوں اور سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد سامنے آئی ہے۔

صفحات ۲۶۴، بڑی تقطیع، قیمت ۳۰ روپے

مجلد اعلیٰ کوالٹی - ۴۰ روپے

ندوة المصنفین، اردو باناد، جامع مسجد، دہلی

جناب مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

کی
چوتھی برسی کی یاد

یکم مئی ۱۹۸۸ء

ایشاد و حریت کے عنوان تھے عتیق بنیاد انقلاب ایمان تھے عتیق
زائد کہیں مجاہد حافظ کہیں محافظ آدم کے وارثوں کی پہچان تھے عتیق
حق نے انھیں بنایا دانا یوں کا پیکر تفسیر درس آلِ قرآن تھے عتیق

ہر درودِ دعا کے درمیان تھے عتیق
رحمت چراغِ راہ ایمان تھے عتیق

بعد از ختم قرآنِ کریم اور درود، فاتحہ خوانی نیز دعائے مغفرت اور تعزیت کے
ایصالِ ثواب برائے روحِ پاک جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
دہلی پر موقعہ ان کی چوتھی برسی یکم مئی ۱۹۸۸ء
متجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ نسل گوڑ گاؤہ ہریانہ

آج ہم ایک ایسے انسان کے متعلق گفتگو اور یاد منارہے ہیں جس کی بلند و بالا شخصیت کی تعریف و توصیف سے زبان و قلم عاجز ہے۔ وہ انسان جس کا باطن ان کے ظاہر سے کہیں پاک و صاف اور پیکرکش تھا اس لئے وہ انسان اسلامی عرفان و تہذیب کے دریائے بے کراں کا درجے بہا تھا۔ وہ انسان جس کے قلب پر نورِ علم درخشاں جس کی روح پر عشقِ الہی محیط، وہ انسان جس کے پورے وجود پر اخلاص کی حکمرانی تھی۔ یہ سب آثار اس کے چہرے پر باہر و ظاہر تھے۔ مرحوم ایک بہت بڑے جید عالم باعمل اور قوم کے مجاہد بھی نہ تھے بلکہ اخلاق تہذیب کے بھی ایک عظیم معلم تھے۔ آپ کی انکساری سادگی مہربانی، خاموشی اور وقار کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ مرحوم وہ انسان تھے جنہوں نے مذہب اور اس کی روحانیت کو سمجھا تھا، آج کل تو حالت یہ ہے کہ مذہب میں روحانیت ہی نہیں دکھائی دیتی، جہاں اعلیٰ پوشاکیں تو ہوتی ہیں مگر روح سیاہ اور ذل اتنے ہی میلے ہوتے ہیں لیکن مرحوم مولانا جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بہت پہلے اس وقت محسوس کیا تھا کہ جب انسان دین حق یعنی مذہب کی ہی بنیاد پر زندگی گزارتا تھا مگر افسوس کہ اب وہ نہیں رہے۔

(إِنَّا لِلّٰهِ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی، ملی و قومی خدمات کو بے حد مقبول فرما کر پیران و عزیزان کو ان کا نعم البدل عطا فرما دے آمین۔

اور ان کی پوری پوری مغفرت فرما کر جنت الفردوس

میں مقام عطا فرماوے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل بالخصوص ان کے پیارے
بیٹوں کو مرحوم موصوف کے اوصاف حمیدہ کو اپنانے کی توفیق دیں۔
آمین ثم آمین

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
تشر میں شان کریم ناز برداری کرے
(آمین ثم آمین)

رحمت علی غفرلہ
سوہنہ نسل گوڑگانوہ

نوٹ: یہ اشتہار ماہ مئی ۱۹۸۸ء کے رسالہ میں
شائع ہونے کے لئے تھا کسی وجہ سے اس کو
تاخیر کے ساتھ ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ
میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادامہ)

BURHAN (Monthly)

4136 Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

جب یہ سب خرابیاں ہوں



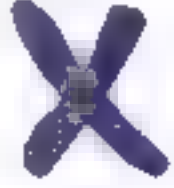
زماہل میں خون کی کمی



انگل سے بچر کی تباہی

طلباء میں
ذہنی ترقی کی کمیذہنی وجہی
تساؤ اور دباؤ

وزن کی کمی



جسمانی شکاوت



دشمن اور آئرن کی کمی



احصائی بے مہنی



سستی اور قوت کی کمی



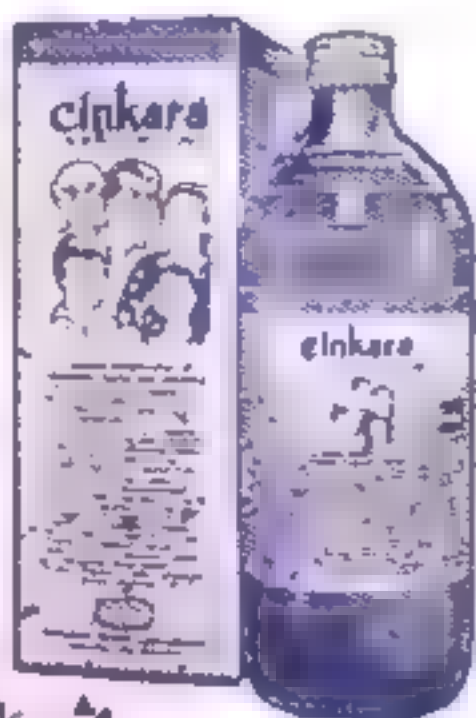
بیماری کی شدت



بیماری کے بعد کی کردی



صوک کی کمی

سندکار!
 ان سب کو ٹھیک کرتا ہے!لازمی بنیادی عناصر
وٹامنوں اور
جزی بوٹوں کا
تادر مرکب

سندکار!

مشہور عالمی ٹائیک - ہر گروہ میں سب کے لیے

ہمدرد

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

مُصَنَّفِینِ دِلِی کا علمی و دینی ماہنامہ

بریکان

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مُرتَبِ
عمید الرحمن عثمانی

مُدیِرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

برہان

جلد ۱۰۲ | صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۴

- ۱۔ نظرات
۲۔ اے مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم
۳۔ شیخ القراء قاری عبدالواحد راسپوری
- ۴۔ احسان کی روش
قرآن کی روشنی میں
۵۔ اسلامی عہد میں اسپین کی
علمی و تاریخی کیفیت
۶۔ قرآن کریم میں ترادف
- ۷۔ عمید الرحمن عثمانی
پروفیسر محمد اسلم، شعبہ تاریخ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور
جناب محمد نظر علی خاں
سفارت خانہ کویت، نئی دہلی
جناب محمد بدیع الزماں
ریشارڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ٹنہ ۴۲
جناب محمد علی جوہر ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۴۹
ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن جنت النشانی
عربی سے ترجمہ: ڈاکٹر رضی الاسلام ٹی ۵۳
رئیس فاطمہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۶۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر وزیر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظریہ

برطانوی سامراج سے ملک کو سیاسی اور فکری اعتبار سے آزاد ہونے چار دہائیاں مکمل ہو چکی ہیں لیکن آزادی کا جو سنہرا خواب باشندگان وطن نے دیکھا تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی تک شرمندہ تعبیر ہے۔

عام طور سے مفکرین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ کوئی بھی نسل چالیس سال کے عرصے میں وہ اپنے جوہر دکھا کر میدانِ عمل سے پوری طرح ہٹ جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ انسان کی مکمل جوانی، فکری و جسمانی بلوغت طاقت و قوت اور مضبوطی کو پہنچنے کے لئے بھی چالیس سال کی عمر کا تذکرہ کتابِ فطرت یعنی قرآن کریم میں آیا ہے :

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اَشَدَّكَ وَبَلَغَ اَتَاٰبَعِیْنِ سَنَۃً ۝
یہاں تک کہ خوب جوان ہو گیا
اور اپنی طاقت کو پہنچا اور
چالیس سال کا ہو گیا۔

ملک کی چالیس سالہ سیاسی زندگی کا اگر بے لاگ جائزہ لیا جائے تو آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک نسل ختم ہو چکی ہے اور دوسری نسل نے سیاسی اقتدار سنبھال لیا ہے۔ چالیس سالہ طویل عرصے میں ہم نے مجموعی طور

پر کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ ایک بہت ہی غور طلب، سنجیدہ اور اہم سوال ہے۔ جسے
نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زندہ قوموں کی ایک علامت اور نشانی یہ بھی ہے کہ وہ
وقتاً فوقتاً اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی ہے۔ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ
لیتی ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم

کوئی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

آزادی کے بعد پچھلے چالیس اکتالیس برسوں میں ملک نے مالی وسائل، مادی
ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی میں اضافہ، سیاسی استحکام، سوشل اور وفاقی اداروں
کے ذریعے قابل ذکر تعمیر و ترقی میں پیش رفت کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ملک نے
COUNTRY BUILDING میں بڑی حد تک ترقی کی ہے اور بین الاقوامی
سطح پر اس کی حیثیت، انفرادیت اور قوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک کردار
کی تعمیر (NATIONAL BUILDING) کا سوال ہے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت
مان لینی چاہئے کہ اس میدان میں مایوس کن حد تک ہمارا ملک، ہمارا سماجی نظام اور
ہماری اجتماعی زندگی پیچھے ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور
کردار سازی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کسی بھی
نظام کی تبدیلی کے لئے بنیادی چیز تعلیم و تربیت ہے۔

ملک کے بے پناہ داخلی و خارجی مسائل میں اہم ترین اندرونی مسئلہ آئے دن
فرق پرستی، تشدد، تعصب، تنگ نظری، تفریق اور دہشت گردی کے ظاہر و مخفیانات
کا تشویش ناک حد تک فروغ اور بڑھاوا ہے۔ موجودہ وقت میں ملکی سالمیت،
قومی وحدت اور فرقہ وارانہ یکجہتی کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ماضی میں

اس طرح کبھی نہیں رہا۔ آزادی کے اتنے عرصے کے بعد بھی ملک جارحانہ فزڈ پرستی کی لعنت سے آزاد نہیں ہو سکا۔

انگریز سامراج ملک سے چلے گئے لیکن ان کی شاہرانہ سیاسی چالیں، حربے اور مہرے لڑاؤ اور حکومت کرو (DEA / DE RULE) کی پالیسی اقتدار پرست افراد اور جماعتوں کے ذہنوں میں پیوست ہے اور وہ محض اپنے حقیر ذاتی مفادات اور اغراض کے لئے قومی، ملکی اور اجتماعی مفاد کو بھیجٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں جبکہ ملک کمراتی دور سے گزر رہا ہے ہمیں علاقائیت اور زبان و نسل کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو کر انسانی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقتدار کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بات عام لوگوں کے ذہن نشین کرانی ہے کہ ہماری قومی زندگی کے بقا اور ارتقاء کا راز باہمی اتحاد اور یکجہتی میں مضمر ہے جبکہ انتشار اور تفریق قومی زندگی کی موت کی علامت ہے۔

ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین نیز اپنے ہی فرقے کے مختلف طبقوں کے درمیان بھی آئے دن نئے حالات اور حوادث کے پیش نظر اعتماد و اعتبار کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ خود ملکی سطح پر مسلم قیادت (LEADER SHEP) کا حقدان ہے اس کے سبب مسلم عوام کا اعتماد دانشوروں اور مفکرین کی جماعت سے اٹھتا جا رہا ہے، اب اکثر قائدین اور رہنمایان ملت کی صحیح بات بھی عوام کو مصلحت آمیز نظر آتی ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک اور اس کے موجودہ سیکولر نظام میں جہاں روزاوں سے مختلف مذاہب کے پیروکار ایک ساتھ زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں لیکن اب موجودہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر

قومی یکجہتی (COMMUNAL HARMONY) کے کار کی تقویت اور اس کو بڑھاوا دینے کے لئے ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ غیر مذاہب کے افراد اور دانشوروں سے انسانیت اور شرف آدمیت کے اعتبار سے قریب آنا جانا چاہئے۔ ایک دوسرے کے خیالات، نظریات، افکار، نقطہ نظر اور معاشرتی و مذہبی زندگی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس چیز کا احساس اکثریتی فرقہ کو بھی ہونا چاہئے اور اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس نفسیاتی نکتہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ صرف ایک دوسرے کے مذہب کی جانکاری ہی مسئلے کا حل نہیں جب تک ایک دوسرے فریق کے اندر برداشت اور تحمل کا جذبہ نہ ہو۔

ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو مختلف مذاہب خاص طور پر دین اسلام کے بارے میں بدرجہ اتم اور خصوصی علم رکھنے کے باوجود اس کی تشریح اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور نہ شرماتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اس سے خراب اور فرسودہ کوئی نظام ہی نہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہمیں اس غیر معقول نظریہ سے بھی ملتی ہے جس کا ان دنوں بڑے زور و شور کے ساتھ چرچا کیا جا رہا ہے کہ ”اس ملک میں مسلم تہذیب و ثقافت کے نام کی کوئی چیز ہی نہیں“ اس بے بنیاد نظریہ کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ط

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہئے ؟

یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ دوسرے مذاہب اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت کے باوجود انہیں منہ نہیں کر پاتے۔ اسے ایک نظام زندگی (SYSTEM OF LIFE) سمجھنے کو تیار نہیں۔ اس لئے قدرتا ایک دوسرے

کے مابین جو بعد اور دوری ہے وہ کم نہیں ہو پاتی۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ملکی وحدت اور سالمیت کی خاطر مخالف نظریات اور مذاہب کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں اور ان کو اپنے خصائص اور لوازمات کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیں۔ درحقیقت مذکورہ اصول ہی زندگی گزارنے کا مہذب، معقول اور بقائے باہم کا صحیح طریقہ ہے جس کے لئے وسعت قلب، وسعت ذہن، وسعت نظر اور وسعت ظرف درکار ہے اس سے ہم انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سیکھیں گے۔ ایک دوسرے کے تئیں تعاون، ایثار اور قربانی کا پاکیزہ جذبہ بیدار ہوگا اور اس سے ایک فلاحی اور مہذب معاشرے کے قیام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اسلام کا اقتصادی نظام

تالیف: مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمنؒ

ایک عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام معاشی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ نکالا ہے اور جس پر عمل کرنے کے بعد سرمایہ و محنت کی کشمکش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے ساتھ ساتھ موجودہ صنعتی اور معاشی مسائل کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

صفحات ۲۰۸، بڑی تقطیع، قیمت - ۳۰ روپے مجلد - ۴۰ روپے

ندوة المصنفین، اردو بانٹار، جامع مسجد دہلی

اس

قائمین کرام و ہمدان ملت ! ” ادارہ ندوۃ المصنفین“
 اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم
 کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنی قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی
 ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی
 ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آ رہا ہے۔ الحمد للہ علی ذالک
 لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا
 اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین،
 مجتہدین اور وہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دوڑ گراں بازار میں ایسے ادارے
 بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب
 مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے،

اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ کئی منصوبے جو تشنہ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ اربابِ خیر اور اہلِ طوائف ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہمازی سرپرستی فرمائیں گے! — چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتے پر ارسال کیا جائے۔

مینجر مدوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی ۶۔

اے مجموعہ خوبی بیکہ نامت خوام

(۲)

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

شیر میوات علی محمد نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہ کی درگاہ میں مدرسہ رحیمیہ کا اجرا کیا۔ مفتی ضیاء الحق صاحب اس کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ میں دہلی گیا تو مفتی ضیاء الحق نے موقعِ عظمت جان کر مدرسے میں "شاہ ولی اللہ کی خدمات" کے موضوع پر میری تقریر رکھ دی۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی۔ ہینڈ بیل بھی تقسیم کئے گئے۔ صدارت کے لئے مفتی صاحب کا نام تجویز ہوا۔ میرے لئے یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ مفتی صاحب ایسے فاضلِ اجل کی صدارت میں مجھ سمجھدان کی تقریر ایک طرح سے میرا امتحان تھا۔ خیر یہ مرحلہ خدا کے فضل و کرم سے بخوبی گزر گیا۔ مفتی صاحب نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اور مجھ کج بیان کی ٹولف فرمائی۔ شیر میوات نے بھی ایسے ہی الفاظ سے میری ہمت بندھائی۔ تقریر کے بعد کھانے کا اہتمام تھا۔ کھانے کے موقع پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اور مفتی صاحب ایک ہی رکشا میں سوار ہو کر ندوۃ المصنفین پہنچے۔

اسی طرح ۱۹۷۳ء میں، مجھے اب تک یاد ہے جولائی کی ۲۱ تاریخ تھی، جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے غالب اکبر دہلی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمات کے بارے میں میری تقریر کھدی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی صدارت میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ مفتی صاحب چند اجاباب کے ساتھ تشریف لائے۔ ادھر پھر دہلی یونیورسٹی تعلق آباد سے ایک بس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، حکیم عبدالوہاب ظہوری، جناب عبدالحی فاروقی، ڈاکٹر اوصاف علی، ڈاکٹر وحید الدین اور ادارے کے بہت سے رفقاء تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر غابد حسین بھی آئے ہوئے تھے۔ اہل فکر و نظر کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ پاکستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دو قومی نظریے کا بانی مبینی سمجھا جاتا ہے اور بھارت کی سیکولر فضا میں ان کی تعلیمات اور خدمات کو پاکستانی نقطہ نظر سے بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ مفتی صاحب نے میری گھنٹہ بھر کی تقریر بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنی۔ جب خطبہ صدارت کے بعد چائے کا دور چلا تو مفتی صاحب نے میری کچھ بیانی کی تعریف کی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ میری دلدادہی کے لئے کہا ہوگا، ورنہ یہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکبت گل
نسیم صبح تیری ہیر بانی

ایک زمانے میں مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سننے کا بڑا شوق تھا میں عموماً رات کی نشریات سنا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے ریڈیو کا بیٹن گھمایا تو حضرت شاہ کلیم اللہ ولی شاہ جہان آبادیؒ کے عرس کی جھلکیاں نشر ہو رہی تھیں اور مقررین کے خطاب کے اقتباسات پیش کئے جا رہے تھے۔ اچانک ہی اناؤنسرنے کہا آپ آپ جناب مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے خیالات سماعت فرمائیے۔ میں نے فوراً ہی

ان کی تقریریں ریکارڈ پر ریکارڈ کر لی۔ اس بعد موصوف نے الخلق عیال اللہ کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔

مصنفین کو ناشرین سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ ناشرین انہیں حسب توقع رائلٹی نہیں دیتے۔ ناشرین کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر وہ مصنفین کی کتابیں شائع نہ کرتے تو انہیں علمی حلقوں میں کون جانتا؟ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی تصانیف چھپ کر علمی حلقوں میں چلی جائیں۔ یہ کشمکش ہمیشہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا اپنے مصنفین کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ جہاں تک مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا معاملہ ہے، مفتی صاحب اور مولانا مرحوم میں ”من و تو“ والی بات نہ تھی، بالکل گھر کا معاملہ تھا۔ مولانا مرحوم کے بچے مفتی صاحب کو تاجا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور مفتی صاحب کی اولاد مولانا مرحوم کو چچا میاں کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ مولانا مرحوم نے اپنی کسی کتاب پر رائلٹی نہیں لی۔ ۱۹۶۹ء میں جب میری پہلی تصانیف — دین الہی اور اس کا پس منظر — مددۃ المصنفین سے شائع ہوئی تو میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ اس کے پروف میں نے خود دیکھے تھے۔ مفتی صاحب نے حکیم ظفر احمد مرحوم سے کہا ”اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کتاب ان کے لاپرواہانے سے پہلے چھپ جائے اور انہیں اس کے ایک سو نسخے دے دینا۔ یہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ چنانچہ میرے جانے سے پہلے کتاب چھپ گئی اور آخری دن حکیم صاحب نے پچاس نسخے یہ کہہ کر میرے حوالے کئے کہ اتنی ہی جلدیں تیار ہو سکی ہیں۔ میں اپنی پہلی تصنیف بھی ہوائی دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے مصنفین کو صرف میں غر کر دیا تھا، میں پچاس کتابیں لے کر

پاکستان چلا آیا، اور وہ چند ہی دنوں میں دوست و احباب میں تقسیم کر دیں۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مفتی صاحب کے ساتھ ان کی دوستی اس حد تک تھی کہ یک ماہ و دو قالب کی ضرب المثل ان پر صادق آتی تھی۔ مولانا حفظ الرحمن ندوۃ المستنین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی تصانیف قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں، مؤخر الذکر کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایم اے اقتصادیات کے نصاب میں شامل ہے۔ مولانا حفظ الرحمن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے راقم الحروف سے ایک بار ذکر کیا کہ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک مفتی صاحب بہراہ ایک معقول رقم ان کی بیوہ کو بھجواتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حضرات مزاجاً ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ یہاں یہ ذکر بیان ہوگا کہ ہم مزاج ہونے کے علاوہ یہ تینوں ہم مرض بھی تھے اور تینوں کا انتقال ہر مرض سرطان ہوا۔

یہ ایک بار برسات کے موسم میں اہل وعیال سمیت علی گڑھ گیا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے دریائے گنگا کے کنارے نزورہ میں ایک ریسٹ ہاؤس ریزرڈ کرایا۔ تمام اہل خانہ مع باورچی نزورہ پہنچے اور کئی روز وہاں ٹھہرے۔ ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی کے اوپر تھا اور نیچے گنگا بہتی تھی۔ قریب ہی گنگا پر بندہ باندھ کر ایک نہر نکالی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کے باورچی کریم خاں کو مچھلیاں پکڑنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ گنگا سے مچھلیاں پکڑ لاتا اور سالن تیار کر کے مولانا مرحوم کو کھلاتا۔ مچھلی اور بریانی ان کی کمزوری تھی۔

مولانا نورہ میں قیام کے دوران بار بار مفتی صاحب کو یاد کرتے اور فرماتے
اگر مفتی صاحب بھی یہاں آجاتے تو چند روز آرام کر لیتے۔ ہم جتنے روز وہاں
ٹھہرے مفتی صاحب کی یاد انہیں برابر سناتی رہی۔

اگلے سال موسم گرما کی تعطیلات میں میں علی گڑھ گیا تو نورہ کا پروگرام
بنا یا گیا۔ مفتی صاحب کو اس کی اطلاع کی گئی۔ موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے
اور اگلے روز ہم نورہ روانہ ہو گئے۔ چار روز وہاں قیام رہا۔ شام کے وقت
ہم لان میں بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی
چائے بھی وہیں پیتے۔ عصر، مغرب اور غشاء کی نمازیں وہیں مفتی صاحب کی
اقتدار میں ادا کرتے۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ بارش بھی وقفے وقفے سے ہوتی
رہتی تھی کھانے کے وقت آم ضرور ہوتے تھے۔ شام کو آلو اور مچھلی کے پکوڑے
تلے جاتے اور سبھی مزے لے لے کر کھاتے۔ صبح کے وقت گنگا کے پل پر جا کر
دریا کا نظارہ کرتے۔

نورہ کے چاروں اطراف میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ مفتی صاحب
فرمانے لگے کہ یہاں صرف زمانہ امن میں ہی آکر رہ سکتے ہیں ورنہ پتہ نہیں
کس وقت کیا ہو جائے۔

مولانا اکبر آبادی کثیر العیال ہونے کے باوجود بڑے شاہ خرچ تھے۔ ایک
بار اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، مفتی صاحب فرمانے لگے ”ان کے ہاتھ
میں چھید ہے، اس لئے ان کے پاس پیسے نہیں رہتے۔“

مفتی صاحب کی یہ بڑی خدمت ہے کہ انہوں نے بہت سے اہل قلم کو
جن کی علمیت کا آج علمی دنیا میں شکہ چلتا ہے، علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔
مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا لقی امینی،

پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا بدر عالم میرٹھی، پروفیسر محمد سعید احمد، مولانا رشید
 نعمانی، مفتی ظفر الدین مفتاحی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی،
 ڈاکٹر ماجد علی خاں، مولوی محمد عبداللہ طارق، مولانا حامد الہ انصاری غازی، کرنل
 خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوسرے اہل قلم برہان کے
 ذریعہ دینی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
 سے کسی نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی نواسہ مرقدہ کے بارے میں پوچھا
 ”کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟“ حضرت قاسم العلومؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا
 ”عالم ہونا کیا معنی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات بابرکات کو عالم کر بنایا ہے۔“
 یہی جواب مفتی صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ آج کوئی اسکالر بام شہرت پر
 پہنچ کر مفتی صاحب کے احسان کا انکار کرے تو یہ تحدیثِ نعمت کے منافی
 ہوگا۔

ایک بار مفتی صاحب دفتر برہان میں تشریف فرما تھے کہ اردو شاعری پر بات
 چل نکلی۔ انھوں نے انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک اجنبی
 اگر حضرت امام حسینؑ سے کہتا ہے۔ ع

اظہارِ اسمِ اقدسِ واعلیٰ میں کیا ہے باک

امام صاحب نے اجنبی کو جو جواب دیا اسے دبیر نے ان الفاظ میں بیان کیا
 ہے۔ ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

دیکھئے دبیر نے اس مصرعے میں کتنی فاش غلطی کی ہے۔ اولاً یہ کہ حضرت امام
 عباسیؑ مقام ایک اجنبی سے اپنا تعارف کرو رہے ہیں۔ اس لئے اس میں تجزو
 انکسار کا اظہار ہونا چاہئے نہ کہ تعلیٰ۔ ثانیاً یہ کہ متکلم اپنے لئے واحد غائب

کا صیغہ ”علیہ السلام“ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ اب دیکھیں انہیں نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے :

یہ تو نہیں کہا کہ شبہ مشرقین ہوں

مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اب خود ہی اندازہ لگالیں کہ انہیں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ (یہ شعر پڑھتے وقت مفتی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو قدرے جھکایا اور یوں اپنے ایکشن سے پوری تشریح کر دی)۔ اس کے بعد انہوں نے انہیں کا یہ شعر پڑھا :

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحرا بکھرا ہوا

پھر اس کی تشریح شروع کر دی کہ اوس اور شبنم میں کیا فرق ہے اگر یہاں اوس کی جگہ شبنم ہوتا تو شعر بے مزہ ہو جاتا۔ یہاں اوس لکھنا ہی مناسب تھا۔ انہیں نے شبنم کا استعمال ایک مصرع میں یوں کیا ہے :

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گا بکے

یہاں اگر شبنم کی بجائے اوس لکھتے تو شعر پھسپھسا ہو جاتا۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس موقع پر انہوں نے علم کے کتنے موتی لٹائے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ادیب چھپا ہوا ہے اور اگر موصوف علم دین کی طرف راغب نہ ہوتے تو ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا۔

ایک روز تصوف پر بات چل نکلی۔ میں نے عرض کیا ”حضرت آپ کے والد ماجد تو بہت بڑے عارف باللہ تھے۔ آپ نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی۔“ مفتی صاحب

نے مسکراتے ہوئے فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نجات کا واحد راستہ نہیں ہے اور بھی کئی راستے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ "آپ کے والد بزرگوار سے یہ سلسلہ آگے بھی چلا ہے؟" فرمانے لگے "مولوی اسحق صاحب میرٹھی ابا جی سے بیعت تھے اور مولوی بدر عالم مولوی صاحب کے مرید تھے۔" میں نے مولانا محمد اسحق میرٹھی کے بارے میں زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ اب برہان کا مفکر ملت نمبر موصول ہوا تو یہ جان کر بیدار ہوئی کہ قاری محمد ادریس صاحب ان کے پوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ قاری صاحب بلاناغہ شام کو جامع مسجد نئی دہلی سے واپسی پر کیوں مفتی صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر مفتی صاحب موجود نہ ہوتے تو بھی قاری صاحب اس معمول میں فرق نہ آنے دیتے۔

مفتی صاحب کے جد امجد حضرت شاہ فضل الرحمن عثمانی نور اللہ مرقدہ دارالعلوم دیوبند کے چھ بانوں میں سے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان ہی کی دعوت پر دیوبند تشریف لائے تھے۔ مفتی صاحب کے والد بزرگوار حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمن عثمانی قدس سرہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں صاحب نسبت بزرگ تھے اور پورے ملک میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ ان کے ایک چچا حضرت حبیب الرحمن عثمانی رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور بڑے دبدبہ والے بزرگ تھے۔ ان کے دوسرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ والرضوان پاکستان کے پہلے شیخ الاسلام، قائد اعظم کے معتمد ساتھی اور اپنے زمانے کے سربراہ آدرہ مفسر و محدث تھے۔ ان کی شرح مسلم شریف اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن حکیم پر حواشی ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں قرارداد مقاصد، جس کی رو سے پاکستان کی قومی اسمبلی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی،

کے محرک آپ ہی تھے۔ ان کے ایک چچا جناب مطلوب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی صاحب دل بزرگ تھے۔ اس کے باوجود مفتی صاحب نے اپنے زمانہ کی طرح اپنے بزرگوں کی استخراں فروشی سے مکمل اجتناب فرمایا۔ اب تو یہ دستور چل نکلا ہے اور ”صاحبزادے“ اپنے ناموں سے پہلے ابن الفلان لکھ کر اپنے بزرگوں کے نام سے رولی کمار ہے ہیں۔ مفتی صاحب نے مولانا جامیؒ کا کلام بغور پڑھا تھا اور مرحوم خوب جانتے تھے۔

کاندیں راہ فلان ابن فلان چیز ہے نیست

انہیں یہ معلوم تھا کہ اگر ابن الفلان ہونا ہی بڑے ہونے کا دلیل ہے تو کنعان اپنے نام سے پہلے ابن نوحؑ لکھ کر بڑا نہ ہو سکا۔ فَكَانَ مِنَ الْمَحْزُورِينَ۔ مجھے مفتی صاحب دیوبندی حلقے میں واحد بزرگ نظر آ رہے ہیں جنہوں نے اپنی ”صاحبزادگی“ سے کوئی مافی منفعت حاصل نہیں کی بجھے یاد آیا۔ ملتان میں تحریک ختم نبوت کے زیر اہتمام سید عطاء اللہ بخاری علیہ رحمۃ الہی کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ مقررین میں ان کے فرزند سید ابوزر ابومعاویہ عطار منعم بھی تھے۔ جب ان کے تقریر کرنے کی باری آئی تو اناؤنس نے اعلان کیا، حضرات اب آپ کے سامنے صاحبزادہ عطار المنعم تشریف لاتے ہیں۔ ”سید عطار اللہ بخاریؒ نے اناؤنس کو مخاطب کر کے کہا، بھائی، یہ میرا بیٹا ہے، صاحبزادہ نہیں، ابھی تو میرے نکاح کے گواہ بھی زندہ ہیں۔“ اس سے اندازہ لگائیے کہ ہالے اکابر ”صاحبزادگی“ کو کتنا معیوب سمجھتے تھے۔

میں نے ایک بار مولانا سعید احمد کبر آبادی مرحوم سے یہ سنا کہ مفتی صاحب کے والد محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی نور اللہ مرقدہ سکندرہ تشریف لے گئے وہاں انہوں نے اکبر بادشاہ کی قبر پر مراقبہ کیا تو فوراً گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے ”بھاگو یہاں سے یہ تو عذابِ قبر میں مبتلا ہے۔“ وقت گزرنے کے ساتھ میرے ذہن سے حضرت مفتی صاحب قبلہ کا نام محو ہو گیا اور میں نے یہ واقعہ حضرت مطلوب الرحمن عثمانیؒ سے منسوب کر دیا۔ میں نے ایک بار یہ واقعہ مفتی صاحب کے سامنے بیان کر کے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے فرمایا ”نہیں یہ واقعہ تو خود اباجی کے ساتھ پیش آیا تھا۔“

حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمن عثمانیؒ روحانیت کے بڑے سادہ و سچے مقام پر تھے اور بڑی قوی نسبت رکھتے تھے۔ مفتی صاحب سے سنا ہے کہ جب ان کے چھ ماہ شاہ فضل الرحمن عثمانیؒ کے وصال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے فرزند گرامی مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ سے کہا کہ وہ انھیں توجہ دیں۔ سعادتمند بیٹے نے اسے گستاخی پر محمول کیا لیکن والد بزرگوار کے اصرار پر ان کے پلنگ کے قریب ہو کر انھیں توجہ دی۔ اس پر شاہ فضل الرحمن نے فرمایا ”الحمد للہ! میں دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا۔“ ایک بار میں دہلی گیا۔ ”مہرِ رسد“ ماضی قریب میں چھپ چکی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک نسخہ یہ عبارت لکھ کر مجھے عنایت فرمایا ”بگرامی خدمت برادرِ عزیز پر و فیض محمد اسلم صاحب، عتیق الرحمن عثمانیؒ۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے خور وں سے کس طرح پیش آتے تھے۔“

شیخ عبد اللہ نے اپنے دور وزارت میں سری نگر میں مولانا النور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں سیمینار کروایا جس میں بھارت کے فضلاء و بشمول حضرت قاری محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور، قاضی زمین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا احمد رضا بجنوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ اور جناب بدر الحسن قاسمی نے گراں قدر مقالے پیش کئے۔ حکومت کشمیر کے محکمہ اوقاف نے ان مقالات کو ”تجلیاتِ نور“ کے عنوان سے

شائع کر دیا۔ مجھے ان دنوں مولانا الکشمیریؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہ مولانا اکبر آبادی اور مفتی صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ رجب مولوی انظر شاہ نے دیوبند ٹائمز میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا اکبر آبادی پر کھلے بندوں سے سب و شتم کیا تو یہ عقیدت ختم ہو گئی۔ میں نے ان کے بارے میں عبدالرحمن کوندوا از ہر شاہ، انظر شاہ، مولانا محمد انوری لاہوری، مولانا حامد الانصاری غازی اور قاری محمد رضوان اللہ کی تصانیف جمع کر لی تھیں اور خود محمد بشیر نامی اسکالر سے تھیں لکھوایا تھا۔ تجلیاتِ اُور حائل ہی میں شائع ہوئی تھی اور پاکستان میں دستیاب نہ تھی۔ یہ کتاب سہنوز دہلی کے تاجران کتب کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔ میں جس روز لاہور روانہ ہونے والا تھا مجھے یہ کتاب مفتی صاحب کے کمرے میں پڑی ملی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ یہ کتاب مجھے دے دیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ سری نگر سے دوسرا نسخہ بآسانی منگوا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے بڑے سخت لہجے میں فرمایا ”بگڑ نہیں“۔ مدتوں تک یہ معاملہ لاینحل رہا کہ مفتی صاحب جیسے مشفق بزرگ نے، جو مجھے بیٹا اور داماد سمجھتے تھے، تجلیاتِ انور دینے سے کیوں انکار کر دیا۔ اب کبھی سوچتا ہوں تو اسے ان کی کتاب دوستی اور مولانا الکشمیریؒ سے عقیدت پر محمول کرتا ہوں۔

اب اتفاق دیکھئے کہ پاکستان پہنچنے کے چند روز بعد سری نگر سے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے لکھا کہ اسے ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر صاحبہ کی تصنیف ”سید علی سہرانیؒ“ کی اشد ضرورت ہے۔ سری نگر سے قیمت کی ادائیگی ممکن نہیں۔ میں نے اسے لکھا کہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، میں مطلوبہ کتاب بھیج رہا ہوں، تم مجھے ”تجلیاتِ انور“ بھیج دو۔ یوں مجھے یہ کتاب مل گئی۔

ایک بار میں دیوبند میں تھا اور مفتی صاحب بھی شوری کے اہلاس میں شرکت

کی وجہ سے وہیں تھے۔ شام کے وقت میں وید گاہ کی طرف نکل گیا۔ راستے میں ایک جوہڑ
میں دو تین بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں اور بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ان کی رکھوالی
کو رہا تھا۔ اتنے میں اس کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا
نہ تاؤ اپنے بیٹے کو بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دیہاتی کی
زبان پر پنجابی کا بڑا اثر ہے۔ میں نے اس کا ذکر مفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے
فرمایا ”پنجاب کے قرب کی وجہ سے پنجابی زبان کا اثر اس علاقے کی بولی پر ہے اور
یہاں تشدید بہت استعمال ہوتی ہے۔“

سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے میں ندوۃ المصنفین میں مقیم تھا ساہی دنوں
دیوبند میں شوری کا اجلاس ہونے والا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا
سعید احمد اکبر آبادی اور شاہ فضل اللہ شارح ادب المفرد علی گڑھ سے دہلی پہنچ گئے۔
قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی بھی وقت مقررہ پر جامعہ ملیہ سے دفتر برہان میں تشریف
لے آئے۔ مفتی صاحب پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ میں بھی اس قافے میں شامل ہو گیا۔ ٹرین
صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوئی۔ جب ٹرین میرٹھ پہنچی توقاضی صاحب یہ کہہ کر اتر گئے
کہ وہ اپنے گھر جا رہے ہیں اور اس کے بعد جانے والے ٹرین سے دیوبند پہنچ جائیں
گے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے چائے کی طلب تھی۔ میں نے چائے خریدی تو
قاضی صاحب کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ اس چائے کی قیمت وہ ادا کریں
گے۔ میں نے اصرار کیا کہ نہیں میں اس کے دام ادا کروں گا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ
میرٹھ ہے۔ یہ ان کا وطن ہے۔ اس لئے وہی اس کی قیمت ادا کریں گے۔ قاضی صاحب
قیمت ادا کر کے تشریف لے گئے۔ مجھے چائے پیتا دیکھ کر مفتی صاحب اور شاہ صاحب
نے بھی چائے پینے کا اظہار کیا۔ شاہ صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ میں لپک کر
ان کے لئے چائے لے آیا۔ مولانا اکبر آبادی ضرورت سے زیادہ نفاست پسند

موصوف حسب معمول مہمان خانے میں قیام فرما ہوں گے۔ شمیم صاحب نے بڑی ترشروئی سے جواب دیا کہ مجلس شوریٰ کے تمام اراکین دفتر ناظم تعلیمات میں قیام پذیر ہیں۔ مہمان خانہ غیر منکلی مہمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں پوچھتے پوچھتے ناظم تعلیمات کے دفتر میں پہنچا۔ مدہم سی روشنی میں میں نے مولانا اکبر آبادی کو پہچان لیا۔ ان کے پاؤں کو ہلایا تو مرحوم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معافۃ اور مصافحہ کے بعد فرمایا کہ برابر والا پلنگ میرے لئے مختص ہے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی، نیند بھلا کیسے آتی ہے ساڑھے چار بجے اذان ہو گئی۔ میں وضو کے لئے چلا گیا۔ واپس آیا تو تمام حضرات نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ قبلہ مفتی صاحب کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص دلسوز لہجے میں قرأت فرمائی۔ نماز اور دعا کے بعد میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔ ”کب آئے؟“ میں نے عرض کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ فرمایا ”اچھا کیا یہ تقریب بھی تمہارے دیکھنے کی چیز ہے۔“ اتنے میں ایک ملازم سکین بسکٹ اور چائے لے آیا۔ چائے پر مفتی صاحب کے علاوہ مولانا اکبر آبادی، تاحی زین العابدین سجاد۔ مولانا حکیم محمد زماں حسینی، مولانا عبدالحمیم گورینی والے اور مولانا امتیاز رحمانی بھی موجود تھے۔ تین چار روز ان حضرات کے ساتھ دیوبند میں صحبت رہی۔

دیوبند جانے سے دو تین ماہ پہلے میری ملاقات مولانا عزیز گل اسیر ماٹا سے ان کے گاؤں ”سیری“ نزد سنی کوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کا انٹرویو لیا اور جب اس ملاقات کی روداد لکھنے بیٹھا تو اٹھارہ صفحے کا اچھا حاشیہ مضمون تیار ہو گیا۔ دیوبند روانہ ہوتے وقت میں وہ مضمون اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے وہ مضمون مفتی صاحب کو دکھایا تو انھوں نے

وہ مجھ سے لے لیا اور میری ہائی کے اگلے شمارے میں ایک ہی قسط میں شائع کر دیا۔

ایک روز شیخ الہند کے شاگرد رشید اور حلقہ دیوبند کے معززین بزرگ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، سابق صدر شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، جنہیں مفتی صاحب کے والد بزرگوار سے بھی شرف تلمذ تھا، ناظم تعلیمات کے دفتر میں تشریف لائے۔ مفتی صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ”یہ بھی آپ کی طرح پروفیسر ہیں۔ اپنی کوئی تصنیف اگر ساتھ لائے ہیں، تو انہیں دیکھئے۔ یہ تاریخ کے استاد ہیں۔“ جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مجھے اپنی قیام گاہ میں لے گئے اور ”قائد بدر واحد“ اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے مرحمت فرمائی۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگریسی تھے اور موصوف جمعیۃ العلماء ہند کے اس گروپ میں شامل تھے جو تقسیم ہند کا سخت مخالف تھا۔ میں نے ان کا ایک فتویٰ پڑھا ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے کا محتاج ہے اور ملک کی منفعت اسی میں ہے کہ یہ متحد رہے۔ جس طرح چکی، ترازو اور قینچی ناقابل تقسیم ہیں اسی طرح ہندوستان بھی ناقابل تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں ان کا رویہ پاکستان کے بارے میں بڑا سخت تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے ”جب پاکستان قائم ہوا تو میرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی راج کراچی چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے مجھے بلانے کے لئے بڑا زور لگایا اور کئی خط لکھے، لیکن میں نہ گیا۔ انھوں نے کسی مدرسہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ سال بھر تک میرے لئے خالی رکھا۔ آخر انھوں نے تنگ آکر مجھے لکھا کہ تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ میں نے جواب دیا۔ چچا جان آپ ہی نے ہمیں وہ حدیث پڑھائی تھی کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں نہ جانا چاہئے۔ یہ پاکستان طاعون

ہی تو ہے۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خط لکھنا بند کر دیا۔ جب مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے تو اس سفر میں کراچی جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی پوہ ان دنوں حیات تھیں موصوف اپنی چچی سے ملنے گئے۔ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا چچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چند روپے بھی دیئے۔ مفتی صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ابھی ان کے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔

ایک بار میں دفتر برہان میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں خان غازی بھی وہاں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ کہنے لگا، ”میں سال میں ایک بار سیامی کارکنوں کی میٹنگ بلایا کرتا ہوں اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب بھی اس عرس کے لئے کچھ رقم دے دیا کرتے ہیں۔“ مفتی صاحب نے حسب معمول کچھ رقم اس کے حوالے کی اور وہ رخصت ہو گیا۔

برہان کے مفکر ملت نمبر میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے کہ جب علماء دیوبند نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کا فتویٰ دیا تو مولوی ظفر احمد تھانوی نے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا کہ بدیشی مال خریدنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ دینی حلقوں میں اس فتویٰ کے خلاف مہجانب پیدا ہو گیا۔ دیوبند میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس فتویٰ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار فرما رہے تھے لیکن دانستہ طور پر مفتی کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مفتی صاحب کی جوانی کا عالم تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت رندانہ سے کام لے کر باواز بلند کہا ”مولانا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ فتویٰ مولوی ظفر احمد تھانوی نے صادر کیا ہے، جن کے والد (عبد اللطیف) عیسائی ہو گئے تھے۔“ مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مفتی صاحب نے ایک سے زائد بار مجھ سے اس واقعہ

کا ذکر کیا ہے۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگریسی ضرورت تھے لیکن وہ غیر مسلم کانگریسی رہنماؤں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک بار خود ہی فرماتے تھے کہ ایک جلسے میں مرارجی ڈیسیائی (وزیر اعظم مقرر ہونے سے بہت عرصہ پہلے) تقریر کر رہے تھے۔ مرارجی نے مسلمانوں کے خلاف کوئی بات کی تو مفتی صاحب فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے : ”مرارجی اپنے الفاظ واپس لیں“ انھوں نے انکار کیا تو مفتی صاحب نے فرمایا ”آپ اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ میں ابھی آپ کو بازو سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے اتار دوں گا۔“ یہ تھی ان کی غیرت ایمانی کہ اپنے ایک دیرینہ سیاسی رفیق سے مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکے۔

گاندھی جی کی تحریک نہ کہ ساندھی اور ڈانڈی مارچ کے زمانے میں مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مقیم تھے اور انھوں نے اس زمانے میں دو تاریخ ساز فتوے جاری کئے۔ اولاً یہ کہ جس سیاسی کارکن کی جائیداد بحق سرکار ضبط کی جائے کسی شخص کے لئے اس کا خریدنا شرعاً حرام ہے۔ ثانیاً یہ کہ پانی نہک اور گھاس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی منفعت سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی زمانے میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی ایک حدیث سے یہی استدلال کیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کو مفتی صاحب کے فتویٰ سے بڑی تقویت ملی اور یہی فتویٰ گاندھی جی کے ساتھ ان کے تعارف کا سبب بنا۔ مفتی صاحب کو اپنی حق گوئی کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی اور کارکنان مدرسہ نے انھیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔

ایک مرتبہ میں جولائی میں لاہور سے علی گڑھ گیا اور چند روزہ میں رمضان شروع

ہو گیا۔ علی گڑھ میں تو بیس باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھتا رہا اور رات کو تراویح میں بھی شریک ہوتا رہا۔ علی گڑھ سے دہلی گیا تو روزے ترک کر دیئے۔ میرا قیام بھی حسب معمول دفتر برہان میں تھا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے ”مسافر کو رخصت ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ سفر میں روزے ترک کر دیئے۔ ورنہ بہت تکلیف ہوتی۔“ برادر گرامی علی گڑھ دفتر برہان کے اس برآمدے میں جہاں مفتی صاحب کی نشست ہوا کوئی تھی، رات کو میرے لئے پلنگ بچھا دیتے۔ میں بستر بردار تھا کہ مفتی صاحب نماز تراویح سے فارغ ہو کر تشریف لائے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے ”کیوں میاں ناشتہ کس وقت کرو گے؟ آٹھ بجے ٹھیک رہے گا؟“ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں روزہ نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ روزہ خور کو ناشتہ کرائیں۔ اس پر فرمانے لگے ”میاں تم مسافر ہو۔ تمہیں رخصت ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آخر ناشتہ تو کہیں کرو گے، پھر یہیں کر لینا۔ اگر سحری کے وقت چائے پینا پسند کرو، تو میں لے آؤں۔“ میں نے بصد غر معذرت چاہی اور بڑی مشکل سے انھیں ناشتہ لانے سے باز رکھا۔ مروجہ بار بار فرماتے تھے ”میاں تمہیں رخصت ہے۔ جب رخصت ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ خواہ مخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟“

یہ ان کی وسیع القوی اور تفقہ فی الدین کی بہترین دلیل ہے۔ ان کی جگہ اگر کوئی عالم دین ہوتا تو روزہ خور مسافر کو گھر سے نکال دیتا اور یہاں ناشتہ لانے پر اصرار ہو رہا تھا۔ اللہ اکبر۔ کیسے لوگ تھے یہ۔ ع

اب ڈھونڈو انھیں چراغِ رخ زیبائے کر

مفتی صاحب کی حیات میں میں پندرہ سولہ مرتبہ دہلی گیا ہوں گا۔ دہلی میں قیام ان ہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار میں ہوٹل میں ٹھہر گیا تو بہت ناراض ہوئے

اور اگلے روز میرا سامان دفتر برہان میں منگوا لیا۔ موصوف ہمیشہ کھانے پر اصرار کرتے۔ میں عرض کرتا کہ میں چند روز کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے بہت جگہ جانا ہے۔ اس لئے کھانے کے وقت اپنا پروگرام درمیان میں چھوڑ کر یہاں آنا ہوگا۔ اس لئے یہ پابندی میرے لئے مشکل ہے۔ اس پر بھی ایک بار شاندار نصیحت کرتے۔ ان کی صاحبزادی منیبہ خاتون، جنھیں ہم منی آپا کہتے ہیں، کئی طرح کے کھانے تیار کرتیں۔ مفتی صاحب مجھے دفتر سے اپنے گھر لے جاتے، منی آپا کا سلام پہنچاتے۔ کھانا شروع ہوتا تو اصرار کر کے مختلف چیزیں کھاتے۔ ایک بار سیخ کباب بھی دسترخوان پر موجود تھے۔ کبابوں کی پلیٹ میری طرف بڑھا۔ تہ فرمایا: ”میاں! یہ سیتا کبابی کے ہاں سے منگوائے ہیں۔ میرے گھر کا رہنے والا ہے اور بڑا عمدہ کباب بتاتا ہے۔ میں نے ہی اصرار کر کے اسے یہاں رکھا ہوا ہے۔ ذرا چکھ کر دیکھو۔“ صبح ناشتے کے وقت گھر سے چائے، کھن توں اور انڈہ لاتے، میاں محل سے پوریاں اور حلوہ منگواتے اور پھر اصرار کر کے کھلاتے۔ اگر میں عرض کرتا کہ ”آپ بھی کچھ لیجئے تو فرماتے“ میں بہت صبح ناشتے سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ یہ تمھارے لئے ہے۔“

وفات سے چند ماہ پہلے میں دہلی گیا۔ حسب معمول ندوۃ المصنفین میں قیام کیا۔ گھر پر ان کی عیادت کے لئے حاکم مہوا۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے تپاک سے ملے۔ گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں عید میاں اور ایک اور صاحب جن کا نام اب یاد نہیں پڑتا، انھیں بیکسر سار کرانے لگے۔ میں پاس بیٹھا تھا فرما نے لگے ”اب میں اچھا ہو رہا ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔“ میں نے تسلی دیتے ہوئے عرض کیا کہ یہ بھی جانی۔ بہت گراں آئے ہوئے ہیں۔ کیا یہ فرمانے سے کل شام کا کھانا نہیں کھالینا؟ میں نے عرض کیا کہ سب کھانا تو بہت کھایا

ہے۔ آپ تندرست ہو جائیں، پھر کھالیں گے۔ میں تو آتا ہی رہتا ہوں۔“ فرمانے لگے۔ پھر کیا ہوا۔ آخر کہیں تو کھانا کھاؤ گے، یہیں کھالینا۔“ ان کے اصرار پر میں نے حامی بھری۔ اگلے روز شام کو میں کھانے پر حاضر ہوا۔ اپنے پلنگ کے قریب ایک کرسی پر مجھے بٹھایا اور میز پر کھانا چنوا یا۔ میں کھانے بیٹھا تو فرمانے لگے ”میاں تکلف سے کام نہ لینا۔“ میں جتنی دیر وہاں رہا، بڑی شفقت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔

میں احباب کے لئے تحائف لے گیا تھا۔ ان میں ریشمی جا پانی کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس سے ایک زنا نہ تمیہیں تیار ہو سکتی تھی۔ میں نے وہ کپڑا مفتی صاحب کو تقماتے ہوئے کہا ”یہ ریحانہ نے منی آپا کے لئے بھیجا ہے۔“ مفتی صاحب نے وہ کپڑا منی آپا کو بھجوا دیا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے ”وہ کپڑا بہت عمدہ ہے۔ منی نے شکریہ ادا کیا ہے۔“ میں نے عرض کیا اس میں بھلا شکریہ کی کیا بات ہے، میں کئی بار مفتی صاحب کے لئے چائنا کے بنے ہوئے پن (قلم) جو پاکستان میں بارہ تیرہ روپے میں مل جاتا ہے، لے گیا۔ انھوں نے ہمیشہ اسے استعمال کیا۔

چند روز بعد میری اہلیہ بچوں کے ہمراہ دہلی گئیں۔ قیام غالباً شمس کاٹیج چوڑی والکن میں جناب عبدالقدیر کے ہاں تھا۔ ایک روز مفتی صاحب کی عیادت کو حاضر ہوئیں۔ مفتی صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور منی آپا سے کہنے لگے ”منی ذرا خیال رکھنا یہ میرے نواسے یو اسیاں ہیں، خالی ہاتھ نہ جائیں۔“ میری اہلیہ نے عرض کیا ”تایا جان رہنے دیجئے۔ آپ پہلے تندرست ہو جائیں پھر دیکھا جائے گا۔ اتنا روپیہ علاج پر اٹھ رہا ہے۔“ فرمانے لگے۔ یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ یہ بچے ہیں، ان کا خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔“ منی آپا سو روپے کا نوٹ

لے کر آئیں اور مفتی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے یہ رقم بچوں کے لئے دی۔
 ایک روز مفتی صاحب کسی کام کی غرض سے دیوبند روانہ ہونے لگے۔
 میں نے دریافت کیا کہ جب موصوف دیوبند جاتے ہیں تو وہاں نماز قصر ادا
 کرتے ہیں؟ اس پر فرمایا ”میں دیوبند کو اپنا وطن سمجھتا ہوں، دہلی میرا دوسرا
 وطن ہے، ابھی تک میں نے دیوبند کی سکونت ترک نہیں کی، اس لئے
 وہاں قصر نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں بھارت کے ہر سفر میں ایک پہاڑی مقام ضرور دیکھتا تھا۔ ایک
 بار مفتی صاحب فرمانے لگے ”کبھی چکروتہ بھی ہو آتے“ میں نے یہ نام
 پہلے نہیں سنا تھا اس لئے اس کا محل وقوع دریافت کیا۔ مفتی صاحب
 فرمانے لگے ”سہارنپور سے راستہ جاتا ہے۔ جب مولانا حفظ الرحمن بیمار
 ہوئے تو بحالی صحت کے لئے کچھ عرصہ کے لئے مرحوم چکروتہ چلے گئے تھے۔
 میں اور مولوی سعید بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں جانے والے راستے میں بڑے
 چکرا آتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام چکروتہ یعنی ”چکر آتا“ پڑ گیا۔“

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب برہان کا مفکر ملت نمبر نکلنے والا تھا
 تو برادر م عمید الرحمن کی تاکید اکید کے باوجود میں مفتی صاحب کے بارے
 میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میں کئی بار کاغذ اور قلم لے کر بیٹھا لیکن ہر بار بے کیف ہو کر
 اٹھ گیا۔ اب ان کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات لکھنے بیٹھا تو
 ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا ذہن میں پردہ سکرین کی طرح فلم چل رہی ہے
 اب ان کی زندگی کے مختلف گوشے میرے سامنے آ رہے ہیں۔ اب اس
 مضمون کو سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب ایسے نابغہ روزگار بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ کسی کیا خوب کہا ہے:

عمر بایہ تا یک مرد حق پیدا شود

بایزید اندر حرا سال یا اولیں اندر قرن

اب وہ سانچے ہی نہیں رہے جن میں ان بزرگوں کی سیرت اور کردار
ڈھلے تھے۔ جیسے بلند پایہ اساتذہ انھیں میسر آئے تھے اب ان کی پرچھائیاں
بھی نظر نہیں آتی۔ جس ماحول میں ان بزرگوں نے آنکھیں کھولی تھیں
اب ویسا پاکیزہ ماحول کیسے میسر آ سکتا ہے۔ مفتی صاحب اپنی سیرت و کردار
کے انمٹ نقوش جریدہ عالم پر ثبت کر کے جوار رحمت میں ابدی نیند جاسوئے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

دفتر برہان موجود ہے۔ برہان ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا
ہے۔ ندوۃ المصنفین قائم و دائم ہے۔ وہ کسی جس پر مفتی صاحب بیٹھا کرتے
تھے ہنوز اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی ہے۔ دفتر کا علم بھی موجود ہے لیکن
صاحب خانہ موجود نہیں۔ انھوں نے ایک تعزیتی جلسے میں نظیر اکبر آبادی کا یہ
شعر پڑھا تھا۔ میں اسی شعر پر مفتی صاحب کا ذکر خیر ختم کرتا ہوں۔

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساتی نہیں

جی میں آتا ہے لگا دیں آگ مینا نے کو ہم

شیخ القزاقاری عبدالواحد رامپوریؒ

جناب محمد نظر علی خاں ، سفارت خانہ کویت ، نئے دہلی ۔

آج سے تقریباً ۵۷ سال قبل رام پور کے افق پر ایک ستارہ طلوع ہوا تھا، اور بتاریخ ۸ اپریل ۱۹۸۶ء رام پور ہی میں غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

قاری عبدالواحد (عرف قاری چٹمن) ابن حمید الشہ مرحوم محلہ خرا دیان ، متصل دو محلہ روڈ، رامپور (سابق ریاست) کے رہنے والے تھے، بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور نابینا بھی ۔

میرے والد مرحوم میر منشی شوکت علی خاں صاحب ڈپٹی سکریٹری اجلاس سماں کے مکان کے متصل قاری صاحب کی والدہ مع اپنے بچوں کے رہتی تھیں، والد مرحوم کو وہ بھائی کہتی تھیں، اور مثل اپنے حقیقی بھائی کے جانتی تھیں، ہم لوگ انھیں پھوپھو کہتے تھے، اسی باعث قاری صاحب اور ان کے بھائی میرے والد کو ماموں کہا کرتے تھے، والد مرحوم ان کے اور ان کے بیٹوں کے ساتھ بہن بھائیوں

ہی جیسا سلوک کرتے تھے۔

قاری صاحب مرحوم بچپن ہی سے خوش آواز تھے۔ چنانچہ بچپن میں میری والدہ مرحومہ بھی ان سے نعت و منقبت کے اشعار سنا کرتی تھیں، اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی ریاست کے فرماں روا رامپور کے مشہور رئیس و وزیر قانون قمر شاہ خاں صاحب کے ہمراہ مدرسہ عالیہ تشریف لائے، مجھے (قاری صاحب کو) تلاوت قرآن کریم کے لئے بلایا گیا، جب میں نے تلاوت کی تو قمر شاہ خاں صاحب زار زار روتے تھے، اور مجھے انعام میں دونوں نے اپنی جیب سے خاصی رقم بھی عنایت فرمائی۔

ابتداء میں قاری صاحب نے قرآن کریم محلے میں حافظ اسماعیل صاحب سے حفظ کرنا شروع کیا۔ اور اسی زمانے میں مدرسہ غوثیہ (رام پور کی مشہور درسگاہ مدرسہ عالیہ کی شاخ) میں داخل ہوئے اور وہاں بھی قرآن شریف حفظ کیا۔ اس کے بعد قرأت و تجوید کی تعلیم قاری خلیل الرحمان ساکن نواکھالی، استاذ قرأت مدرسہ مطلق العلوم رامپور سے حاصل کی اور مختلف ہجرات قرأت بھی ان ہی سے سیکھے۔ قاری خلیل الرحمان صاحب نہایت خوش الحان تھے۔

اسی دوران قاری صاحب نے مشہور قاری عبدالرحمان خاں صاحب رامپوری (فرزند شیخ القراۃ والتجوید علی حسین خاں صاحب) کو پورا قرآن شریف سنایا اور ان ہی سے تکمیل قرأت و تجوید کی۔

مشہور دیس گاہ مدرسہ فرقانیہ میں قاری محمد نظر صاحب سے قرأت قرآن کریم کی مشق کی۔

تکمیل حفظ و قرأت کے بعد مسند تدریس کلام الشریعہ مدرسہ مطلق العلوم رامپور میں فائز ہو گئے۔

دورانِ تدریس قاری عبدالواحد صاحب بھوپال بھی گئے، اور کچھ عرصے وہاں رہ کر قاری محمود صاحب مکی صدر مدرس قرارت و تجوید مدرسہ علیہ دین بھوپال کو قرآن شریف سنایا اور ان سے سند قرارت حاصل کی۔

قاری محمود صاحب، قاری صاحب کی قرارت و خوش الحانی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم والی بھوپال سے قاری صاحب کی ملاقات کرائی، نواب صاحب نے قاری عبدالواحد صاحب سے قرآن شریف سنا اور بہت محفوظ ہوئے اور کرایہ آمدورفت بھوپال کے نام سے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔

قاری عبدالواحد صاحب نے دیوبند میں بھی تقریباً چار ماہ رہ کر ہندوستان کے مشہور قاری استاذ القراء حضرت مولانا قاری حفظ الرحمن صدر شعبہ قرارت و تجوید دارالعلوم دیوبند کو پورا قرآن عظیم سنایا اور ان سے بھی سند حاصل کی۔ قاری حفظ الرحمن صاحب نے اپنے دست مبارک سے سند کے آخر میں تحریر فرمایا تھا کہ ”قاری عبدالواحد صاحب اپنے فن میں بے مثل ہیں“ اور آخر میں قاری صاحب نے رامپور کے مشہور قاری علی محمد صاحب سنبھلی کو پورا قرآن شریف سنایا اور ان سے بھی سلسلہ پانی پت کی سند حاصل کی۔

آغاز ہی میں تحریر کر چکا ہوں کہ قاری عبدالواحد نے سب سے پہلے مدرسہ مطلع العلوم میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد مشہور عالم دین مولانا عبدالوہاب خاں صاحب کے مدرسہ جامعۃ المعارف میں قرارت قرآن کریم کے مدرس مقرر ہوئے، پھر مدرسہ پنجابیان گھیر مردان خاں میں صدر شعبہ قرارت و تجوید کے عہدے پر کام کیا۔

کچھ عرصے قاری صاحب نے مسجد گھیر غلام ناصر خاں دو محلہ میں، اور منشی

عبدالمجید صاحب قریشی مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ گلشن بغداد میں، نیز سید
امجد میاں صاحب کے قائم کردہ مدرسے (محلہ پلا تالاب) میں بھی تدریس تلاوت و
تجوید کلام اللہ کے تبرکات تقسیم کئے۔

کئی سال تک سہ پہر کے وقت، جماعت اسلامی رام پور کی درس گاہ میں بھی
تدریس قرآن عظیم کا اشتغال رہا، درس گاہ کے بہت سے طلبہ جو آج کل
مراتب عالیہ پر فائز ہیں آپ سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔

دوران تدریس مدارس مذکورہ، قاری صاحب اپنے گھر پر صبح و شام محفل
درس کلام اللہ سجاتے تھے، جس سے مقامی و بیرونی تشنگانِ قرارت کلام الہی
سیراب ہوتے تھے۔

عمر کے آخری دور میں اپنے گھر پر اپنے قائم کردہ مدرسہ عاصمیہ تجوید القرآن
میں قرارت کلام اللہ کا درس دیتے ہوئے اعظم و اکبر سے جا ملے۔ تغمذہ اللہ
بغنیح جناتہ۔

رامپور میں قرارت و تجوید کا چرچا شیخ القراء حضرت مولانا قاری علی حسین
خال صاحب رامپوری (شاگرد امام القراء قاری عبدالرحمان محدث پانی پتی
رحمۃ اللہ علیہ) کی ذات بابرکات سے ہوا۔

قاری علی حسین خاں صاحب کے علاوہ دیگر قرار کرام خصوصاً خاندان
مجددیہ کے بعض افراد مثلاً قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی وغیرہ بھی مسند
درس قرارت و تجوید پر فائز ہوئے اور اس فن شریف میں کمال پیدا کیا،
جن سے اہل رامپور مستفید ہوئے۔

نامناسب ہو گا اگر اس بابرکت سلسلے میں جناب قاری عبدالحق خاں صاحب
مظلہ رامپوری حال مقیم کراچی پاکستان کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف، کالجین داؤدی

اور ایسی بلند آواز کے ساتھ قرارت کہ باید و شاید، رام پور والوں کو آج بھی یاد ہے۔ آپ سے بھی اہل رامپور نے کافی استفادہ کیا۔ لیکن رامپور میں جس قدر فروغ و اشاعت تجوید قرآن کریم قاری عبدالواحد صاحب کی ذات سے ہوا، اتنا کسی اور سے نہیں ہوا۔

قرآن کریم تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، بعض حروف کی غلط ادائیگی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے بقدر ضرورت قرآن کریم (یعنی جتنا قرآن شریف نماز میں پڑھا جاتا ہے) صحیح پڑھنا بہت ضروری ہے اور بحسنِ طبع حرام ہے خصوصاً ائمہ مساجد کے لئے اس کتابِ عظیم کی تلاوت تجوید کے ساتھ اشد ضروری ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جو قرآن کریم غلط پڑھتا ہو، صحیح نہیں ہے۔

قاری عبدالواحد صاحب کے میدانِ قرارت و تجوید میں درود سے قبل عام طور پر رام پور کے گھروں میں قرآن شریف صحیح طور پر پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی، الا ماشاء اللہ۔ اور مساجد رامپور میں بھی بالعموم صحتِ تلاوت کلام اللہ کا اہتمام نہیں تھا۔ یہ قاری صاحب کی شدتِ کوشش تھی جس نے لوگوں کو قرآن شریف صحیح پڑھنے کی طرف متوجہ کیا۔ قاری صاحب کا نہایت شدت و غصے سے یہ فرمانا کہ قرآن کریم کے الفاظ کی ادائیگی صحیح مخارج کے ساتھ نہ کرنا سخت گناہ ہے، مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ کہتے وقت اُن کے چہرے کی کیفیت، اور غصے سے اُن کے چہرے کا سُرخ ہو جانا، گویا آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ قاری صاحب کی سچی تلخ گفتاری اور جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ قرآن کریم صحیح پڑھنے لگے، اور اپنے بچوں کو بھی قرآن صحیح طور پر تجوید کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرنے لگے، نیز مساجد میں ایسے ائمہ کا تقرر ہونے لگا

جو قرآنِ کریم صحیح پڑھتے ہوں۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم حروف کی ادائیگی بہت عمدہ طور پر مخارج و صفات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے تھے۔ کثرتِ مشق سے صحیح ادائیگی برآپ کو ایسی قدرت اور اس کی ایسی مزا دلت ہو گئی تھی کہ اگر آپ سوئے میں بھی قرآن شریف پڑھتے تو صحیح ہی پڑھتے۔ حرفِ ضاد (ض) جس کا صحیح طور پر ادا کرنا دشوار ہے، جب آپ ادا کرتے تھے تو آپ کے مخالفین بھی کہتے تھے کہ یہ تو اسی طرح ادا کر رہے ہیں جیسے ہم چاہتے ہیں، اور اس طرح اس حرف کی ادائیگی صحیح ہے، البتہ ان کے شاگرد اس حرف کو صحیح ادا نہیں کرتے، حرفِ ظار سے بہت مشابہ کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کثرتِ مشق اور ریاضت کی وجہ سے آپ اس قدر عمدہ ادا کرتے تھے کہ وہ لوگ (مخالفین) سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آپ نے کیسے ادا کیا، جس پر آپ مسکراتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں تو وہی ادا کرتا ہوں جسے صحیح سمجھتا ہوں اپنی مائے کے مطابق۔

قاری صاحب کا لہجہ اس قدر مؤثر تھا اور آپ اس قدر خوش الحان تھے کہ ایامِ جوانی میں اور ادھیڑ عمر تک جب بھی آپ قرآنِ کریم پڑھتے تھے لوگوں پر گریہ طاری ہو جاتا تھا اور سننے والے بخود ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ صبح کے وقت دو محلہ روڈ پر آپ اپنی بیٹھک میں بنگالی و منی پوری طلبہ کو قرآن شریف پڑھا رہے ہیں اور راہ گیر قاری صاحب مرحوم کی قرأت سن کر سڑک پر رک گئے ہیں اور ذوق و شوق سے معجز قرآن کی معجز قرأت سماعت کر رہے ہیں اور جھوم رہے ہیں۔ ایک مرتبہ گھیر مردانِ خاں میں تراویح میں قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ ادھر سے رامپور کے ایک مشہور مجذوب صفت حافظِ کلام اقبال واجد الدین احمد خاں کا گذر ہوا، وہ ٹھہر گئے اور جھومنے لگے

اور والہانہ انداز میں کہنے لگے ، معلوم ہوتا ہے نزول قرآن ہو رہا ہے ۔ آخری دور یعنی کبر سنی میں گو آواز پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن بلحاظ فن یکتائے روزگار تھے ۔

ایک زمانے میں حرفِ ضاد (ض) کی ادائیگی کے قضیے کے سلسلے میں قاری صاحب نے پوسٹر بھی شائع کئے تھے ، اور ان کے خلاف بھی پوسٹر شائع ہوئے تھے ، قاری عبد الواحد صاحب کا موقف تھا کہ حرف (ض) مشتبہ الصوت بالظاہر ہے نہ کہ بالداخل ، کیونکہ بہ لحاظ صفات یہ حرف (ظ) سے مشترک ہے نہ کہ (د) سے ۔ علاوہ ازیں اس حرف کو ”أصعب الحروف“ کہا گیا ہے ، اور (د) سے تشابہ کی صورت میں نہایت آسانی سے ادا ہو جاتا ہے ، البتہ تشابہ بالظاہر کی صورت میں ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے ۔ قاری صاحب اپنے اس موقف کی دلیل میں کتب قرأت وفقہ کی عبارتیں پیش فرماتے تھے ۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ یاد آگیا ۔

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے شیخ ، شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ جس عمدگی سے حرف ضاد (ض) ادا فرماتے تھے ، ہم سے ادا نہیں ہو سکا ۔ غرض کہ اس مسئلہ کے قضیہ میں میدان قاری عبد الواحد صاحب کے ہاتھ رہا ۔

قاری صاحب نماز تراویح میں پورا قرآن شریف ختم کرنے کی صورت میں بسم اللہ بالجہر کے قائل تھے اور سختی سے اس پر عمل پیرا تھے ۔ ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی ”مسئلہ تسمیہ“ کے نام سے آپ نے اس مسئلے پر شائع کیا تھا ۔

قاری صاحب مرحوم کے مزاج میں تیزی تھی ، اور جلد ہی غصے سے پھر جاتے تھے ۔ کبھی کبھی سب و شتم بھی کرتے تھے ۔ آپ کے ایک افغانی

شاگرد مولوی شیر بہادر، جو موتی مسجد (رام پور) میں امام تھے، کہتے تھے کہ قاری صاحب آپ اسی زبان سے جس سے تلاوت کلام اللہ کرتے ہیں، سب و شتم بھی کرتے ہیں۔ جو اباقاری صاحب فرماتے تھے کہ مولانا کیا کروں، ناشائستہ واقعات سن کر دل کڑھتا ہے، آنکھیں نہیں ہیں ورنہ ہاتھوں کا استعمال کرتا۔ لیکن یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ وہ دل کے صاف تھے۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے قاری صاحب ”دہلی“ مشہور تھے، لیکن اس کے باوجود چشتی بزرگ حضرت مولانا سید غلام محی الدین صاحب سے (جن سے قاری صاحب بیعت تھے) اور اپنے پیر کے پاس ان کی وفات تک آمد و رفت رکھی اور وفات کے بعد بھی ان کے صاحبزادے سید جمیل میاں صاحب چشتی نظامی، جو قاری صاحب کے شاگرد بھی ہیں، کے پاس آتے جاتے رہے۔ مرشد بھی قاری صاحب سے محبت کرتے تھے، اور اپنے صاحب کمال مرید کی تکریم کرتے تھے۔

موجودہ دور کے علماء میں قاری صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا سید عبدالداکم جلالیؒ سے زیادہ متاثر تھے۔ قاری صاحب موزوں طبع ہونے کے باعث کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے بالخصوص نعت ترنم سے پڑھتے تھے۔

مدرسہ مطبع العلوم کے مدرسے کے زمانے کا ایک واقعہ قاری صاحب اس طرح سناتے تھے کہ میرے ایک شہناشا مولانا محمد قمر صاحب ولایتی، شہوات کے پہننے والے نہایت صالح آدمی تھے، بیرون شہر ایک مسجد میں (جو رضا انٹر کالج کی تاسیس کے بعد اس کے احاطے میں آگئی ہے) قیام پذیر تھے، اور اسی غیر آباد مسجد میں امامت بھی کرتے تھے، میں ان کے پاس آمد و رفت رکھتا تھا، ایک روز

مجھ سے مولانا قمر صاحب نے کہا، کہ دو جوان جو قومِ آجہدہ میں سے ہیں، آپ سے قرآن شریف پڑھیں گے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، پہلی شرط یہ ہے کہ آپ انہیں مدرسے کے اوقات میں نہیں پڑھائیں گے، بلکہ ایک بجے کے بعد جب طلبہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے تب انہیں پڑھائیں گے۔ دوسرے آپ ان سے کسی قسم کا سوال ان کے جن ہونے سے متعلق نہ کریں گے۔ قاری صاحب نے ان دو شرطوں کو مان کر ان کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک ماہ تک تو قاری صاحب اپنے مزاج کے خلاف خاموشی سے ان کو پڑھاتے رہے، اس کے بعد قاری صاحب سے صبر نہیں ہو سکا، اور ایک روز ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا کہ کیا بات ہے کہ جب تم میرے قریب بیٹھتے ہو تو مجھے شدید گرمی محسوس ہوتی ہے، اور جب تم چلے جاتے ہو تو گرمی ختم ہو جاتی ہے، کیا تم جن ہو؟ حالانکہ قاری صاحب کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ دونوں جن ہیں، لیکن قاری صاحب بھی اپنے غصے اور تیزی مزاج میں مثل جن تھے، اس لئے غیر ارادی طور پر انہیں جن کہہ دیا۔ ان دونوں نے مولانا مخدوم صاحب کو یہ واقعہ سنا کر ان سے شکایت کی۔ قمر صاحب نے قاری صاحب کو بلا کر ان سے معلوم کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا، جبکہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس امر کا اظہار کہ وہ جن ہیں نہیں کریں گے، قاری صاحب نے کہا کہ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل گیا، جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، اس پر قمر صاحب نے کہا کہ آئندہ وہ دونوں آپ کے پاس نہیں جائیں گے، اور آپ کو میرے تعلق کی وجہ سے ایذا تو نہیں دیں گے لیکن آپ کو قرأت قرآن عظیم کی تکمیل کے بعد جو فائدہ ان دونوں سے پہنچتا وہ بھی ختم ہو گیا۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم مغفور اپنے شاگردوں کی تعداد ۱۹۷۶ء میں یعنی اپنے انتقال سے دس سال قبل مجھے اس طرح بتاتے تھے۔

دس ہزار طلبہ نے بقدر ماہجوز بہ الصلوٰۃ قرآن کریم پڑھا۔

دو ہزار طلبہ نے قرآن کریم مکمل ناظرہ پڑھا۔

اور دو سو پچیس طلبہ نے پورا قرآن کریم حفظ کیا۔

اس تعداد میں آخری دس سال (۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء) کے طلبہ شمار نہیں کئے گئے ہیں۔ اللہ اکبر اس سے بڑی نعمت اور کامیابی کیا ہوگی کہ اس قدر کثیر تعداد کو سب سے عظیم کتاب قرآن کریم صحیح طور پر پڑھنا سکھا دی۔ چند مشہور شاگردوں کے نام ذیل میں مندرج ہیں، جن میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے پورا قرآن شریف پڑھا، اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے قاری صاحب سے چند پارے یا چند سورتیں قرآن کریم کی پڑھیں اور ان کی تصحیح کی، قاری احمد الزماں صاحب صدیقی میٹائی، قاری عبدالرحمان صاحب جے پوری،

قاری خلیل میاں صاحب مجددی، قاری سردار خاں صاحب بریلی،

قاری صولت علی، قاری خالد شمس، قاری مختار احمد شمس،

مولوی قاری ریاض الدین خاں صاحب، مولوی قاری عرفان صاحب شمس،

قاری طفیل صاحب، قاری وقار احمد شمس، قاری زبیر احمد شمس،

مولوی قاری محمد حسین شمس، حافظ مقبول صاحب، مولوی قاری فضل الرحمان صاحب مجذوب

فرزند مولانا رفیق صاحب مرحوم، جناب مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی

ہند، جناب شجاعت اللہ صدیقی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جده، جناب

مختار علی خاں فرزند حضرت مولانا اتیار علی خاں عرشی مرحوم، جناب مزل حسین

صدیقی، جناب مدثر حسین صدیقی، ڈاکٹر مولوی ماہد علی خاں صاحب ریڈر

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب حافظ اشتیاق علی خاں صاحب کینیڈا،

جناب قاری راشد مجددی ناظم شعبہ قرارت مدرسہ عالیہ، جناب محمد ارشاد علی خاں

مدرس ذوالفقار ہائی اسکول و برادر مضمون نگار اور مضمون نگار محمد نظر علی خاں۔

قاری صاحب کی نماز جنازہ درس گاہ جماعت اسلامی رام پور میں سید جمیل میاں صاحب فرزند مولانا غلام محی الدین صاحب کی اقتدار میں ادا کی گئی، اور تدفین سید جمیل میاں کے ایما پر پیر و مرشد کے مزار کے متصل محلہ احاطہ (جو ہاتھ کے نام سے مشہور ہے) رام پور میں ہوئی۔

قاری صاحب کی زندگی کے دو پہلو تھے جو بعد از وفات بھی نمایاں رہے۔

فدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

احسان کی روش

(قرآن کی روشنی میں)

از جناب محمد بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پٹنہ

ایمان لانے کے دو تقاضے ہیں۔ ایک تقویٰ کی روش اختیار کرنی اور دوسرا احسان کی۔ اول الذکر کا تعلق دل سے ہے اور موخر الذکر کا عمل سے۔ جو دل خدا کے خوف سے خالی ہے وہ تقویٰ سے خالی ہے اور جس عمل میں نیکی اور خیر کا پہلو نہ ہو وہ کفر کے مترادف ہے۔ تقویٰ اور احسان اطاعتِ الہی کے لازم و ملزوم پہلو ہیں اور یہی ایمان کے سکے کے دو رخ ہیں۔ یہی دونوں ایک مومن کو اللہ سے قریب کرتے ہیں۔ فرمایا:

”اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے
ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں (إِنَّ اللَّهَ مَعَ
الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ)“

(۱۶: ۱۶)

قرآن کا نزول عام انسانوں کے لئے ہے مگر اس سے ہدایت وہی پاتے ہیں

یا پا سکتے ہیں جو تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ ارشاد ہے :

”یہ (قرآن) اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں۔ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے (ہُدٰی

لِّلْمُتَّقِیْنَ)“ — (۱:۲)

”یہ کتاب حکیم (قرآن) کی آیات ہیں۔ ہدایت اور رحمت

نیکوکار لوگوں کے لئے (ہُدٰی ذَآئِمَةً

لِّلْمُحْسِنِیْنَ) — (۱:۳۱)

احسان لفظ حسن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو اپنی پوری قابلیت اور صلاحیت کو بروئے کار لا کر، اپنے سارے وسائل کو صرف کرتے ہوئے، دل و جان سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ مگر اپنے اس فعل و عمل میں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہ کر اچھے کام کرنا، جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے پرہیز کرنا، جو فرمان الہی ہے، اسے ماننا، حق کو حق جاننا اور حق کی حمایت کرنی اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنی۔ یہی احسان کی روش کے تقاضے ہیں۔

ایمان کے ان دو تقاضوں، یعنی تقویٰ کی روش کے ساتھ ساتھ احسان کی روش اختیار کرنے کے متعلق فرمایا خدائے تعالیٰ نے :

”جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے

انہوں نے پہلے جو کچھ کھا یا پیا تھا اس پر کوئی

گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچتے
 رہیں جو حرام کی گئی ہیں۔ اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور
 اچھے کام کریں۔ پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس
 سے بچیں، جو فرمانِ الہی ہے اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی
 کے ساتھ نیک رویہ رکھیں (إِذَا مَا اتَّقَوْا وَاْمَنُوا
 دَعَاوُ الصَّالِحَاتِ تَتَذَكَّرُ اتَّقُوا وَاْمَنُوا
 تَتَذَكَّرُ اتَّقُوا وَاْمَنُوا)۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند
 کرتا ہے (وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ)۔

(۱۲: ۵)

ان آیات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ احسان کی روش یہ ہے کہ
 انسان عملاً نیک ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ صرف حوالگی اور سپردگی کا اعلان کرے
 بلکہ وہ رویہ اختیار کرے جو خدا کے ایک طبع فرمانبردار بندے کو کرنا چاہئے۔
 اسی روش پر چلنے والے وہ سہارا تمام لیتے ہیں جو انہیں حیاتِ ابدی کی منزل
 تک پہنچا دیتا ہے۔

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور
 نیکو کار ہو (وَهُوَ مُحْسِنٌ) تو اس نے
 فی الواقع ایک بھروسے کا سہارا تمام لیا
 اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی
 کے ہاتھ ہے۔ (۳: ۱۳۱)

خدا کو خوف و طمع سے بچنا بھی احسان کی روش میں شامل ہے جو
 رحمتِ الہی کا باعث بنتی ہے :

”اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے
ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیکو کار لوگوں کے قریب
ہے۔ (وَادْعُوا خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ
رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ)“

— (۷:۷۰)

انسانی معاشرے کی درستگی اور اس کی صحت مند تشکیل کے لئے
خدا نے، ان لوگوں کو جنہوں نے سیر تسلیم خم کر دیا ہے، یہ ہدایت دی ہے
کہ:

”اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا
ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے
منع کرتا ہے“ — (۱۶: ۱۳)

اس آیت میں پہلی چیز عدل اور دوسری احسان ہے۔ جس سے مراد نیک برادر
فیانسانہ سلوک، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، باہمی مراعات، ایک
دوسرے کا پاس و لحاظ بھی شامل ہے۔ اجتماعی زندگی میں عدل اگر معاشرہ
کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور شس کا کمال۔ عدل اگر معاشرہ کی
ناگوار یوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں پیدا
کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں احسان کی روشنی اجتماعی محسن کو نشوونما دینے
والا سب سے اہم جذبہ ہے

محسن کی صفات و خصوصیات قرآن میں مختلف سورتوں میں وارد ہوئی

ہیں۔ نفسِ مضمون کو ملحوظ رکھ کر، چند ایسی آیات درج ذیل نقل کی جا رہی ہیں :

”ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ (ایمان لانے والے) پھیلے اور منکرینِ حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے (عداوتِ حق) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے اُن کے حق میں عملِ صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے یہاں محسنوں کا حقِ خدمت مایہ نہیں جاتا۔ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) — (۱۵: ۹)

یہی بات محسنات سے بھی دہرائی گئی ہے جس کا اطلاق مردوں پر بھی ہوتا ہے کہ :

”اگر تم (نبیؐ کی بیوی) اللہ اور اُس کے رسولؐ اور دائرِ آخرت کے طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے اُن کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے (فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنِیْنَ مِثْرًا اَجْرًا عَظِیْمًا) — (۳: ۳۳)

احسان کی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ اجر اس لئے مہیا کر رکھا گیا ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ :

”نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ (هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ) — (۳: ۵۵)

”تم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں (وَكُذَلِكِ

تَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)۔ (۱۰ : ۶)

احسان کی روش اختیار کرنے والوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ :

”جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا

وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ انھیں اپنے رب

کے یہاں سے وہ سب کچھ ملے گا جن کی وہ خواہش

کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا (ذَلِكَ

جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ)۔ (۴ : ۳۹)

اسلام کا نظام حکومت

مؤلف : مولانا حامد الانصاری غازی

اس کتاب میں اسلام کی ریاست کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطہ حکومت پیش

کیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان تالیف اسلام کا نظام حکومت ہی پیش نہیں کرتی بلکہ نظریہ سیاست

سلطنت بھی منظر عام پر لاتی ہے۔ طرز تحریر زمانہ حال کے عین مطابق ہے۔

ہمارے لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جو قانون قرآن، نبوت اور دستور صحابہ کے

علاوہ اسلام کے علماء اجتماعیات کی بے شمار کتابوں اور محرم حاضر کے نو شعور اور سالہا

سال کی عرق ریزی کے بعد سامنے آئی ہے۔ صفحات ۴۶۴، بڑی تقطیع

قیمت : تیس روپے ۳۰/-

مجلد اعلیٰ کو الٹی چالیس روپے ۴۰/-

ندوة المصنفین، امادو بازار، جامع مسجد دہلی

خلافت عباسیہ اور ہندوستان

از مولانا قاضی الطہر مبادی پوری

ہندوستان میں ۱۱۵ سالہ عباسی دورِ خلافت کے غزوات، فتوحات اور اہم واقعات و حادثات، عباسی امراء و حکام کے ملکی و شہری انتظامات، عرب و ہند کے درمیان گونا گوں تجارتی تعلقات، بحرِ بصرہ کے ماتحت بحری امن و امان کا پیام، ہندی علوم و فنون اور علماء اسلام اور ہندی موالی و ممالک وغیرہ مستقل عنوانات پر نہایت مدلل و مستند معلومات پیش کی گئی ہیں۔ نیز یہاں کے مسلمانوں و غیر مسلموں کے عالم اسلام سے فکری و علمی اور تہذیبی روابط کی تفصیلات درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء و امراء نے پہلی بار افسانوی ہندوستان کو دنیا کے سامنے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے

قیمت غیر مجلد چالیس روپے

مجلد عمدہ ریگزین پچاس روپے

ندوة المصنفین، اردو باناد

جامع مسجد دہلی

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۲)

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ، سکالر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمانوں کے پہونچنے سے پہلے اسپین کے عوام طرح طرح کے سکیوں کے بوجھ میں دبے ہوئے تھے۔ حکمران طبقہ ان حالات سے نہ صرف بے بہرہ تھا بلکہ ان کی مشکلات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ مذہبی طور پر وہاں بڑی آبادی عیسائیوں اور دوسرے درجے میں یہودیوں کی تھی۔ دونوں ہی کی سماجی زندگی خراب تھی۔ لیکن خاص طور پر یہودی اور بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ اس کے علاوہ وہاں گاتھوں کی حکومت تھی جو خود بھی آپس کی رسہ کشی اور انتشار میں الجھے ہوئے تھے۔ نام لوگوں کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئی اور نتیجتاً اسپین پر مسلمانوں کے حملے اور اس میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ خود اسپین کے لوگ ثابت ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے کرہ زار کی عظمت سے متاثر ہو کر انھیں اسپین آنے کی دعوت دی تھی اور مسلمانوں نے وہاں کے بہت سے شہروں اور علاقوں کو بغیر کسی مزاحمت کے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ اس دور حکومت قائم ہونے سے پہلے اسپین کی سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں پر ایک ایسے حزن و غم شامی خاندان اور مذہبی رہنماؤں کا تھا۔ دوسرے طبقہ مزدور سے لے کر کسانوں کا تھا۔ تیسرا طبقہ ان

یہودیوں کا تھا جن پر عیسائیوں نے بہت مظالم کئے تھے۔ انھیں پورے شہری حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد سماجی زندگی میں بڑی تبدیلی آئی۔ مسلمانوں نے ان تینوں طبقوں کو برابر کے شہری حقوق اور عہدے دئے اس کے علاوہ جو عرب قبیلے ملک شام اور یمن سے وہاں آکر آباد ہوئے ان کو بھی وہی حیثیت دی گئی جو اسپین کے دوسرے باشندوں کو حاصل تھی۔ اسی طرح دوسری غیر مسلم اقوام کو بھی مساوی مرتبہ دیا گیا۔ مسلمان عیسائی اور یہودیوں کو اہل کتاب مانتے تھے اس لئے ان کے درمیان استدا جی رشتوں کا آغاز و فروغ ہوا۔ یہودیوں کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک اس حد تک کیا گیا کہ وہ جن زمینوں پر کاشت کرتے تھے وہ زمینیں ان کو عطا کر دی گئیں۔ اس داد و دہش اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوا کہ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے مذہب کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے عربی زبان سیکھی۔

فتح اسپین کے بعد آٹھویں صدی کے شروع میں عرب قبائل اسپین میں آکر تیزی سے آباد ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے لئے سرسبز و شاداب علاقے پسند کئے۔ حکومت کی جانب سے عوام کے لئے جا بجا حمام بنوائے گئے۔ چنانچہ قرطبہ میں حمام کی تعداد آٹھ سو بتائی جاتی ہے اور اس طرح وہاں بڑے بڑے شہروں میں پانی پہنچانے کے لئے نہروں کا جال بچھایا گیا، غرضیکہ وہاں ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا اور عافیت سے پھر سماجی زندگی بسر ہونے لگی۔ ابتدائی زمانے میں مسجد سے متصل ہی مدرسے قائم کئے گئے۔ سب سے بڑی جامعہ قرطبہ میں تھی جس میں ہزاروں طلباء تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔

سند دینے کے رواج اور دستور اسی زمانے سے شروع ہوا ہے۔ مذکور بالا قسم کے عرب قبیلے اپنے تہذیب و اخلاق اور اہوار و عادات کے ساتھ ساتھ

اپنی زبان اسپین لے گئے۔ ان تمام چیزوں کا گہرا اثر وہیں کلم عیسائی اور یہودی آبادی پر پڑا۔ اس کے علاوہ عربوں اور مقامی عیسائیوں کے درمیان شادی کے رواج نے اس اثر پذیری کو مزید تقویت دی۔ جزائیائی طور پر عرب و اسپین اور مذہبی سطح پر اسلام اور عیسائیت اور ان دونوں معاشرہ کی زبانوں کے اختلاط و امتزاج کے نتیجہ میں سو سال سے کم مدت میں ہی ایک ملی جلی نئی تہذیب اور مشترکہ سماج وجود میں آگیا اور مسلمانوں کے حسن عمل کی وجہ سے اسپین میں بہت جلد اسلامی تہذیب مقبول ہو گئی اور مقامی آبادی کی اکثریت نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا اور وہ لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ انھوں نے بھی اسلامی تہذیب، وضع قطع اور طور طریقوں اور عربی زبان کو حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ "مضارب" کہلاتے تھے ان کے لباس، وضع قطع اور طور طریقوں میں عربوں سے زیادہ فرق نہ تھا۔ تاہم اس سلسلے میں مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا اور غیر مسلموں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر معاملہ ان کے اپنے آدمیوں کے درمیان ہو تو وہ اسے اپنے مذہبی قانون کے مطابق خود انہی عدالتوں میں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایک فرقہ مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا تو فیصلہ مسلم عدالت میں مسلمان قاضی کرتا تھا۔ مسلمانوں کی اس پالیسی کی وجہ سے اسپین میں تہذیب و تمدن کی بڑی ترقی ہوئی۔ مسلمانوں کو اسپین کی گاتھک تہذیب سے خود بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مثلاً اسپین میں مسلمانوں نے جو عمارتیں، محلات اور مسجدیں بنائیں تو ان میں گاتھک اسٹائل اور اسلامی فن تعمیر کے امتزاج سے ایک نیا اور دنیا کا حسین ترین فن تعمیر ایجاد ہوا اور جو مسجد قرطبہ اور غرناطہ کے محسوس ہمارے آج بھی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب کے میدان میں مسلم اور عیسائی تہذیب کے میل جول کے نتیجہ میں عربی زبان میں نئے اسالیب پیدا ہوئے مثلاً چودہ

پندرہ لاکھوں والی گیت نما نظم جس کو ”موشیات“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یا گیتوں کی اور قسم جس کو ”نرتیل“ کہا جاتا ہے اسی اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ یہ طرز معاشرت جو مسلم حکومت کے تحت اسپین میں پیدا ہوا تھا۔ اس میں مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں حکمران طبقہ کی حیثیت سے عربوں میں غلبہ حاصل رہا۔ بعد میں شمالی افریقہ کے بربر کی بھی خاصی شمولیت ہو گئی اور اسپین میں ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی حکومت میں حصہ دیا گیا لیکن یہ جذبہ ہمدردی و رواداری ان مسلم حکمرانوں کو مہنگا پڑا اور عیسائیوں کا اسلام دشمنی ذہن ان کی علمی و سیاسی بیداری کے جلو میں بتدریج بلوغت کی منزلوں سے گذرتا ہوا اپنے اوج کمال پر پہنچ گیا اور مسلمانوں کی یخ کنی میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ادھر مسلمان حکمرانوں کے تعیش اور باہمی انتشار نے حکومت کے مضبوط ستون کو کمزور کر دیا اور پندرہویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی مسلمان اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ عیسائی جو اسپین میں مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے علوم سے فیض یافتہ اور مہذب بنے تھے، مسلمانوں سے حکومت چھین لینے کے بعد ان کی تہذیب و آثار کو مٹانے کے دہپے ہو گئے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمانوں کی یہ عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے تمام علوم سکھانے میں غیر قوموں کے ساتھ کوئی امتیاز و تعصب روا نہیں رکھا۔ سیاسی، تمدنی، سماجی، سیاسی، طبی، اقتصادی، فلسفیانہ، مذہبی اور ادبی علوم کو تحقیقی مہارت کے ساتھ ان قوموں کے سامنے پیش کیا۔ جب عیسائی ان علوم میں ماہر ہو گئے تو انہی ہتھیاروں سے انھوں نے مسلمانوں کو فتح کیا اور ان سے قدیم عہد کا بھرپور انتقام لیا۔

(باقی)

قرآن کریم میں مترادف

(پہلی قسط)

عربی سے ترجمہ :
محمد رضی الاسلام ندوی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی
پروفیسر مطالعات قرآنی و شعبہ دینیات
جامعۃ القرویین مغرب۔

زمانہ قدیم سے عربی زبان کے ابناء مترادف کا بحث میں مشغول رہے ہیں اور اس میں ان کے مسائل و مسائل میں اختلاف رہا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی اس مختلف فیہ بحث میں بیان قرآنی کی فیض کن بات ہو۔ قرآن جب کلمہ کے راز کی طرف اشارہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کلمہ کی جگہ دوسرے ان کلمات میں سے جنہیں اس کا مترادف قرار دیا جاتا ہے کوئی کلمہ نہیں آسکتا۔

یہی معاملہ قرآن کے الفاظ کے سلسلہ میں بھی ہے۔ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے بنا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لایا جاسکے۔ اس بات پر ان خالص اور فصیح اہل عرب نے جن کے درمیان قرآن نازل ہوا تھا۔ ادراک کر لیا تھا۔

یہاں میں چاہتی ہوں کہ مترادف کے مسئلہ کی کچھ وضاحت کر دوں جس میں تاویل وغیرہ تک پہنچنے والی لغات رہا ہے مترادف سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ایک معاملہ کیلئے متعدد الفاظ عرب قبائل کی لغات کے اختلافات کی وجہ

سے ہوں اس لیے کہ میری معلومات کی حد اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے
مترادف سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک معنی کیلئے کئی الفاظ ہوں اور ان کا سبب
تعدد لغات نہ ہو۔ نہ ہی ان الفاظ کے درمیان جن کو مترادف کہا جاتا ہے۔ کوئی
صوتی قرابت ہو۔

ہم میں سے بعض اس تعدد کو حس کے فقدان الفاظ کی دلائل کو ضبط کرنے
اور معانی کی یقین میں عدم قدرت کا مظہر شمار کرتے ہیں اور اسے زائد اور بے فائدہ
گردانتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اسے ثروت، وسعت اور تصرف پر قدرت کا
مظہر سمجھتے ہیں اور اس لغوی ثروت پر فخر کرتے ہوئے اسے عربی زبان کا ایک
امتیاز قرار دیتے ہیں۔

اب جب کہ لغوی مطالعات کی ترقی نے ہمیں اپنی زبان اور دوسری زبانوں
کے درمیان سادہ موازنہ اور برتری کے مرحلہ سے آگے بڑھا دیا ہے اور ہمیں لغوی
اور صوتی مباحث میں علمی تحقیقات سے حاصل ہونے والی معلومات سے استفادہ
کرتے ہوئے عربی زبان کے فضائل و امتیازات میں غور کرنے کی طرف رہنمائی
کی ہے اس لیے اب ایک معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ کی کثرت فخر و
مباہات کی چیز نہیں رہ گئی بلکہ ایک مسئلہ بن گیا ہے جو حل چاہتا ہے۔

x x x

ہم جب لغت کی ان کتابوں اور ڈکشنریوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم تک
پہنچی ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مترادف کے مسئلہ پر دو متضاد مسلک پائے جاتے ہیں۔

۱۔ السیوطی: المزہر فی علوم اللغۃ ص ۵۰ طبع الحلبي۔

۲۔ ابن فارس: الصحاح فی فہم اللغۃ ص ۵۰۔

بعض کتابوں میں مترادف ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک معنی یا ایک چیز کے لیے متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔ بغیر یہ اشارہ کئے ہوئے کہ یہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ یہ مسلک ابو مسحل الاعرابی (دوسری صدی ہجری) صاحب کتاب النوادر اور ابن السکیت (تیسری صدی ہجری) صاحب کتاب "الالفاظ" کا ہے۔ اسی طرح فیروز آبادی صاحب القاموس کو، ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "الروضۃ المسلوک فیما لہ اسماء الی الوف" دوسری کتاب "اسماء العسل" ہے جس میں انھوں نے شہد کے کٹاشی نام بیان کئے ہیں۔

لیکن بعض کتب لغت ایک چیز یا ایک معنی کیلئے آنے والے الفاظ میں سے ہر لفظ کیلئے خاص دلالت بیان کرتی ہیں۔ یہ ابو منصور الثعالبی صاحب "فہم اللغة" ابو ہلال العسکری صاحب "الفروق اللغویہ" اور احمد بن فارس صاحب "المصباح فی اللغة" کا ہے۔ یہ لوگ چوتھی صدی ہجری کے علماء لغت میں سے ہیں۔

دونوں مسالک میں اختلاف قدیم ہے۔ احمد بن فارس نے اصمعی کا ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہارون رشید نے اس سے ایک 'غریب' شعر کے بارے میں دریافت کیا۔ اصمعی نے اس کی تشریح کر دی تو رشید نے کہا "اے اصمعی تمہارے نزدیک 'غریب' بھی 'غریب' نہیں بنتا" اصمعی نے کہا اے امیر المومنین کیوں نہ ہو۔ مجھے پتھر کے شتر نام یاد ہیں۔

ابن خالویہ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ مجھے شیر کے پانچ سونام اور سانپ کے دو سونام یاد ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اس نے حلب میں "سیف الدولہ" کی مجلس میں کہا "مجھے 'سیف' (تلوار) کے پچاس نام یاد ہیں۔ ابو ہریرہؓ جیسا کہ اس مجلس میں موجود تھا۔ یہ سن کر منہ سے اور کہا "مجھے تو صرف

ایک نام یاد ہے اور وہ ہے 'سیف'۔ جب خالویہ نے ان سے پوچھا: "پھر کھنڈ" صائم 'قصیب' حسام اور فلاں فلاں نام کیا ہیں؟ تو ابو علی نے جواب دیا: یہ صفات ہیں۔ لگتا ہے کہ حضرت اسم اور صفت میں فرق نہیں کرتے۔

میردامی کتاب 'ما اتفق لفظہ واختلف معناه فی القرآن المجید' میں کہتے ہیں۔

"یہ حرف ہم نے کتاب اللہ سے منتخب کئے ہیں۔ ان کے الفاظ یکساں ہیں۔ لیکن معانی مختلف ہیں وہ تلفظ میں قریب قریب ہیں لیکن مفہوم میں مختلف ہیں جیسا کہ کلام عرب میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ اہل عرب کے کلام میں دو الفاظ دو مختلف معانی کے لیے ہوتے ہیں اور دو الفاظ ایک معنی کے لیے ہوتے ہیں اور ایک لفظ دو معانی کے لیے ہوتا ہے۔"

جیسے دو مختلف الفاظ دو مختلف معنی کے لیے: ظننت وحسیت
(گمان کرنا) قعدت وجلست (بیٹھنا) ذراع وساعد (بازو) ألف
وموسین (تکلیف)

اور ایک لفظ دو مختلف معنوں کے لیے: وجد وجدان (پانا) وجد
علی کنا سوجدة (غصہ ہونا) وجد (جاننا) جیسے وحدت زیداً
کریماً (زید کو کریم جاننا)۔

(باقی)

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(قسط ۳)

رئیس فاطمہ شعبہ کلیات طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

قرآن پاک نے انسانی ذہن کو وہ پرواز تخیل عطا کیا ہے کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ اس مادی دنیا کے تمام بندھنوں کو توڑ کر یہ سوچے کہ 'کیا وہی دنیا میں ایسے بہت سے رموز و اشارات پوشیدہ ہیں جو بالآخر اسے اللہ خالق و معبود کی طرف واپس لے جاتے ہیں۔ قرآن کے ذریعہ ہی انسان کو یہ علم حاصل ہو کہ تمام دنیا اسی تبارک تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنایا ہے کہ وہ تلاش و جستجو کے ذریعہ اس سے مستفید ہو سکے۔ اور اس تلاش و جستجو کا طریقہ بھی قرآن پاک ہی سکھاتا ہے۔

قرآن پاک نے خود دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے ایک رشد و ہدایت کی کتاب ہے۔ اس کا پیغام کسی ایک گروہ یا فرقے کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع کے لیے ہے۔ اور نہ ہی کسی ایک متعین و مقرر وقت کیلئے ہے۔ بلکہ یہ قیامت تک کیلئے ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل، راہ ہے۔ کوئی انسان کی تخلیق کر وہ کتاب انسانیت کے لیے مشعل، راہ نہیں بنا سکتی۔

آج کے دور میں انسان کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں ہم جو بھی ترقی دیکھ رہے ہیں ان سب کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ہم قرآن میں پا رہے ہیں۔ قرآن پاک نہ صرف ہم کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے بلکہ وہ اس پر بھی مہر ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ اس کی ایک ایک بات ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ہمارے ذہن میں اٹھنے ہوئے سوالات کے جواب دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے دلوں میں امید کا چراغ بھی روشن کرتی ہے کہ ہمارا خالق اگر غضبناک ہے تو بہت ہی زیادہ رحیم و کریم بھی ہے جو ہمیں ہماری غلطیوں پر معاف بھی فرمائے گا۔ سر ولیم میور کہتا ہے :

”قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گزاری پر جھکا دیا۔ یہ وہ کمال ہے جس سے دنیا کی تمام کتابیں عاجز ہیں“۔

یہ قرآن ہی ہے جس کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہی ہماری تمام ضرورتوں کو پیدائش سے موت تک پورا کرنے والا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ ایٹم جیسے چھوٹے سے چھوٹے عنصر سے لے کر بڑی بڑی طاقتور چیزیں سب اللہ کے بنائے ہوئے قدرتی نظام کے مطابق عمل پیرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کر کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے اتنی ہی حقیقت کی جانکاری دی جس کے ذریعہ وہ عدل و انصاف اور اس کے ساتھ اپنی زندگی یا عزت طو پر گزار سکے۔ اور یہ۔

سارا علم اسے وحی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا جو وقفہ وقفہ سے پیغمبروں پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے صحف آسمانی میں تحریف کر لی گئی۔ مگر ایک قرآن ہی ایسا صحیفہ آسمان ہے جو آج تک ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ پاک نے جبریلؑ کے ذریعہ محمدؐ نبی آخر الزماں پر نازل فرمایا تھا۔ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو کسی ایک عنوان یا مضمون پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہمیں مذہبی علوم، فلسفیانہ علوم، تاریخی، معاشی، سماجی، سیاسی عدل و انصاف، داخلی و خارجی تعلقات، گناہ، عذاب، محبت و اخلاقیات یعنی کہ سب کچھ ملیگا۔ ہم دوسرے نکتوں میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا بنیادی مضمون انسانیت اور اس سے متعلقات ہیں جیسا کہ قرآن خود شاہد ہے :

”شَهِرَ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ

مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ج ۲۷

ہم آج کے دور میں دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کے زیادہ تر اعمال قرآن پاک کی انھیں تعلیمات کے نزدیک ہیں اور اہل میں ان لوگوں کی کثرت ہے جنکے اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں ترقی کی انتہائی بلندیوں پر لے پاتے ہیں اور اسلام کا دعویٰ کرنے والے زیادہ تر مسلمان تنزلی کی راہ پر ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے قرآن پاک جیسی ایک مدلل کتاب موجود ہے جو ہمیں ہر طرح کی تعلیم و ہدایت دیتی ہے مثال کے طور پر علم حاصل کرنا اسکو فروغ دینا ہر مسلمان کا فرض بتایا گیا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ عام اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے :

”قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون“ کہ

قرآن پاک علم کی اہمیت کو دوسری جگہ اس طرح بیان کرتا ہے:

”ولقد اخترنہم علی علم علی العالمین“ کہ

اس کے علاوہ قرآن پاک خود اپنی مدافعت کے طریقے بتاتا ہے:

”یا ایہا الذین امنواخذوا حذرکم فانفروا ثبات اور انفروا

جمعاً“ کہ

یہاں تک کہ نماز کے دوران بھی اپنی حفاظت کا طریقہ بتاتا ہے کہ کہیں

ایسا نہ ہو کہ نماز کے درمیان اپنی حفاظت سے غافل ہو کر مارے نہ جائیں گے

قرآن پاک نے ہمیں بہادری کی بھی اسی طرح دی ہے کہ اے مومنو! جب کبھی

کافروں سے جنگ ہو تو تم پیٹھ مت دکھاؤ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر غضب

ناک ہوگا اور جہنم تمہارا مقام ہوگا۔ کہ

اسی طرح پورے قرآن پاک میں ہم ہدایت پاتے ہیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں

کہ کسی ملک میں دنیا میں کسی کو نے میں کسی بھی بحران کا سامنا ہوتا ہے تو اصرار

فہم واداک اور معزز لوگوں کو اکٹھا کر کے مشورے کیے جاتے ہیں اور اس

بحران سے نپٹنے کے طریقے سمجھائے جاتے ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ پہلو ہے

۳۔ ۹: ۳۹

۴۔ ۲۲: ۲۲

۵۔ ۴: ۴۱

۶۔ ۲: ۱۰۲

۷۔ ۸: ۱۵ + ۱۶

جس کی تعلیم قرآن میں بہت پہلے سے چکا ہے :

”وَشَارِدْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ ۱۵

اللہ تعالیٰ نے محنت کرنے والوں کو اجر دینے کا وعدہ کیا ہے :

”وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ“ ۹

آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صفائی پر کتنا زور دیا جاتا ہے صفائی کو صحت کا ضامن قرار دیا گیا ہے مگر صفائی کا یہ تصور بھی انسان کو بہت پہلے قرآن کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے :

”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَاضِعِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ“ ۱۶

”وَتَيَابِغُ فَطَهْرٍ وَالرَّحِيزُ فَاهْجَرُ“ ۱۷

”تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور نہ ہی ان کے کوئی حقوق تھے۔ اسلام نے ان کے حقوق مقرر کئے اور مقام عزت متعین کیا۔ مکی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ آج بھی اس نام نہاد ترقی کے دور میں کہیں عورت کو ’ستی‘ کے نام پر زندہ جلا دیا جاتا ہے کہیں اسے جھوٹی عزت اور آن کی خوف سے دنیا میں آتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا ہے کہیں دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے تو کہیں پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے بیچ دیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ

۱۵۔ ۳ : ۱۵۹۔ یہی بات سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ میں بھی ہے۔

۱۶۔ ۳ : ۱۳۶

۱۷۔ ۲ : ۲۲۲

۱۸۔ ۷۴ : ۵ + ۴

مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے علمبردار کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انکے یہاں عورتوں کو سب سے زیادہ آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہیں عورتوں کو چند دنوں کیلئے شریک حیات بنا کر طلاق جیسی منحوس اور قابل نفرت تحفہ سے نواز کر ذلیل کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں تانندگی قائم رکھتے ہیں۔ یہ قرآن پاک ہی ہے حقیقت میں ہمیں عورتوں کی عزت کرنا سکھاتا ہے :

”وَمَا تَشْرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ“ ۱۲

خداوند کریم سورۃ بقرہ میں ارشاد فرماتا ہے ”وہن مثل الذی علیہن بالمعروف یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ یہی نہیں پوری ایک سورۃ النساء عورتوں کے معاملات سے متعلق نازل فرمائی۔

اسلام ایک علمی اور علمی مذہب ہے جسکے لیے قرآن پاک کو ہدایت بنا کر ہمارے سامنے رسولؐ نے پیش کیا۔ یہ تمام دنیا کیلئے اخلاق و عبادت اور علوم و ضاعات کی تبلیغ کرتا ہے۔ قرآن کا مخاطب ہر سطح کے خاص و عام لوگوں سے ہے یہ انسانی زندگی کیلئے ایک مکمل دین اور جامع نظام فکر و عمل پیش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی شعبہ ایسا نہیں جسکے لیے قرآن نے واضح ہدایت اور اصولی احکام نہ دیئے ہوں۔

قرآن پاک کی بلاغت، مضامین کی عظمت اور اس کے اسلوب و بیان کی شوکت کے سامنے انسان نے ہمیشہ اپنے کو عاجز پایا۔ امام رازی کا کہنا ہے :

”میں نے علم کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے تمام ابواب پر پوری

طرح غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب۔ میں نے پایا کہ منزل مقصود تک لیجانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا ہے۔^{۱۳}

قرآن انسان کے ظاہر و باطن کی تعمیر الیسی کرتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ دنیا و آخرت میں چین پاتا ہے۔ قرآن منزل من اللہ ہے۔ کوئی بھی بہتر سے بہتر کلام حتیٰ کہ خود رسولؐ کے اپنے کلام کا کوئی ایک ٹکڑا بھی اس میں ملا کر رکھیں تو فرق صاف ظاہر ہو جائیگا۔ یہ قرآن کا بہت بڑا اعجاز ہے جو ہمیں یہ ماننے کے لیے مجبور کر دیتا ہے کہ قرآن کسی انسان کے بس کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم قرآن کی عظمت و فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہوں گے کیونکہ قرآن پاک کی ہدایات کی بنا پر ہی اسلام کو دوسرے مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی اچھا مقرر یا شاعر کسی ایک عنوان پر بات کرتا ہے تو اکثر وہ کمزور اور بے جانا الفاظ استعمال دچاہے انجانے میں کر جاتا ہے جس سے اس مضمون کی ساری خوبصورتی اور اصل مقصد ضائع ہو جاتا ہے اور اگر کبھی سے ہی کسی بات یا جملے کا اعادہ بار بار کرتا ہے تو وہ سامع اور قاری سب کو گراں گذرتا ہے۔ لیکن قرآن کے سلسلہ میں ہم ایسا نہیں پاتے ہیں۔ بلکہ جب کسی قصہ یا بات کو دہراتا ہے تو وہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ سامع و قاری برا لگنے کے بجائے اچھا لگتا ہے اور اس کی تکرار سے دل و دماغ پر اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ یہ

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ قرآن پاک کی انہیں تمام خوبیوں کی بناء پر ہی غیر مسلم اسکا رب بھی اسے انسانی ذہن کی تخلیق تسلیم نہ کر کے اسے الہامی کتاب مانتے ہیں۔

بہاتما گاندھی کا قول ہے:

”مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے۔“ ۱۲

۱۲۔ عبدالقیوم ندوی: قرآن اور اس کی تعلیمات ص ۱۰۵

ماہنامہ برہان کی اہم تاریخی اشاعت

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی رح کی علمی و دینی نقہی قومی ملی اور سیاسی سرگرمیوں کی ہمہ جہتی دستاویز جس میں ملک کے ممتاز اہل قلم اور ارباب دانش کی اہم تحریرات یکجا ہیں، جنہیں انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نمبر کے چار حصے ہیں۔

پہلے حصے میں مفتی صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین ہیں۔

دوسرے حصے میں خود مفتی صاحب کے قلمی جواہر پارے ہیں جنہیں آپ بیتی سفر نامے آپ

کے متفرق مضامین اور آپ کی ریڈیائی تقریریں شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں حضرت مفتی

صاحب کے نام ملک کی ممتاز شخصیتوں کے خطوط ہیں۔ اور چوتھا حصہ ان تاثرات و پیغامات پر مشتمل ہے جو

ممتاز سیاسی علمی اور صحافتی شخصیتوں کی طرف سے مفتی صاحب کے انتقال کے بعد وصول ہوئے۔

آفیسٹ کی عمدہ طباعت، ریگزن کی سنہری چھپی ہوئی مضبوط جلد۔ قیمت - ۶۲ روپے۔

پتہ: عمید الرحمن عثمانی - دفتر برہان، اردو بازار - جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۱۶

نوٹ: ہر رسالوں کے خاص نمبر بار بار نہیں چھپا کرتے۔ آج ہی آرڈر دیکر طلب کریں۔

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

مصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برکات

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مترتب
عمید الرحمن عثمانی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

برہان

جلد ۱۰۲ | بیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق نومبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۵

- ۱۔ نظرات
سید قطب کی سیاسی بصیرت
- ۲۔ عمید الرحمن عثمانی
جناب عبد اللہ فلاحی انیم لے
شعبہ سیاسیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۳۔ اسلامی عہد میں اسپین کی
علمی و تاریخی کیفیت
- ۴۔ قرآن کریم میں ترادف
- ۵۔ تعارف و تبصرہ
- ۶۔ جناب محمد سعید الرحمن شمس
- ۷۔ جناب محمد علی جوہر ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۸۔ ڈاکٹر عائشہ عبد الرحمن بنت الشاہی
ترجمہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
- ۹۔ ڈاکٹر عائشہ عبد الرحمن بنت الشاہی
ترجمہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی شائع کیا

نظرِ انت

یہ ایک تلخ حقیقت اور تاریخی حقیقت ہے کہ روزِ اول سے ”تحریکِ اسلام“ کو جس قدر زک اور نقصان نام نہاد مسلمانوں اور منافقین کی ٹولیوں سے پہونچا ہے اتنا نقصان کسی دوسرے فرقے کے لوگوں اور افراد سے ہرگز نہیں پہونچا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس بات سے ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیے کہ سامراجی، صہیونی، طاغوتی اور لادین قوتیں اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے برابر سازشوں میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں وہ داخلی و خارجی مفاد پر نت نئے حربے استعمال کرنا بخوبی جانتی ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک تازہ مثال سامراجی ایجنینٹ، کمیونسٹ اور دریدہ دہن مصنف ”مسٹر سلمان رشدی“ (جو پیدائشی اعتبار سے ہنری اور برطانیہ میں مقیم ہے) کی شیطان ”خست کتاب“ ”THE STANIC VERSES“ ہے جس میں تمام مذاہبِ عالم کا عموماً اور دینِ اسلام کا خصوصاً جی بھر کر مذاق اڑا کر گھٹیا اور لپست الفاظ میں توہین کی گئی ہے۔ اور اس طرح اس یہودہ کتاب کے ذریعے دنیا بھر کے مذاہب پر سرت لوگوں خاص طور سے کروڑ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے کی دانتہ کوشش کی گئی ہے۔

اس نام نہاد کتاب میں گستاخ مصنف نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے لے کر اندوایں مطہرات، حضرات صحابہ کرام، سیدنا جبریل امین، قرآن کریم یہاں تک کہ اللہ رب العالمین کی شان میں بھی گستاخی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس شیطان صفت مصنف نے بزرگم خود یہ بات ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہنی اختراع اور ساطیر الادب نہیں ہے۔ اس بدنام زمانہ کتاب کے ذریعے عربی، عجمی اور شیعہ سنی تئیں کو ہی ہوا دینے سعی نامشکور کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کو ایک پڑھا لکھا عقلمند سنجیدہ اور غیر جانب دار آدمی نہ ناول سمجھ سکتا ہے، نہ فلسفہ، نہ تاریخ اور نہ حالات و کوائف پر کوئی معقول رپورٹ و تبصرہ، کتاب شروع سے لے کر آخر تک ایک بکواس نامہ اور اول قول کا پلندہ ہے۔

یہ بڑا اچھا ہوا اور اس پریم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض مسلمان قائدین اور ذمہ داروں کے توجہ دلانے سے مرکزی حکومت نے فوراً اس لغو اور فتنہ انگیز کتاب کی ملک میں درآمد، اس کی اشاعت و طباعت اور خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی ہے ورنہ اس بات کا شدید اندیشہ اور خطرہ لاحق تھا کہ اس نازک مسئلہ کی آڑ میں جہاں موجودہ ملکی حالات کے پس منظر میں افراق و انتشار کو مزید ہوا ملتی وہاں ہماری مسلمہ قومی روایات، تشخص، مختلف مذاہب کے تئیں احترام کی توہی اور ملکی پالیسی کی روح بھی بری طرح متاثر ہوتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان آئندہ بھی اس طرح کی سازشوں

سے پوری طرح باخبر اور چوکنا رہیں۔ مرکزی حکومت سے بھی ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں مذکورہ کتاب کی کسی بھی شکل میں اشاعت اور نقل پر پر "آرڈی ننس" کے ذریعہ قانونی پابندی لگائی جائے تاکہ یہ ملک کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام انصاف پسند سکھ، عیسائی، اور ہندو کی بھی آواز ہے اور یہی ملکی سالمیت، یک جہتی اور وحدت کا مطالبہ بھی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اس طرح کے نازک معاملات میں بہر حال انتہائی صبر و تحمل، ہوشمندی اور دانشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی جب اس طرح کی اہانت آمیز تحریریں سامنے آتی ہیں تو لوگوں کو اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنا قدرتی طور پر بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔

یہ ایک سوالیہ نشان ہے اور ہمارے مفکرین اور دانشوروں کو اس پر پیچیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ موجودہ دور میں جس احساس کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل زمانہ کے تقاضے نہیں بلکہ "مغربی اقدار" کے تقاضے ہیں۔ جنہیں نام نہاد دانشوروں اور مفکرین کے ایک طبقہ کی ذہنی مرعوبیت نے زمانہ کے ہم معنی سمجھ لیا ہے انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ زمانہ دراصل "مغرب" ہی ہے اور جو کچھ اس وقت وہاں موجود ہے اور ہو رہا ہے وہ صحیح، درست، برحق اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہمارے اپنے ملک و قوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظر وہاں نہیں ملتی تو وہ — بوسیدہ (out of date) ناکارہ، اور از کار رفتہ ہے اور اس واقعے سے کراسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ (THEORY) یا عمل (ACTION) کو قبول عام حاصل ہے اور ہمارے یہاں اس کا وجود

نہیں ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج اور بڑھا دینا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر زمانہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری ”رجعت پسندی“ ”دقیانوسیت“ اور بنیاد پرستی کا سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے نام نہاد معلمین اور مفکرین کے فکر و عمل کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ دراصل یہی سوچ ”ایروج اور طرز فکر غلط اور کمزور ہے مغربی اقتدار (WESTERN VELU) کو نہانہ کا تقاضا نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی مغربی تہذیب (WESTERN CULTURE) کے استیلاء اور غلبہ کو فکری مجبوریوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مغربی تہذیب تمدن کے بارے میں حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ کوئی معیار حق و باطل نہیں جس کے مطابق ہم اپنے انکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل تہذیب کی عملداری اور غلط افکار و رجحانات کا دھارہ ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری اور ذہنی مرعوبیت کے سبب ”زمانہ کے تقاضے“ یا ”عصری مطالبے“ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک یہی چیز فکر و دانش کی بنیادی خامی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم جب بھی شخصی اور اجتماعی معائب کا جائزہ لیتے ہیں آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی مینک لگا کر ساری صورتحال پر نگاہ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے غیوب اور کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں پاتے۔ ہماری تنقید کا ملان ہمیں کھیر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر میں قابل اعتراض بنتے ہیں اور جن میں اہل مغرب ترمیم و تصحیح جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، معاشی، اقتصادی، سیاسی، سماجی، اجتماعی اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور ان پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت

ہی نہیں ہوتی اور ان حصوں کو صحیح سمجھ کر حوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سرتاپا
 غلط ہے اور جن کے وجود سے ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے۔ یہ
 اسی بنیادی نقطہ نظر کے تغیر کے اعجاز ہے کہ آج ملت میں رقص و سرود تاج و
 نغمہ، شراب و کباب، قمار بازیاں اور فحاشی و بے حیائی کے ہر گھمسنے
 رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے دیکھا نہیں جا رہا ہے بلکہ اسکی باقاعدہ پشت
 پناہی ہو رہی ہے ضرورت ہے آج کا مسلمان از اول تا آخر اپنی انفرادی اور اجتماعی
 زندگی کا محاسبہ کرے اور اپنے مقام و منصب کو سمجھ کر اپنی ان بنیادی ذمہ
 داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے جو بحیثیت "مسلمان" اس
 پر عائد کی گئی ہے۔

رسالہ اتحاد

قارئین کرام و سہمردانِ ملت! ادارہ ندوۃ المصنفین اکابر
اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی
کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی
ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی
ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آ رہا ہے۔ الحمد للہ علی ذالک
لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا
اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین
محبتین اور بھی خواہ حضراتِ اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔
یہ حقیقت ہے کہ اس کمزور مہنگائی اور دورگراں بازاری میں ایسے ادارے
بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے سرگرم نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب
مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے۔

اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ کئی منصوبے جو تشنہ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے تاکہ سہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر و بہی خواہان ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! —
چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیا جائے۔

مینجر ندوۃ المصنفین

اردو بازار دہلی ۴

سید قطب کی سیاسی بصیرت

(سید قطب شہید کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب

”فولاد ہے مومن“ کا ایک باب)

از عبید اللہ فہد فلاحی ایم ایے شعبہ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید قطب نے جس خاندان میں پرورش پائی وہ سیاست کے نغیب و فراز سے واقف اور ملک کی سیاسی فضا سے پوری طرح آشنا تھا۔ والد مرحوم ملک کی بڑی سیاسی پارٹی حزب وطن سے وابستہ تھے جس کی سربراہی علامہ اعلیٰ کامل جیسے مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ عنقریب شباب سے ہی سید قطب نے اس پارٹی کے قرحان جریۃ الحزب الوطنی میں مصر کی آزادی اور فرانسیسی و سامراجی طاقتوں کے انکار کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اس وقت الحزب الوطنی کے سامنے دو حقائق تھے، ایک تو یہ کہ دنیا سامراج سے جنگ اور دیا یہ عرب کی مکمل آزادی اور دوسرا اسلام کا نفاذ جس کے سایہ میں مسلمان اطمینان و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ وطن کی آزادی کا قومی تحریک کے علم بردار محمد زغلول اور حزب الوفد کے کارکنوں کے ساتھ سید قطب کے

جولہات گزرے وہ مہر کی آزادی اور بیرونی مداخلت کاروں کے انخلاء کے مطالبہ میں صرف ہوئے۔

دہلی پارٹی سے سید قطب کا تعلق جس قدر مستحکم ہوتا گیا اسی قدر ان کے قلم کی جرات، ظلم و استعمار کے خلاف تحریری نفرت اور غیر ملکی حکمرانوں پر تنقید کا عس شدید ہوتا گیا۔ ابتدائے شباب کی بیشتر تحریریں آزادی وطن کے نعروں سے پر ہیں۔ بیرونی سامراج کی ظلمت عافیت میں حکومت کرنے والے حکمرانوں کے خلاف مصنف کے تند و تیز لہجہ و اسلوب نے انھیں عوام میں ممتاز کر دیا تھا اور لڑکپن کے زمانہ سے ہی حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے تھے۔ چنانچہ وزیراعظم محمد محمد یاسین مرحوم کے زمانہ میں اخبارات میں ان کا ایک بیان شائع ہوا کہ ”ہم لاقانونیت اور انارکی پھیلانے والوں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کریں گے اور اس بات کی سرگرمیوں کی ہر صورت میں اجازت نہ دی جائے گی اور ان میں ملوث افراد کی لوہے کے ڈنڈے سے خبر لی جائے گی“ مصنف نے اس سرکاری بیان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وزیراعظم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سخت تنقید کی:

”یہ صاحب الید الخلدیتہ! اے لوہے کے ہاتھوں کے مالک! اگر تو اپنے لوہے کے ہاتھوں پر نظر ڈالے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ وہ زنگ آلود ہو چلے ہیں اور مفلوج ہیں۔“

وزیراعظم اس سخت تنقید کی تاب نہ آ سکا مضمون نگار کو ذاتی ملاقات کے لئے طلب کیا۔ سید قطب اس کے دفتر میں حاضر ہوئے تو ان کی کم نثری کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور تعجب سے پوچھا، کیا اس مضمون کے مصنف تم ہی ہو؟

سید قطب نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اس قدر سخت اور بیباکانہ لہجہ میں تنقید کرنے کی وجہ پوچھی۔ نوجوان مضمون نگار نے فوراً کہا: ”میرا عقیدہ یہی ہے۔“ وزیراعظم نے فراست سے کام لیتے ہوئے انہیں یہ کہہ کر رخصت کر دیا: جاؤ میرے بیٹے، جوجی میں آئے لکھو۔“

یہ وہ دور ہے جبکہ اخوان المسلمون ابھی تشکیل کے مرحلہ میں داخل نہ ہوئی تھی۔ حسن البنا شہید کا بھی عنفوان شباب تھا کیونکہ سید قطب اور حسن البنا کا سال ولادت ایک (۱۹۰۶ء) تھا۔ البنا آغاز ہی سے سید قطب کی سیاسی اٹھان کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک جری، بے خوف اور بیباک انسان تھے اور قدرت نے انہیں تحریر و تصنیف کا خصوصی ملکہ عطا کیا تھا۔ سامراجی طاقتوں، سرمایہ داری اور شاہی نظام کے خلاف ان کا اسلوب بالکل شروع ہی میں نکھر کر سامنے آچکا تھا البتہ اس میں وہ رخ (ORIENTATION) پیدا نہ ہو سکا تھا جو تحریک اخوان میں شمولیت کے بعد سامنے آیا۔ اس وقت ان کے سامنے باطل کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ہی اصل الاصول تھا۔ تخریب کے بعد تعمیر کا مکمل نقشہ ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔

مصنف نے قرآن کی منظر نگاری پر جب لکھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ اسلامی نظام کی جامعیت اور کیمہ گیری ان پر منکشف ہوتی گئی اور ایک وقت وہ آیا جبکہ اسلام کے واجب العمل ہونے پر ان کا ایمان مستحکم ہو گیا اور انسانیت کے تمام مسائل کا درماں انہیں اسلام کی صورت میں میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اخوان المسلمون ایک تحریک کی شکل میں اسلام کی نمائندگی کر رہی تھی اور بائیں بازو کی قوتیں الحزب الشیوعی المصری کے پلیٹ فارم سے یہودیوں اور صہیونیوں کے عزائم کی تکمیل میں لگی تھیں۔ اب مصنف کا قلم جڑ پکڑ چکا تھا اور اسے اسلامی تحریک کی روشنائی

میسٹر آنا شروع ہو گئی تھی۔ العالم العربی، الرسالة، المصری، اخبار الیوم، اخوان المسلمون،
مصر الفتاة، التعبد الجدید، الدعوة، النور المحمدی اور نور الاسلام جیسے اخبارات اور
رسالوں میں آپ کی تحریروں نے ایک ہنگامہ بنادیا۔ باطل کے ایوانوں میں آپ کے خلاف
سازشیں رچی گئیں۔ سامراجی طاقتوں کے کار، کھڑے ہو گئے کہ آواز بڑی بارعب اور
بلند تھی اور صور اسرافیل کا کام کر رہی تھی۔ شاہ فاروق نے فاضل مصنف کی گرفتاری
کا حکم دیا لیکن وزیر اعظم محمود ہنی نقراشی کا نوجوان مصنف سے ذاتی تعلق تھا اس نے
ذاتی دوستی کا بھرم رکھا اور شاہ کو اس حرکت سے منع کیا۔ دوسری طرف اس نے
اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دو سال کی مدت کے لئے مصنف کو امریکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔
مقصد سید قطب کو گرفتاری سے بچانا اور ان کی پیاہٹ تحریروں سے گلو خلاص کر لینا
تھا۔ اور یہیں سید قطب مات کھا گئے۔ پورے ایک سال تک توقف کرتے رہے۔
لیت و لعل سے اس پر وگرام کے متعلق کام لیتے رہے۔ بالآخر اعلیٰ تعلیم کا حصول، مختلف
تعلیمی و تہذیبی نظاموں کا مشاہدہ اور سیاسی افکار کا تجزیہ جیسے مقاصد نے بخیر،
امریکہ جانے پر رضا مند کر لیا۔ یہی پالیسی مختلف تحریکات کے سپہ سالاروں کی
توجہ ہٹانے کے لئے مختلف ادوار میں باطل طاقتوں نے اختیار کی ہے۔ آج بھی
دنیا کے مختلف حصوں میں تحریک اسلامی کے علم برداروں کو انقلابی ٹکر اور
طریقہ کار سے ہٹا کر مختلف اصلاحی، رفاہی، تعلیمی اور تعمیری تحقیقی اداروں اور
منصوبوں میں باطل نے الجھانے کی کوشش کی ہے کہیں اسے کامیابی نصیب ہو چکی ہے،
کہیں وہ جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن امریکہ جا کر سید قطب کو ایک قائمہ
ضروریہ ہوا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی تباہ کاری، چشم سردیکی۔ امریکی معاشرت کا بغور
مطالعہ کیا اور اسلام پر ایمان و یقین میں امتداد ہوا چنانچہ مصر واپس آ کر انھوں نے
تحریک اخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کر لی۔

امریکی سیاست کا تجزیہ

فاضل مصنف نے امریکی سیاست کا مطالعہ خود اس کی لائبریری اور میدان عمل میں جا کر کیا تھا اس لئے ان کی معلومات، تجزیہ اور مختلف منصوبوں پر ان کے تبصرے حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ باہر کا انسان امریکی سیاست کو اس کی معاشی و تکنیکی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے رفاہی و امدادی منصوبوں کی وجہ سے ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا۔ وہ مشرقی ممالک میں امریکہ کی خطرناکی سیاست کی چالوں کو نہیں بھانپ پاتا لیکن خود امریکہ میں رہنے والے انسان حکومت اور سرمایہ داروں کے چہروں پر پڑا ہوا نقاب ہٹا کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سید قطب نے اپنی تحریروں میں امریکی معاشی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے تعاونی پروگراموں سے نقاب ہٹا دیا اور امریکہ کے مکروہ عزائم طشت ازبام کئے۔ امریکی چالوں پر سید قطب کو زیادہ توجہ اس لئے دینی پڑی کہ شاہ فاروق کا دور امریکی سحر کاری کا دور تھا اور بعد کے ادوار میں بھی زیادہ تر مصری و عربی سیاست پر امریکی منصوبہ ساز اور پالیسی بنانے والے چھائے رہے۔ مصر کے صدر انور سادات مرحوم نے اپنی ڈائری ”یا ولدی هذا عمت جال“ میں امریکہ کے تئیں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت پر ممکن طبقہ کتنی سادہ لوحی یا خطرناک سازش کا شکار تھا اور دشمنوں کے منصوبوں اور پالیسیوں کے سلسلہ میں کتنا خوش فہم تھا۔ ایک جگہ مصری سیاست کے بیچ و خم کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”... اس طرح ہمارے سامنے یہ حقیقت و ذبح ہو گئی کہ امریکہ سا مہاجر عقیقت سے بالکل مختلف نقطہ نظر اپناتے ہوئے معاملات و مسائل کی حقیقت کو سمجھتا

ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ امریکہ کی اپنی ایک سیاست ہے جو وہ اس علاقے میں اپنائے ہوئے ہے حالانکہ ہم لوگ عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ امریکی سیاست سامراجی برطانوی سیاست ہی کا ضمیمہ ہے جبکہ عالم غرب میں برطانوی سامراجی سیاست دانوں کا اعلان یہ ہے کہ تنہا وہی وہاں کے حالات سے باخبر ہیں۔ میرے بیٹے! ان حقیقتوں کے انکشاف سے اس بات پر مزید روشنی پڑے گی جو میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ انقلاب مصر کے تین امریکہ کا اپروچ اول روز سے برطانوی اپروچ سے یکسر مختلف رہا ہے۔ اور ہمارے درمیان اور امریکی سفیر کیفرے کے درمیان حقیقی دوستی استوار ہو چکی ہے اور یہ شخص اپنے تعلقات میں مخلص ہے۔

پہلے دن ہی ہم نے مسٹر کیفرے کی اس دعوت کو قبول کر لیا تھا جو انھوں نے شام کے کھانے پر ہماری کی تھی اور ہم سب اس کے گھر پر گئے تھے جبکہ مصر میں احمد باہر دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ انقلاب مصر کے اصل افراد کون ہیں اور اس وقت برطانیہ سے تمام سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے یہاں تک کہ برطانوی سفیر کا مشرقی مشیر بھی ہماری شخصیات کو پہچاننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا پھر ہمارے بعض صحافی دوستوں سے اس نے میل جول شروع کیا تاکہ ان کے ذریعہ ہم تک وہ رسائی حاصل کر سکے یا ہم سب کے ایک جگہ جمع ہونے میں وہ واسطہ کا کام کر سکے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ امریکی سفیر کا ہم سے برابر ربط تھا اور ہر بار وہ ہمارے اہداف و مقاصد کے اور ان کا انہار کرتا تھا جس نے ہمیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ امریکہ اپنے اس اعلان میں برحق ہے کہ وہ سامراجیت کے خلاف ہے اور سختی سے اپنے اس اصول پر کاربند بھی ہے اور وہ کمزور قومیں جو غیر ملکی

اقتدار کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہیں انھیں اپنا فیصلہ آپ کرنے کے حق کا وہ حامی ہے۔“

اس کے برعکس سید قطب امریکی شائستہ سیاست کے ان مہروں کو خوب پہچانتے تھے۔ وہ امن و امان کے خالی جوتی دعوؤں اور سلامتی دیکھتی کے پر فریب ساحرانہ ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے امریکی منصوبوں کی حقیقت واشگاف کی۔ اس کی مسموم فکر، ذلت آمیز اقتصادی تعاون اور سودی پروگراموں پر تنقید کی اور امریکی امداد و تعاون کا تاجرانہ سیاست سے گہرا رشتہ قائم کر کے دکھایا اور مشرق وسطیٰ میں منڈیوں کی تلاش کے پیچھے اپنے پیداوار کی کھپت کے ذریعہ معاشی تسلط و غلبہ کا ناپاک منصوبہ بے نقاب کر دیا۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں :

”امریکہ جنگ چھیڑنا چاہتا ہے، مگر یورپ بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑتا تو وہ جنگ کو ریاگے مادے تک بھی صبر نہ کرتا۔ امریکہ تو برلن کے مشہور بحران سے ہی ایک پوری جنگ لڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت تھکا ماندہ یورپ امریکہ کے شدید اصرار اور خواہش پر لبیک کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا ابھی وہ اپنے زخموں کو چاٹنے اور اقتصادیات کی تلافی کرنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ اشتراکیت کو کافی ممانعت حاصل ہو گئی تھی اور وہ آنے والے وقت کے لئے پوری تیاری کر رہی تھی لیکن ڈالر کی اشتہا یورپ میں سب کچھ کرنے پر قادر تھی البتہ تیسری عالمی جنگ سے وہ بالکل کترار ہی تھی اندہ اسی وجہ سے امریکہ کو جنگ کی خواہش دبانا پڑی۔“

امریکی سرمائے ایک نئی جنگ چھیڑنے کی ضرورت شدید طور سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی علین مسئلہ ہے۔ پچھلی جنگوں میں جو علمی فتوحات تیزی سے بڑھی ہیں اور جنگوں کے درمیان امریکی صنعت و حرفت کو سامان جنگ

فراہم کر کے جو تجارتی قوت حاصل ہوئی ہیں انہوں نے امریکی صنعت و
 حرفت کی کئی گنا پیداوار تیار کرنے کے نئے مواقع بہم پہنچائے مگر اس
 کے ساتھ ہی اس پیداوار کی نکاسی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔
 باوجودیکہ جنگ عظیم کے بعد منڈیاں ویران تھیں، انہیں شہری پیداوار
 کی سخت ضرورت تھی اور وہ یورپی مقابلہ آمائی سے خالی تھیں پھر بھی
 ان کی قوت خرید کمزور تھی خاص کر تھکے ماندے اور زخموں سے چور یورپ
 میں یہ قوت زیادہ کمزور تھی۔ چنانچہ امریکی نقطہ نظر کے مطابق اس کا
 مطلب کساد بازاری ہی تھا اور اس کساد بازاری کا مطلب یہ تھا کہ
 امریکی سرمایوں کا زیاں زیادہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال میں
 امریکہ کا مارشل پلان سامنے آیا ہے۔

مارشل پلان پر تبصرہ

فاضل مصنف نے اس تاریخی تناظر کے ساتھ مارشل پلان کا تجزیہ کیا اور اس
 کے تین بنیادی مقاصد قرار دیئے:

۱۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی نکاسی کی جائے۔ لیکن اس کھیت
 میں یہ شرط لگادی گئی کہ پیداوار سے فائدہ اٹھانے والی حکومتوں پر امریکی
 ڈالر کی شکل میں نقد قیمت کی ڈائیٹی پر زور نہ دیا جائے کیونکہ امریکی حکومت
 یورپی سلطنتوں کے لئے سیٹر آف کریڈٹ اس شرط پر کھولتی تھی کہ یہ حکومتیں
 اسے زیادہ تر امریکی مال کی خریداری میں خرچ کریں گی اور حقیقت یہ ہے
 کہ امریکی حکومت کے مارشل پلان کے نفاذ کے لئے امریکی سرمایہ دار بڑے
 بڑے ٹیکس برداشت کرتے تھے لیکن ان بڑے بڑے ٹیکسوں کے ساتھ

ایسا نفع بھی کھاتے تھے جس کی وصولی میں مارشل پلان کے نفاذ کی صورت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا نیز وہ کساد بازاری کے خسارے سے بھی بچ جاتے تھے۔

۲۔ امریکہ کے مزدوروں کی بیکاری اور اس سے پیدا ہونے والی اجتماعی شورشوں سے تحفظ حاصل کیا جائے، کیونکہ مزدور جو اس سے پہلے جنگ ساز و سامان کی تیاریوں میں مصروف تھے، اب تعطل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ تمدنی پیداوار کی کھپت کی ایسی راہیں تلاش کی جائیں جو کارخانوں کو انتہائی حد تک مصروف رکھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ مارشل پلان کا نفاذ اور یورپین سلطنتوں کو مشینیں فراہم کرنا تھا جس کا ایک نتیجہ امریکی سرمایہ کو نفع حاصل ہونے کی صورت میں نکلتا۔

۳۔ اس کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو بین الاقوامی اقتصادی عمل کو بحال کیا جائے اور اس کے لئے یورپ کی اذیتوں کو ختم کیا جائے اور اس میں زندگی کی چہل پہل پھر سے لوٹ آئے اور دوسری طرف بحال مزدوروں میں اشتراکیت کی اشاعت کو روکا جائے۔ مارشل پلان اس مقصد کی تکمیل میں معاون تھا۔^۹

ادھر کے اقتباسات فاضل مصنف کی مشہور کتاب السلام العالمی ما انا اعلام کے آخری باب والآن..... سے ماخوذ ہیں۔ یہ باب کتاب کے پہلے اور جوہر ایڈیشن میں موجود تھا لیکن ۱۹۸۲ء میں فوجی انقلاب کے بعد کتاب کے جتنے ایڈیشن مقام پر آئے اس میں سے یہ پورا باب استعماری طاقتوں نے خارج کر دیا اور اس باب کے بغیر یہ کتاب چھاپنے کی اجازت دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سفارت خانہ سے مصری حکومت اور مصری فوج کے کس قدر مضبوط تعلقات تھے اور

ان تنقیدوں سے امریکی مفادات کس بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

اسی باب میں سید قطب نے ان مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جنہیں آج ہم عالمی کرنسی کے بحران سے یاد کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنی تجزیاتی صلاحیت سے اور امریکی سیاست پر گہری بصیرت کی وجہ سے عالمی منڈیوں کا جو تجزیہ کیا وہ بڑی حد تک درست تھا۔ لکھتے ہیں :

”... لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ مارشل پلان کی عمر ہمیشہ کسے لئے باقی رہ سکے، کیونکہ یورپین منڈیاں جب پڑھو جاتیں تو فطری طور پر معاملات کا ایک معین حد تک آکر ٹھہر جانا عین تقاضائے فطرت تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یورپ کے پیداواری وسائل و ذرائع انتہائی حدود کو جا پہنچیں۔ یورپ اپنی پیداواری قوت کو بحال کر رہا تھا، اب وہ اس مقام پر پہنچ رہا تھا کہ نہ صرف خود تباہی سے محفوظ رہ سکے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ اب یورپین پیداوار اپنی منڈیوں کے ماسوا دوسری منڈیوں میں بھی امریکی پیداوار کی حریف و رقیب بن چکی تھیں۔

اسی صورت حال میں برطانیہ نے اپنا پر فریب کھیل کھیلا اور امریکی عقل کی سادہ لوحی اور بین الاقوامی حالات سے اس کی بے خبری سے اس نے فائدہ اٹھا لیا۔ یہ کھیل ڈالر کے مقابلہ میں اسٹرانگ پونڈ کی قیمت کم کر دینے کا کھیل تھا۔ اس نے امریکہ کو موقع دیا کہ ڈالر کی برکاری نہیں بلکہ واقعی قیمت کو قائم رکھنے کے لئے برطانیہ سے آگے بڑھ جائے۔ اس نے امریکہ سے اپنی مجبوری اور خوف کا منظر ابھرہ کیا حالانکہ اس کی نیت کچھ اور تھی جس کا اندازہ امریکہ کو بہت بعد میں ہو سکا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹرانگ کے طلقہ اثر میں امریکی مال کا نرخ بڑھ جانے

کے باعث اس پر منڈیوں کے دروازے بند ہو گئے اور وہ منڈیاں برطانوی مال کے فروخت کے لئے محفوظ ہو گئیں اس کے مقابلہ میں سٹرلنگ پاؤنڈ کی قیمت گر جانے کا اثر انگریزی مال کے نرخوں پر نہ پڑا۔ اس حلقہ کے علاوہ انگریزی مال کے نرخ امریکی مال کے مقابلہ میں پائے سے بھی اڑاں ہو گئے۔ آخر جب امریکہ کو اس فریب کا پتہ چلا تو اس نے اس کا جواب عالمی منڈیوں سے ہر قسم کے خام مال کو کھینچ لینے کی صورت میں دیا۔ اسے یہ قدرت حاصل تھی کیونکہ اس کی قوت خرید دوسروں سے زیادہ تھی نیز عالمی منڈیوں میں اس کا رسوخ جا پخ پڑنا مال کی قوت اور نقد سکہ نسبتاً زیادہ تھا۔ امریکہ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ برطانوی صنعت کے مقابلہ میں خام مال کی قیمت چڑھا دی جائے۔ اس صنعت کو مقابلہ کی طاقت سے کمزور کر دیا جائے، کیونکہ خام مال کی قیمت بڑھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی صنعت مجبوراً اپنی پیداوار کا نرخ بڑھا جائے اور اس طرح برطانوی اور امریکی نرخوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے مثلاً اونی خام مال کی قیمت پانچ سو فیصد بڑھ گئی کیونکہ اونی انگریزوں کی ایک ہر صنعت ہے۔ اس طرح برطانوی ملکر کے مقابلہ میں جدید طرز عمل کی بدولت ہر اس خام مال کی قیمت چڑھ گئی جس کی بنیاد پر انگریزی صنعت قائم تھی۔ گرائی کی وہ لہر جو عالمگیر جنگ کی تیاریوں سے پیدا ہونے والے دوسرے قدرتی اوسادی اسباب کے علاوہ دنیا بھر پر محیط ہو گئی تھی اس کا بڑا سبب بھی تھا۔

لیکن یہ امریکی سرگرمی ایک معین حملہ کی روک تھام کے لئے ہنگامی کارروائی سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکی ورنہ امریکی پیداوار کے تعلق سے منڈیوں کی عام حالت سمجھ زیادہ متاثر نہ ہوئی البتہ اسے

ایک بڑا دھچکا یہ لگا کہ عالمی منڈی کے ایک اہم مقام چین کو اشتراکیت نے اپنے جال میں پھانسی لیا۔ چین پچاس کروڑ انسانوں کا مسکن ہے جو تو دنیا بھر کے باشندوں کا ایک چوتھائی ہے۔ چین بنیادی طور پر امریکی مال کی منڈی نہ تھا لیکن جاپان کی شکست کے بعد امید تھی کہ وہ یہ حیثیت اختیار کرنے کا لیکن اشتراکیت نے اسے اپنی آغوش میں لے کر یہ راستہ بند کر دیا اور امریکی مصنوعات کو کسی قدرنگی اور گھٹن کا احساس ہوا۔ اسی طرح اجتماعی حلقوں نے بیماری پھیلنے کا خدشہ محسوس کیا۔ جنگ کو دیا سے کچھ پہلے بیماروں کی تعداد پچاس لاکھ تک تھی لیکن جنگ ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد گھٹ کر تیس لاکھ رہ گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ اگرچہ کوریا کی جنگ نے بیس لاکھ انسانوں کو ہضم کر لیا تھا لیکن بس ایک جنگ مسئلہ کے حل کے لئے کافی نہ تھی۔ امریکہ کو ایک وسیع پیمانے کی جنگ درکار تھی جو ایک طرف تو تمام بیمار انسانوں کو ہضم کر لے اور دوسری طرف سرمایہ کے لئے پورے فتنے کی ضمانت بھی دے۔ پس آج امریکی نقطہ نظر سے جنگ قومی زندگی کی ایک ضرورت بن چکی ہے اور تقاضائے حال کے بموجب عالمی کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی قومی خواہش اس پرستزادہ عالمی اشتراکیت کا یہ سیلاب ہر روز ایک نئی سرزمین کو فتح کرتا اور ایک نئی منڈی پر قبضہ چڑھاتا جا رہا ہے۔

امریکی سیاست کے حربے

سید قطب نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کس طرح دوس اور امریکہ پورے

دنیا کو اپنی تسکارت گاہ سمجھتے ہیں۔ وہ برابر اس فکر میں ہیں کہ باقی ماندہ دنیا کو آہستہ آہستہ اپنے اپنے حصار میں کھینچ لیں اور دنیا کے تمام اقتصادی، جغرافیائی اور انسانی وسائل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ فاضل مصنف کے نزدیک سرمایہ داری امریکی قیادت میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حربے آزماتی ہے :

۱۔ پوری دنیا اور خاص طور پر جاگیردارانہ عرب ملکوں کے سرمایہ داروں کو اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ کرتی ہے اور سامراجیت اور سرمایہ داری کے درمیان مشترک امور کی موجودگی کی وجہ سے مقامی اور عالمی سرمایہ داروں میں طبعی طور پر معاہدہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ جو ممالک سامراجیت کی براہ راست یا بالواسطہ غلامی میں مبتلا ہیں، ان میں سیاسی و اقتصادی دباؤ کام میں لاتی ہے اور یہاں اوقات مسلح تشدد بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتی۔ تمام عرب ممالک میں یہی صورت حال ہے۔

۳۔ کئی عنوانات کے تحت ڈالر کی ساری کو استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ مارشل پلان کے بعد اقتصادی امداد کا عنوان بھی کام کر رہا ہے۔ یا ٹرومین کے پلان میں ”چوتھے نقطہ“ کا عنوان بھی محرک رکھتا ہے۔

فاضل مصنف کے نزدیک یہ لابی عام طور پر حاکم اور استحصالی طبقتوں کو اپنا مطلب بناتی ہے اور عوام کو زیادہ سے زیادہ نہیں لگاتی کیونکہ ان طبقوں کے مفادات سرمایہ دار لابی کے فحشالی سے وابستہ جوتے ہیں چنانچہ یہ لابی ان کے لئے بڑے معرکے سر کرتی ہے لیکن قومی دعوای مقاصد سے بالکل انحراف کرتی ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک امریکی قیادت میں چلنے والی سرمایہ داری کا یہ موقف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ قویں اپنے پیروں پر خود کھڑی نہیں ہو جاتیں اور اس بات کا واضح ثبوت بہم نہیں پہنچاتیں کہ وہ اپنے شعبہ باز سرداروں اور لیڈروں کی

شعبہ بازی سے مسحور نہیں ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ سامراج اور سرمایہ داروں کے لئے حقیقی مشکلات کا باعث بنیں گی اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اس لابی اور اس کی فوجوں کے مصالح کو حقیقی خطرات کی راہ میں نظر انداز کر دیں گی۔ فاضل مصنف کے نزدیک، جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تبھی سامراجی سرمایہ دار لابی ان قوموں کی چیخوں پر کچھ کان دھرنے کی فکر کرے گی۔^۹

کمیونزم پر تبصرہ

فاضل مصنف کا اصل نشانہ امریکی سرمایہ داری رہا ہے۔ ان کی آتشیں تحریروں کا رخ اصلاً سامراجی امریکہ کی طرف ہے لیکن روس کی چالبازیوں، کمیونزم کی فکری بے راہ روی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ناپاک ہتھکنڈوں کے خلاف قاموشی اختیار نہیں کی۔ آپ نے اشتراکی حربوں سے بھی بحث کی ہے اور انسانیت کو ان دونوں بلاکوں سے متنبہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکی بلاک عوام سے مخاطب ہوتا ہے جنہیں فوری عرصہ سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ ہتھکنڈے کے طور پر سامراج کی بدکاریوں اور جرائم کو استعمال کرتا ہے۔ غلام قوموں کی اس خواہش کو کام میں لاتا ہے کہ وہ اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ اس طرح یہ بلاک مغربی تسلیمیت اور مقامی سرمایہ داری کے ہر حقیقی اسلامی دعوت کا مقابلہ کرنے سے فائدہ اٹھاتا اور ہر اسلامی اجتماعی عدل و انصاف کی تحریک کو ناکام کرنے میں مدد دیتا ہے۔^{۱۰}

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی تضاد نہیں ہے:

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اس وقت دو بلاکوں میں منقسم ہے ایک سرمایہ داری

کابلک ہے جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا کمیونزم کا بلاک ہے جس کی سربراہی روس کر رہا ہے اور ان دونوں بلاکوں میں افکار و نظریات اور مفادات کے تعلق سے اینٹ اور کتے کا بیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس نقطہ نظر کی تردید کی ہے۔ سید قطب کے نزدیک ان دونوں بلاکوں کے درمیان یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تقسیم مصالح و مفادات کی تو ہو سکتی ہے افکار و نظریات کی نہیں ہو سکتی۔ یہ منڈلیوں اور شکار گاہوں کا بٹوارہ ہے اصول کا عین کا نہیں۔ روح کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جو ہر دونوں کا ایک ہے۔ دونوں زندگی کی مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک روحانیت کی کوئی ضرورت اور بنیاد نہیں ہے۔ تاریخ اور حیات و کائنات کی مادی تعبیر و تصویریں دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں جو مادی فکر رائج ہے وہ اخلاقی سے اخلاقی اقدار کو انادی قرار دیتی ہے اور مصالح و مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ وہ زندگی سے روحانی عنصر کی نفی کرتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر ایمان کی تردید کرتا ہے اور اعلیٰ قدروں کی تذلیل کرتا ہے اور *for agnomism*۔ فلسفہ کی طرح اشیاء کی حقیقت بس ان کے وظائف و اعمال سے معلوم کرتا ہے۔ اس پورے فکر کے پس پردہ وہی مادیت کام کر رہی ہے جو مارکسزم کی روح ہے۔ روسی امریکی فکر کے مزاج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ معاشرتی و معاشی حالات میں ہے۔ عام امریکی شہری کو کمیونزم کی طرف مائل ہونے میں جس رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے وہ زندگی کا کوئی ایسا تصور اور نظریہ نہیں ہے جو کائنات حیات اور تاریخ کی مادی تفسیر کا انکار کرتا ہے بلکہ اس کے سامنے ٹھنڈی یہ امید ہوتی ہے کہ امریکی معاشرے میں دولت کمانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور مزدور کو اجرت بھی زیادہ ملے گی اور کمیونزم کی دنیا میں یہ مواقع چھن جائیں گے۔

سید قطب کے نزدیک حقیقی رزم گاہ مشرقی و مغربی بلاک اور اسلامی ممالک ہیں۔ اسلام کے مقابلہ میں یہ دونوں دشمن متحد ہیں افکار و نظریات کی سطح پر بھی اور مفادات و مصالح کی سطح پر بھی۔ یورپ، امریکہ، روس اور چین وغیرہ ممالک کی مادیت کی راہ میں حقیقی رکاوٹ صرف اسلام ہے۔ صرف اسلام وہ نظام ہے جو وجود اور حیات سے متعلق ہمہ گیر، جامع اور مکمل تصور دیتا ہے اور باہم کشمکش اور رزم پیکار کی جگہ باہم تعاون و تعامل قائم کرتا ہے۔ انسانیت کو وہ روحانی اصول دیتا ہے جو خالق ارض و سما سے انسان کا رشتہ جوڑتے ہیں اور زمین پر اس کی مرضی قائم کرتے ہیں۔ محض مادی اغراض کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے اگرچہ مفید مادی عمل کو عبادت الہی کا درجہ دیتے ہیں۔

سید قطب نے فراستِ مومنانہ سے کام لیکر جو بات اپنے زمانہ میں کہی تھی وہ اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ ایرانی انقلاب کے خلاف امریکہ کی ریشہ دوانیاں، افغان جہاد کی روسی درندوں سے مزاحمت اور لبنان و فلسطین میں دونوں بڑی طاقتوں کا کھیل اس حقیقت کو منوانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ دونوں بظاہر باہم دشمن اسلام کے خلاف متحد ہیں اور مسلمانوں کے مسائل پر ان کی پالیسی ایک رہتی ہے اور یہ کہ اسلام ہی ان دونوں انسانیت کش طاقتوں کا بوجھ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مصری سیاست کا محاسبہ

سید قطب ان مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں تھے جو عالمی افکار و نظریات پر تو بڑھ چڑھ کر تنقید کرتے ہیں لیکن ملکی و مقامی فکر کو شتر بے ہمار چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کا محاسبہ کرنے سے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے یا انہیں اپنے

گرد و پیش کے باطل کا سراغ لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور اس طرح مقامی صورت حال میں عالمی طاغوت کی تلاش سے وہ غامبی ہو جاتے ہیں جبکہ تحریک اسلامی کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر پہلے نظر ڈالے اور ارد گرد کی برائیوں اور غلط افکار پر پہلے تنقید کرے پھر عالمی و بین الاقوامی دشمنان دین کا بھی بے لاگ محاسبہ کیا۔ شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے ادوار پر نگاہ ڈالی اور ان کی سامراجی خدمات پر بھی بھرپور وار کیا اور اسی وجہ سے مصری حکام نے آپ کے خلاف سخت ٹولش لیا۔

مصری معاشرہ میں ایسے ارباب کمال اور فضلہ کی کمی نہ تھی جو اسلام کی تعلیمات کو حیرات سے پیش کر رہے ہوں اور زندگی کے ہر میدان میں اسلام کی ناکندگی اور ترجیحانی علمی سطح پر نہ کرتے ہوں۔ کمی صرف اس بات کی تھی کہ اصولی طور پر اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے ساتھ موجودہ معاشرہ پر اس کا علی النطاق بھی کیا جاتا اور مومنین و منافقین، یہود و کفار اور دوسرے قرآنی کرداروں کو موجودہ سوسائٹی میں تلاش کیا جاتا، عالمی سامراج کی خدمت کرنے والوں کا پتہ چلا یا جاتا اور تحریک اسلامی ان ساری طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی۔ اخوان المسلمون نے یہی کام انجام دیا۔ اس کے مصنفین میں سید قطب کو وہ امتیازی مقام حاصل ہے جس نے انہیں عالمی و مقامی استعمار کا دشمن قرار دیا۔ اور ساری طاقتیں مل کر ان کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔

شاہ فاروق کے زمانے میں حکومت وقت کو سامراج کا ایجنٹ قرار دیا اور اس پر کڑی تنقید کی :

”مقامی سرمایہ داری اور مغربی سامراج کے درمیان فطری مادی معاہدہ موجود ہے۔ غلام بنانے والوں اور سامراجیوں کا یہ ایک مشترکہ مفاد ہے یہاں

کے سرکش اور سامراجی اس ظلم و استحقصال سے ذرا بھی نیچے اترنے کو تیار نہیں ہیں جس پر وہ مسلسل ڈٹے رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سامراج ہی ان کا واحد مادی سہارا ہے۔ ان کا خالق اور پرورش کرنے والا وہی ہے اور اسی نے انہیں اقتدار اور سرمایہ بخش رکھا ہے۔ اس سامراج نے افغانداروں کو صلہ دیا تھا جنہوں نے عراقی کے لشکر کو دھوکہ دیا تھا اور مصر میں سامراجی حملہ آور فوج کی مدد کی تھی۔ اس نے انہیں زمینیں اور مال و دولت عطا کئے تھے۔ حتیٰ کہ آج وہ شریف گھرانوں کے افراد کے نام سے پکاسے جاتے ہیں اور باعزت خاندانوں کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

سفید فام انگریزوں کی جگہ سیاہ فام انگریزوں کی حکمرانی

انگریزوں کے مصر سے رخصت ہو جانے کے بعد آزاد مصر میں جن لوگوں نے عثمانی حکومت سنبھالی وہ اپنے فکر و نظر، رہائش و زیائش و وابستگی و وفاداری طرز سیاست معاشرت میں انگریزوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے فرق صرف یہ تھا کہ سفید فام کی جگہ سیاہ فام تھا۔ بیرونی مداخلت کی جگہ اندرونی سامراجیت تھی۔ انگریزوں نے ملک چھوڑ دیا لیکن معیشت و سیاست اور فکر و تربیت میں اپنے مہلکی حکمرانوں کو قائم مقام بنادیا۔ اس صورت حال پر سید قطب کی تنقید ملاحظہ فرمائیے :

”انگریزوں کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر مصر کو چھوڑنا پڑے گا چنانچہ نوآبادیاتی افواج کے علاوہ مقامی لوگوں کو استعمار کا تعاون ناگزیر تھا چنانچہ مصری بازاروں کو اپنی نوآبادیات میں شامل رکھنے اور مصری پیداوار کو عالمی منڈیوں میں جانے سے روکنے کے لئے انہوں نے اقتصادی میدان میں

امداد کا سلسلہ شروع کیا اور کرنسی و ذخیرہ کے تبادلوں کے ذریعہ مالی دنیا میں تعاون کا آغاز ہوا لیکن ان تمام امدادی پروگراموں سے انگریزوں کی بقا کا سامان فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس اندرونی سامان کا وجود نہ ہوتا جس نے ماضی میں کارنامے انجام دیئے تھے اور جس کی سرپرستی ان دنوں بطور خاص کی جارہی ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے سفید فام انگریز رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ اُن سیاہ فام مصری انگریزوں نے لے لی جن کے اقلیت پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور جو سامراج کی سرپرستی میں سامراجی مقاصد کے لئے ڈھالے گئے رہے۔ سفید فام انگریزوں نے وزارت تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی جو نوجوان نسلوں کی تربیت کا کام کرتی تھی اب یہ وزارت سیاہ فام انگریزوں کے حوالے ہوئی تو سفید فاموں کو پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ نظام تعلیم، طریق تعلیم کتابیں اور منصوبے سب فکر و روح کو نوآبادیاتی مقاصد کے لئے ڈھال رہے ہیں اور ہم سب دین کے تھوڑے سے عنصر کو شامل کر کے صرف حکومت ہی میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں جاری و ساری ہے۔

اس نوآبادیاتی نظام نے کئی نسلیں پروان چڑھائیں جو وزارت تعلیم کی نگران عقلیت اور اس منطق و فلسفہ سے مالا مال ہیں کہ اسلام دور انحطاط کی ایک یادگار ہے اور جمہور و جہالت کے الزام سے بچنے کے لئے اور مصر کی آزادی و ثقافت کو بروشنی رکھنے کے لئے اس سے بچنا چھڑانا ناگزیر ہے۔

مصری مدارس اور کتب میں تاریخ کا ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ آخر سامراج نے کسی مقصد کے تحت ہی شروع کیا تھا۔ مقصد تھا کہ قومی و دینی روح کو یکساں طور پر قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا

ایک طالب علم بلکہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل بھی تاریخ کے مطالعہ سے فارغ ہوتا ہے اور اسے اسلام کی اجتماعی فکر اور اس کے انسانی نظریہ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ تاریخ اسلامی کے نام پر بس غزوات و سرایا اور واقعات و حادثات کا انبار جمع کر لیتا ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلام ایک جنگی تحریک تھی اور وہ کبھی فکری انقلاب یا اجتماعی یا انسانی پیغام نہیں تھا۔

اس طرح سید قطب نے مصر کے اندرونی نظام پر انگلی رکھ کر بتایا کہ خرابی کہاں ہے۔ وزارت تعلیم پر آپ نے خاص توجہ دی اور نظام تعلیم، طریق تعلیم اور نصاب تعلیم پر کافی تنقید کی کیونکہ فاضل مصنف کو تعلیم و تدریس کا کافی تجربہ تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے انسپکٹر آف اسکولس تھے اور امریکہ جا کر آپ نے ولسن یونیورسٹی کالج، گرین کولور اڈو پیرس کالج، واشنگٹن اور کلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لئے قیام کیا اور وہاں کے نصاب و نظام تعلیم کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور انگریزوں کو امریکیوں کی اس چال کا علم ہوا کہ

توپ کھسکی، پروفیسر پہنچے

جب بسولہ مٹا تو زندہ ہے

تعلیم کے ذریعہ مغربی نظام نے نئی نسل کے اندر جو تباہ کن جراثیم پھیلانے اور کتابوں اور خطبات کے ذریعہ نوجوانوں کو اخلاقی اقدار اور مذہبی تعلیمات سے بیگانہ کیا اس پر سید قطب کی گہری نگاہ تھی اسی لئے اپنی تنقیدوں کا زور

وزارت تعلیم پر صرف کرتے رہے ہیں۔

مذہبی ٹھیکیداروں کا جائزہ

سید قطب نے ان تنخواہ دار سرکاری علماء پر بھی کڑی تنقید کی اور طاغوت کی حکمرانی میں ان کے ظالمانہ کردار پر انگلی اٹھائی جنہیں عوام غلطی سے مذہب و ملت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خواہشات کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ایک طرف ذہنی تنگی اور مسلکی تعصب میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری طرف روح اسلام سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

”فکر اسلامی کا چہرہ مسخ کرنے میں استعمار کی مدد کرنے والا ایک عنصر اور ہے جس سے زیادہ مفید اور تباہ آور عامل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ شیوخ اور درویش ہیں جنہیں عوام الناس نے دینداری کا سرٹیفکیٹ عطا کر رکھا ہے۔ جمود فکر اور تنگی ذہن کی بہترین نمائندگی یہی لوگ کرتے ہیں۔ خرافات اور جہالت کے سراپا تر جان ہوتے ہیں اور ان ساری غیر اسلامی غیر انسانی رسوم و روایات پر دین کا لیبل لگا دیتے ہیں اور دین کی وکالت اس طرح کرتے ہیں کہ آدمی کو اس سے نفرت آجائے اور وہ منہ موڑ کر دوسری طرف چلا جائے۔ یہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں بڑے گھناؤنے جرائم کرتے ہیں اور دین کے احترام و تکریم اور اقامت کو مشکوک بنا دیتے ہیں خاص طور پر جبکہ آیات الہی کے عوض یہ سودے بازی کرنے پر اتر آتے ہیں اور قرآن و اسلام کے نام پر ظلم و استعمار کی مدد کرنے لگتے ہیں۔“

ہر مجتہد ملت اور مصلح وقت نے ان علمائے سوء کے کردار پر تنقید کی ہے۔ باطل نے ہر دور میں اپنے مظالم اور غیر اسلامی اقدامات کی تائید علمائے دین اور جاہل مشائخ

سے حاصل کی ہے۔ انہی دنیا دار مذہبی رہنماؤں کی بدولت وہ ہر زمانے میں اسلام کا
لیبل لگا کر غیر اسلام کی تردید کرتا رہا ہے اکبر کے دین الہی کی ایجاد میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔
مثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کا جواز حاجی ابراہیم سرہندی نے نکالا تھا۔ بادشاہ
کے سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی جلال بدخشانی نے دیا تھا اور ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا
کہ ہائے مجھے یہ کیوں نہ سوچھی^{۱۸}۔ غرضیکہ اس کے دور میں جتنی خرافات پرورش پائیں ان
سب کا سر اعلیٰ سورہی کے سر بند تھا ہے چنانچہ مجدد سرہندیؒ کو ان علماے سور کے
خلاف بھی محاذ بنانا پڑا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشرہ کے تمام طبقوں پر تنقید کرنے کے
ساتھ علماے دین اور طالبان علم دین کو بھی خطاب کیا اور ان کے نقائص پر بھرپور چوٹ
کی۔^{۱۹} سید قطب نے بھی انہیں معاف نہ کیا اور ان کی دنیا دارانہ روش پر گرفت
کی۔

اس طرح سید قطب نے استعماری صحافت کا بھرپور جائزہ لیا اور اس پر بھی
تنقید کی۔ اخبارات و رسائل جو ہمیشہ جمہوری مفادات کا دم بھرتے ہیں اور ملک
کی سالمیت و یکجہتی کا نعرہ لگاتے ہیں، کس طرح بڑی طاقتوں اور سرمایہ داروں
کے ہاتھوں میں کھیلے ہیں اور معاشرے کو اسلامی و اخلاقی عادلانہ قدروں
سے دور رکھنے کے لئے کیا حربے اپناتے ہیں ان پر آپ نے بے لاگ
گفتگو کی۔^{۱۹}

سید قطب کی یہی وہ تنقیدی نگاہ اور سیاسی بصیرت تھی جس کی وجہ سے
دشمنوں کی نگاہ میں آپ خارجی طرح کھٹکتے تھے اور امریکہ، روس اور مصر کی استعماری
نام نہاد شاہی اور پھر بعد میں فوجی حکومت آپ کے خلاف سازشوں کے جال بننے میں
ہمیشہ مصروف رہتی تھیں۔ آپ کی شخصیت میں وہ مومنانہ فراست بدرجہ اتم موجود تھی
جس سے ہر دور میں شیطان اور اس کے حواری لرزاں رہے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

- ۱۔ یوسف المعظم، الشہید سید قطب، دارالقلم بیروت ۱۹۸۰ء ص ۲۰۶
- ۲۔ مثال کے طور پر سوڈان میں اخوان المسلمون نے نیری حکومت کے ساتھ تعاون کر کے جو کچھ حاصل کیا اور عوام میں اثر و نفوذ اور حکومتی مشینری میں عمل دخل حاصل کرنے کی جو کوشش کی اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا نقصان جو اس تعاون کا ہوا وہ تحریک کی انقلابیت کی منفعلاً نہ حیثیت تھی۔ انقلاب اسلامی کا پورا تصور مجروح ہوا۔ مزید برآں نیری حکومت نے تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر اس کے خلاف جو اقدامات کئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ تحریک کو عوام کی نظر میں بدنام کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جو حکومتی اداروں کی طرف سے رچی گئی تھی۔ اس تجربہ سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ حکمرانوں کے ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام چلانے اور ان میں تعاون دینے کی پالیسی بہت زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اس سے تحریک اسلامی کو نقصان پہنچنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔
- ۳۔ یہاں امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ جناب ڈاکٹر عرفان احمد کی ایک گفتگو نقل کرنا دلچسپ ہوگا۔ انھوں نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ء علی گڑھ میں منعقد ہونے والے [International Islamic Federation of Student Organizations] ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات نقل کی کہ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آئادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندوستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ

میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمن اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وہ اس مسئلے میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں۔

۴۔ انور سادات کی ڈائری یا ولدی هذا عمک جمال الدار القومیۃ

للطباعة والنشر بتاريخ ۸ مارچ ۱۹۴۵ء ۳۱۲

۵۔ السلام العالمی والاسلام، مکتبہ، دہلی، مصر، الطبعة

الثانیۃ - ص ۱۵۸-۱۵۹۔

۶۔ نفس مصدر، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

۷۔ نفس مصدر، ص ۱۶۰-۱۶۲۔

۸۔ نفس مصدر، ص ۱۶۳-۱۶۴۔

۹۔ نفس مصدر، ص ۱۶۴۔

۱۰۔ نفس مصدر، ص ۱۶۵۔

۱۱۔ نفس مصدر، ص ۱۶۶۔

۱۲۔ العدۃ الۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبعة عیسیٰ یابی الحلبی مصر، چھٹا

ایڈیشن، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۰-۲۹۱

۱۳۔ السلام العالمی والاسلام، ص ۱۷۱۔ خود ہندوستان میں یہی صورت حال

تھی۔ جب انگریزی فوج یہاں حملہ آور تھی تو ہندو اور مسلم قائدان کتنے ایسے تھے جنہوں نے ہندوستانی مصالح و مفادات کے علی الرغم انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ مل کر لوٹ کھسوٹ مچائی اور انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے باوجود آزاد ہندوستان میں اقتدار میں سب سے زیادہ شرکت انہی کی ہے اور اپنی بے غیری اور متعلقانہ بنیت کی وجہ سے حکومت کے مناسب سے زیادہ دہی اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح مراکش میں

مسلم باشندہوں پر فرانسیسی حملے کے وقت کچھ مسلمان فائز ان ایسے بھی تھے جنہوں نے مسلمانوں سے غداری کر کے فرانس کی فوج کا ساتھ دیا مگر ان میں ایک مشہور نام الجلاوی بھی ہے جس نے فرانسیسی حملہ میں اپنا بیٹا بھی کھو دیا تھا لیکن اسے کوئی ندامت نہ تھی۔

۱۴۔ معرکہ الاسلام والرائسالیۃ، مطبعة دارالکتاب العربی، قاہرہ ۱۹۵۲ء

ص ۱۲۷-۱۲۸

۱۵۔ بد قسمتی سے آج تک پورے عالم اسلام میں وہی مغربی نظام تعلیم رائج ہے۔ ادھر چند برسوں میں علوم و فنون کی اسلام کاری (Islamization of Knowledge) کی مہم بڑے زور شور سے اٹھی لیکن دشمنوں نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا اور اس کے مایہ ناز کارکن تحریک اسلامی کے معروف خادم جناب یوسفیہ اسماعیل راجی الفاروقی کو امریکہ میں شہید کر دیا۔ یہ تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ دیکھئے اس کے مسلم دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۱۶۔ معرکہ الاسلام والرائسالیۃ، ص ۱۲۸-۱۲۹

۱۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے خاکسار کی کتاب تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں

ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۳ء ص ۱۰۶۔

۱۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، التفتیبات الالہیہ، جلد دوم ص ۱۳۴-۱۳۵

۱۹۔ تفصیل کے لئے دیکھئے معرکہ الاسلام والرائسالیۃ ص ۱۵۲-۱۵۳۔

مفکرِ ملت پیکر ایثار و خدمت و دد مند قوم

مفتی عتیق الرحمن عثمانی

(حیات اور کارنامے)

اس دور کے مسلمانوں کے لئے سرمایہ افتخار بھی ہیں اور قابل مطالعہ بھی۔ جو برہان نے مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر کی صورت میں قوم و ملت کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ یہ نمبر چار حصوں اور تقریباً پچاس عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندوؤں پاکستان کے سرکردہ اہل قلم، علماء، رہنماؤں نے حضرت کے افکار و نظریات خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے جن میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی، ڈاکٹر یوسف نجم الدین، قاضی اطہر مبارکپوری، قاضی زمین العابدین، حکیم عبد القوی دریا بادی، مولانا انظر شاہ، کرنل بشیر حسین زیدی، الحاج عبد الکریم پارکھی، پروفیسر طاہر محمود، الحاج احمد سعید طبع آبادی کے گراں قدر مقالات کے علاوہ حضرت کے سفر نامے، ریڈیائی تقاریر، تاریخی اور اہم شخصیتوں کے نام خطوط اور بعض تاریخی شخصیتوں کی اہم تحریریں شامل ہیں۔ قیمت فی عدد ریگزن کی جلد باسٹھ روپے - 62/-

ملنے کا پتہ: مکتبہ برہان، جامع مسجد، دہلی ۷

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۳)

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالرشپ، اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پندرھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی حکومت اسپین سے مکمل طور پر ختم ہو گئی لیکن اس کے سو سال بعد تک ان کی تہذیب پورے طور پر یہاں باقی رہی۔ حتیٰ کہ وہاں آج بھی مسلم تہذیب کے باقی ماندہ اثرات دیکھے جاسکتے ہیں مثلاً اسپینی زبان میں ہزاروں الفاظ آج بھی عربی زبان کے موجود ہیں بلکہ یہ الفاظ یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی گھل مل گئے۔ اور جدید تحقیق کی سان پر چڑھ کر یہ الفاظ اپنی حقیقت آشکار کر رہے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے رسم و رواج یا ان کے بعض اجزاء کو آج بھی اسپین کی معاشرت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کسی قوم کی سیاسی ترقی اور حکومت و سلطنت کا عروج محض فتوحات یا کثرت افواج سے نہیں ہوتا۔ اگر فوجی قوت یا سیاسی اقتدار سے قوموں کی ترقی ہو تو چینگز و ہلاکو کی قوم سب سے آگے ہوتی۔ قومی ترقی ہمیشہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور فکر و نظر سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کے ساتھ ساتھ اگر علوم و فنون، تحقیق و تدقیق، اخذ و فیض اور علمی کوششوں کا ذہن نہ پہنچتا تو یہ فتوحات

ہرگز دیر پا ثابت نہ ہوتیں اور دین و اخلاق اور اخلاص و احسان کی خوبیاں اس پرستزاد میں جس نے ایک مکمل صانع اور پرکشش نظام زندگی عطا کی، جس سے اغیار بھی ان کی قدر دانی پر مجبور ہوئے اور اسی سے ان میں وہ وسیع المنظری بھی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے غیر اقوام کو ان کے علوم و فنون اور تہذیب و اخلاق سے آزادانہ خوشہ چینی کا موقع ملا۔

اسپین میں علماء، حکماء اور صلحاء کے درس و افادے کی جو مسند پچھائی گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسویں صدی عیسوی تک ہسپانیہ کے ہر شہر میں مدرسے، کالج، کتب خانے عام ہو چکے تھے۔ عربی کتابوں کی دکانیں کوچے کوچے میں نظر آتی تھیں۔ بڑے شہروں اشبیلیہ، طلیطلہ، غرناطہ اور قرطبہ میں بڑے بڑے کالج تھے جن میں جامعہ قرطبہ کو مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی جہاں انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ سے آکر طلبہ داخلہ لیتے اور عربی زبان سیکھتے۔ عرب عہد عباسیہ میں ہمہ جہت علمی ترقیوں کا منبع و مرکز بن چکا تھا۔ یہاں قدیم یونانی علوم کو ہی منتقل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہندوستان سے سنسکرت کے عالم اور ریاضی دانوں کو بلا کر علم کی ایک ایک شاخ کو مکمل کر لیا گیا تھا۔

بعد میں اس سرمایہ میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اپنی پوری شان و شوکت اور آن و بان کے ساتھ یہ سرمایہ اسپین پہنچا تھا۔ اسپین کے مدارس اور جامعہ قرطبہ کے ان طلبہ کے ذریعہ یہ سرمایہ حسب ضرورت یورپ کے مالک کو منتقل ہوا۔ اسلامی دنیا میں بغداد کے بعد دوسرا علمی مرکز قرطبہ تھا۔ محدود صفحات میں ہم ان تمام علوم و فنون کا مختصر ذکر بھی نہیں کر سکتے جو مسلم اسپین میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ذیل میں ہم صرف خاص خاص علوم کا اجمالی ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلم ہسپانیہ یا اندلس کی علمی کاوشوں کے وسیع دائرے کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔

۱۔ فلسفہ:

فلسفے کے میدان میں اسپین کے مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفے کی تاریخ میں اگر اندلس کے مسلم فلسفیوں کو شامل نہ کیا جائے تو اسلامی تاریخ ادھور کی مانند ناکمل رہ جائے گی۔ اس میدان میں خاص طور پر ابن رشد، ابن طفیل اور ابن باجہ کے نام زیادہ اہم ہیں اور ان میں بھی چاروں طور پر پہلے دو نام ہیں۔ ابن رشد کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ابن رشد کا تعلق بارہویں صدی عیسوی سے ہے۔ فلسفے میں ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ارسطو کی کتابوں پر تنقید کی اور بہت سی غلطیوں کی اصلاح بھی کی۔ ارسطو کی بعض کتابیں ابن رشد کی تنقید کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس تنقید کے علاوہ ابن رشد کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی فلسفے کو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی۔ سولہویں صدی کے آخر تک ابن رشد کے فلسفے کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ امام غزالی نے گیارہویں صدی میں یونانی فلسفے کے دفاع میں امام غزالی کی کتاب کا جواب لکھا۔ ابن رشد نے ایک طبیب کی حیثیت سے بھی بڑا نام پایا اور شاہی طبیب کا درجہ حاصل کیا لیکن اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے زندگی کے آخر میں ان کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔

ابن طفیل:

ابن طفیل کا تعلق بھی بارہویں صدی سے ہے۔ ابن رشد کے ساتھ ان کا تعلق استاد کے علاوہ دوست جیسا بھی رہا۔ بلکہ ابن رشد کی ترقی کا ذریعہ بھی یہی بنے تھے۔ مسلم فلسفیوں میں ان کا مقام بلند ہے اگرچہ ابن رشد کے مقام تک نہیں

پہونچے۔ انھوں نے بھی اسلامی فکر اور یونانی فلسفے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا اہم کارنامہ وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے فلسفہ کو ایک ایسے شخص کی زندگی کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک ویران جزیرے میں اکیلا پرورش پاتا ہے۔ اور ہر چیز کو آہستہ آہستہ خود اپنے تجربے اور دماغ سے سیکھتا اور سمجھتا ہے اور یہاں تک کہ ایک بڑا فلسفی بن جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام "حق بن یقظان" ہے۔

ابن باجہ:

ابن باجہ پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام محمد تھا۔ ابتدائی زندگی شاعری میں گزری۔ انھوں نے ایک مرتبہ ابو بکر یعنی ابراہیم سرقطہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا اس پر امیر نے خوش ہو کر ان کو اپنا وزیر بنالیا۔ ۵۱۲ھ میں ابن باجہ اپنا وطن جھوڑکہ مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے مراکش پہونچے۔ وہاں کے بادشاہ یوسف بن تاشقین نے انھیں اپنے دربار میں وزیر بنالیا اور تقریباً بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ابن باجہ نے جوانی کے عالم میں ۵۳۳ھ میں شہر فاس میں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے۔ ابن باجہ بہت بڑے فلاسفر اور ادیب تھے۔ صرف ذہنیت میں بھی انھیں مہارت تھی۔ وہ فلسفہ کے اتنے زبردست عالم تھے کہ جلال الدین سیوطی نے فلسفے میں مغرب کا ابن سینا تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن باجہ نے منطق اور ریاضی پر بھی کتابیں لکھیں۔

تاریخ:

تاریخ کے میدان میں سب سے اہم نام ابن خطیب اور ابن خلدون کا ہے۔

ان دونوں کا تعلق اسپین کی مسلم حکومت کے اس آخری دور سے ہے جبکہ صرف غرناطہ میں مسلمانوں کی حکومت رہ گئی تھی۔ دونوں نے غرناطہ کے دربار سے بلند مقام حاصل کیا اور وزیر بھی بنے لیکن آپس کے اختلاف کی وجہ سے ابن خلدون غرناطہ کے دربار کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ابن خلدون نے بعد کی زندگی شمالی افریقہ اور مصر میں گزاری اور مصر کے سفیر بن کر تاتاری بادشاہ تیمور سے صلح کی بات چیت کرنے گئے۔ اس کے برعکس ابن خلیب نے اپنی زندگی غرناطہ میں ہی پوری کی۔

علامہ ابن حزم نے مذہبوں کی تاریخ میں ایک نہایت زبردست کتاب لکھی، اس میں اسلام، عیسائیت، یہودیت کی تاریخ کے ساتھ اسلام کے اندر پیدا ہونے والے مختلف فرقوں کی تاریخ بھی شامل ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلی قابل ذکر کتاب ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے میدان میں سب سے اہم کارنامہ ابن خلدون کا ہے۔ جنہوں نے ساری دنیا کی تاریخ اور خاص طور پر شمالی افریقہ کی بربری قوم کی مکمل تاریخ بہت عمدہ لکھی ہے۔

ابن خلدون کی سب سے مشہور کتاب عرب اور بربر قوموں کی تاریخ ہے لیکن اس کتاب سے بھی زیادہ مشہور کتاب کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ فلسفہ تاریخ پر ہے اور اس کو آج عمرانیات (SOCIOLOGY) کی پہلی کتاب اور ابن خلدون کو اس فن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابن خلدون دنیا کے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مقدمہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ابن خلدون شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تاریخ کے میدان میں ان کی شخصیت زیادہ اہم اور حیثیت زیادہ مسلم ہے۔ ان کا کارنامہ غرناطہ کی وہ تاریخ ہے جو اپنے موضوع پر آج تک واحد بے نظیر کتاب ہے۔

علم طب :

طب بالخصوص جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں مسلم اسپین کا حصہ بہت زیادہ اہم ہے اور اس میدان میں سب سے اہم نام ابن زہر اور ان کے خاندان کا ہے جن میں چھ نسلوں تک بڑے بڑے طبیب اور حکیم پیدا ہوتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ابن رشد کا نام بھی آتا ہے۔ ابن رشد فلسفی ہونے کے علاوہ زبردست طبیب بھی تھے اور خاندان زہر کے ساتھ مل کر علامہ ابن رشد نے فن طب کی کلیات لکھی یعنی وہ کتاب جس میں علاج کے اصولوں پر اور امراض کی قسموں پر نظریاتی طور پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی مختلف بیماریوں کی دوا میں اور ان دواؤں کی خصوصیات کو بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے جڑی بوٹیوں کے میدان میں ابن زہر کے تجربے سے بہت فائدہ اٹھایا جنھوں نے سینکڑوں نئی جڑی بوٹیاں دریافت کیں۔ تجربے سے ان کی خصوصیات معلوم کیں اور بتایا کہ کن بیماریوں میں اور کس طرح یہ بوٹیاں مفید ہیں اور ان جڑی بوٹیوں کے نام بھی انھوں نے رکھے تھے۔ خود ابن طفیل بھی اسپین کے بڑے طبیب تھے لیکن علم طب میں ان کی تحریر نہیں ملتی۔

ادب :

مسلم اسپین میں عربی ادب اور شاعری کو بھی فروغ ملا۔ عربی شاعری میں بعض نئی قسموں کا بھی اضافہ ہوا۔ اسپین کے معلم زعمار اور عام مسلمان ہی نہیں بلکہ بادشاہوں نے بھی گہری دلچسپی لی۔ زحل اور موشحات اسپین کی عربی شاعری کی اہم اصناف ہیں جو یہاں پیدا ہوئیں۔

اسپین میں بنو امیہ کی حکومت کے پہلے ادیب عبدالرحمن الداخل کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا تھا اور اس کے بعد کے مسلمان حکمرانوں میں ہشام، حکم، عبدالرحمن سوم وغیرہ بھی بیش تر اچھے شاعر تھے۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد اشبیلیہ کے عبادی خاندان کے بادشاہ معتد کو اسپین کے بڑے شاعروں میں سمجھا جاتا تھا اور ان کے بھی بہت سے اشعار محفوظ ہیں۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر ابن زیدون خیال کیا جاتا ہے۔ ابن زیدون نے زیادہ تر موشحات کی صورت میں شاعری کی ہے۔ اس کے اشعار بڑے سادہ اور پر تاثیر ہوتے ہیں اور اس کے زیادہ تر شعروں کا تعلق اس کی محبوبہ ولادہ سے ہے۔ جو بنو امیہ کے آخری دور سے تعلق رکھنے والی ایک خلیفہ کی بیٹی تھی اگرچہ یہ دونوں آپس میں گہری محبت رکھتے تھے لیکن مختلف وجہوں سے اس کی شادی نہیں ہو سکی ابن زیدون خلیفہ مکتفی کے دربار میں وزیر تھے اور بنو امیہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد اشبیلیہ کے بادشاہ ابن عباد کے دربار میں فوج کے سپہ سالار تھے۔ اس کے بعد کی زندگی اشبیلیہ میں گزار دی۔

فرانس اور انجلیینڈ جو جہالت کے شکار تھے۔ یہاں کے طلبہ اسپین کی جامعات سے علوم و فنون کی سندیں حاصل کرنے کی بدولت اپنے ملکوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن سکے۔ انگریزی شاعر چامبر کے عہد میں یہ فیضان عام ہو چلا تھا۔ پورے مغرب میں چودھویں اور پندرہویں صدی میں رونما ہونے والی نشاۃ ثانیہ کے لئے جس نے خشتِ اول کا کام کیا وہ دراصل اسپین کے ہی اسلامی مدارس تھے اور مابعد کی تمام علمی و ادبی ترقیوں کا سرچا بطور اسپین کے مسلم حکمرانوں کے سر بند ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یورپ اگر اسپینی مسلمانوں کے علوم سے استفادہ نہ کرتا تو آج سینکڑوں سال پیچھے ہوتا۔

آج اسپین میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے لیکن مسلم عہد کے اسپین کی تہذیب کو تمدن اور علمی فتوحات کے تابندہ نقوش اب بھی اسلامی تاریخ کے صفحات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بوتے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

ماخذ:

اس مضمون کی تیاری میں جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ "تاریخ اندلس" مولانا سید ریاست علی ندوی
- ۲۔ "اخبار مجموعہ" اسلامی اندلس کی ایک جامع عربی تاریخ۔ مولوی زکریا صاحب مائل
- ۳۔ "اخبار الاندلس" منش محمد غلیب الرحمن صاحب
- ۴۔ "سلطان اندلس میں" رشید اختر ندوی
- ۵۔ "دولت ہسپانیہ عرب" مرتبہ شمیم انہولوی
- ۶۔ A POLITICAL HISTORY OF MUSLIM SPAIN
By S.M. IMAMUDDIN
- ۷۔ SPANISH ISLAM, A HISTORY OF THE
MUSLIMS IN SPAIN.
BY REINHART DOZY
- ۸۔ A LITERARY HISTORY OF THE ARABS
BY REYNOLD NECHOLSON

قرآن کریم میں مترادف

(دوسری قسط)

عربی سے ترجمہ :-
محمد رفی الاسلام ندوی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی
پروفیسر مطالعات قرآنی شعبہ دینیات
جامعہ القرویین مغرب

میرسنے دو مختلف الفاظ ایک معنی کیلئے آنے کی جو خالص دی ہیں وہ مل
نظر ہیں اس لیے کہ ظن و حیسب اور قعود جیسے اور ذرائع و ساعد اور الف
و مرنہ۔۔۔ مترادف نہیں ہیں۔ مگر دوسری جگہ مترادف کا انکار کرتے ہیں جیسا کہ
”م آگے نقل کریں گے۔“

ترادف کے قائلین میں قطربہ نحر الرازی، تاج السبکی قابل ذکر میں قریب
قریب سی سیوٹی کا بھی مسلک ہے۔ جبکہ دوسرے علماء ترادف کا قطعی طور پر انکار
کرتے ہیں۔ ان میں سے ”ثعلب“ بھی ہیں جنہوں نے ابن اعرابی کا قول نقل کیا ہے
”والفاظ جنہیں اہل عرب نے ایک معنی میں استعمال کیے ہیں ان

میں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں۔ بسا اوقات
ہمیں وہ معلوم ہو گیا ہے تو ہم نے بتلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکتے

۱۲۸
ہیں کہ اہل عرب کو بھی وہ معلوم نہیں تھے۔

ثعالبی نے ”فقه اللغة“ میں جو مسلک بیان کیا ہے اسکی روش سے وہ تراویف کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ابن الانباری، کتاب الاضداد میں کہتے ہیں کہ ایک معنی کیلئے دو الفاظ ہوں تو ان کے پیچھے پوشیدہ لغوی علت ہوتی ہے ان میں سے ہر لفظ معنی میں دوسرے لفظ سے کچھ مختلف ہوتا ہے ”بسا اوقات دونوں میں فرق اتنا دقیق ہوتا ہے کہ اسے صرف عربی زبان جانتے والا ہی سمجھ سکتا ہے“ یہی

ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب ”الفروق اللغویہ“ تصنیف کی جس میں ایسے الفاظ کے معنی کے درمیان دلائل کے فرق بیان کئے ہیں جنہیں مترادف کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ایک باب ہے ”فی الإبانۃ عن کون اختلاف الالفاظ فی لغة واحدة یوجب اختلاف المعانی“ اس چیز کا بیان کہ ایک زبان میں الفاظ کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب ایک زبان میں دو الفاظ ایک معنی یا ایک چیز کیلئے آئیں تو ان میں سے ہر ایک کا مقتضی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوسرا فضول اور زائد قرار دیا جائے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ کہتے ہیں:

”یہی محققین اہل علم کا مسلک ہے... اسی کی طرف مبر دے ارشاد باری ”لعل جعلنا منکم شرعة و منہاجا“ کی تفسیر میں اشارہ دیکھا ہے۔ کہا ہے کہ ”منہاج کا عطف شرعہ پر ہے اس لیے کہ شرعہ چیز کے ابتدائی حصے کو کہتے ہیں اور منہاج اس کے بڑے اور وسیع حصے کو... چیز کا عطف چیز پر اس وقت صحیح ہوگا جب ایک معنی میں دوسرے

سے مختلف ہو، خواہ دونوں کا مزج ایک ہی ہو۔ لیکن جب دوسرے سے مراد وہی ہو جو پہلے سے ہو تو ایک کا دوسرے پر عطف نہ ہوگا۔
 ابوہلال کہتا ہے کہ: ”یہاں میر نے عطف کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں عربی زبان میں جو دو الفاظ ایک معنی میں آئے ہیں جیسے العقل واللب، المعرفة والعلم، الکسب والجرح، العمل والفعل... ان کا ایک دوسرے پر عطف جائز ہے۔
 اس لیے کہ ان دونوں میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زید کا عطف ابو عبد اللہ پر جائز نہ ہوتا اس لیے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔۔۔ جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک لفظ دو معانی کیلئے استعمال ہو اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ ایک معنی پر دلالت کریں۔ اس لیے کہ اس سے زبان میں بے فائدہ اضافہ ہے۔“
 ابن فارس نے اپنی کتاب ”الصحاحی“ میں لکھا ہے:
 ”ہمارا مسلک یہ ہے کہ ایک چیز کے بارے میں وارد متعدد صفات میں سے ہر صفت کے معنی دوسری صفت کے معنی سے مختلف ہیں بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہوں مگر معنی ایک ہی ہو۔“

x x x

میری معلومات کی حد تک یہ مسئلہ معلق رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے جدید نحوی مطالعات کے لغت صوتیات اور اجتماع کے علوم کی جدید تحقیقات سے ملنے کے بعد بھی عربی کا اہل زبان کسی رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ اگرچہ مترادف کا مسلک بعد کے زمانوں میں غالب اور رائج رہا۔ ادنیٰ حق اللغہ اور علم الاجتماع

اللغوی کے متعدد ماہرین اس کے قائل ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر علی عبدالواحد قابل ذکر ہیں جنہوں نے مجلۃ الثقافہ ۱۹۶۳ء میں ایک مقالہ ”عربی زبان کی خصوصیت“ کے بارے میں قلم بند کیا تھا۔ اس میں انہوں نے عربی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عربی زبان اپنی شہادت کی وجہ سے ایک معنی دہیوں الفاظ کے ذریعے ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم انیس نے اپنی کتاب ”دلالات الالفاظ“ میں عربی میں مترادف کے وجود کو قطعی طور پر ثابت کیا ہے۔ چنانچہ انہیں ”لم یسمع“ ”وفی اذنیہ صمم“ اور ”وفی اذنیہ وقو“ تینوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا انہوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔

”وَاِذَا تَنَادَوْا عَلٰی مَا تَنَادَوْا سَتَكْبَرُوْا“ کَانَ فِیْ اُذْنِیْهِ وَقَوْلًا لِّقَمٰنٍ
 قریب کے نہانے تک دوسری بحثوں کے ساتھ مترادف کی بحث بھی المجموع اللغوی قاہرہ کا موضوع بنی رہی۔ اس کے ایک مقررین نے یہ تجویز رکھی کہ ہم مترادفات کے بوجہ سے ہلکے ہونے کیلئے عربی زبان کی ایک ڈکشنری تصنیف کریں جو ایک معنی کے لیے ایک ہی لفظ کو طے کر دے۔ ”مجمع“ کے نمران الفاظ کے ڈھیر میں سے اختیار کر لیں اور بقیہ الفاظ کو مستبعد قرار دے دیں۔

قرآن کریم عربی زبان کی عظیم کتاب ہے۔ حق یہ ہے کہ ہم اس بحث میں کسی رائے کو اختیار کرنے سے پہلے اسے کتاب عربی میں پیش کریں۔ اس لیے کہ وہی

مجھے میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انیس نے بعد میں اپنے اس مسئلے سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ مترادف کے مسئلہ میں المجموع اللغوی قاہرہ میں لجنۃ الاصول کے تحت ہونیوالے مناقشہ میں مترادف کا انکار کر رہیوالوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔

لے دیکھئے مجلۃ المجموع اللغوی قاہرہ شمارہ ۸ میں احمد امین کا مقالہ۔ اس میں انہوں نے قرآن میں مترادف نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس طویل اختلاف میں فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔

قرآنی مطالعات۔ جس میں میں عرصہ دراز سے اختصاص کر رہی ہوں۔
کے سیاق میں الفاظ قرآنی کا استقرائی تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن
اس معنی میں جس کیلئے لغت اور تفسیر کی کتابوں میں متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں
ہر لفظ متعین دلالت کیلئے استعمال کرتا ہے جیسے کسی دوسرے لفظ کے ذریعے نہیں
ادا کیا جاسکتا۔

• کیا دونوں الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں؟ الرؤیا اور الحلم :

مثلاً سورہ یوسف کی دو آیتوں میں :

أَفْتَوْنِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ (۲۳)

قَالُوا أَأُفْنِغَاتُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِهَا إِلَّا جُلَامٍ بِعَالَمِينَ (۲۴)

لغات میں 'حلم' کی تشریح 'رؤیا' سے ذریعے کی جاتی ہے۔

کیا نہایت بخت میں خالص اہل عرب انہیں قرآن کے مثل ایک سو دہ ت لائے

کا چیلنج کیا کرتا تھا دونوں الفاظ میں سے ایک دوسرے کی جگہ رکھ سکتے تھے اور کہہ
سکتے تھے؟

أَفْتَوْنِي فِي حُلُمِي إِن كُنْتُمْ لِلْعُلُمِ تَعْبُرُونَ ؟

ہرگز نہیں۔ ایسا عربی زباج کی صحیح حصہ رکھنے والا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا۔

قرآن میں جب ہم ان دونوں الفاظ کا استقراء کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے

کہ دونوں میں تریف نہیں ہے۔ قرآن نے 'أَحْلَام' تین مرتبہ استعمال کی ہے۔

ان کے سیاق دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد پریشان کن اور ٹڈلنے خواب اور مغلطہ

اور بے حیثیت دوسرے ہیں۔ تنبیہیں جگہ جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے جو غلط و تشویش پر دلالت کرتا ہے جس میں کوئی 'علم' دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتا۔
سورۃ انبیاء میں ہے :

”بل قالوا أضغاث أحلام“ بل افتراء۔ بلے صو شاعر، فلیاتنا
بآیۃ کما أرسل الأولون“ (الانبیاء - ۱۵)

دوسری جگہ عزیز کی قوم کے ساتھ درباریوں کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ جب عزیز نے ان سے کہا کہ اس کے خواب کی تعبیر بتائیں۔

”قالوا أضغاث أحلام“ وما نحن بتأویلہ الا حلام بعالمین“ (یوسف: ۴۲)
لفظ "رویا قرآن میں سات مرتبہ آیا ہے۔ تمام جگہوں پر یکے خواب کے معنی میں آتا اور مفرد کے ضیعے میں آیا ہے جو اس کے واضح، جلی پاؤں صاف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

سات جگہوں میں سے پانچ جگہ انبیاء و کلیلے آیا ہے جہاں اس سے مراد سچا الہام ہے جو وحی سے قریب ہوتا ہے۔

سورۃ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب :

”وذا مریناہ اُن یا ابراہیم“ قد صدقت الرویا“ انا کذلک بخزری

المحسین“ (۱۰۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب، جب آپ کے والد یعقوب علیہ السلام نے آپ سے کہا تھا :

یا بنی لا تعصم رویا کے علیٰ إخوتک، فیکدوا لک کیداً، ان

الشیطان للانس عدو مبین (یوسف - ۵۰)

اسی سورہ میں ہم اس کے سیاق کا تتبع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ خواب

شرمندہ تعبیر ہو گیا :

فَرَفَعَ أَبُورِيٍّ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سَجْدًا وَقَالَ يَا أُبْتُ هَذَا
تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلْتُكَ حَقًّا وَرِيسًا (۱۰۰)
سورہ اسراء میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب :
وَمَا جَعَلْنَا الْإِبْرَیْمَ إِلَّا قَلْبًا لِلنَّاسِ (۶۰)
اور سورہ فتح میں آپ کا خواب :

”لَقَدْ صَدَّقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْوَرِیًّا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ
إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسِهِمْ وَمُقَفِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ بِأَلَمِ
تَعْلَمُوا، فَبَجَلْ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتَحَاقَرِیْبًا“ (۲۷)

یہ وہ پانچ مقامات ہیں جہاں قرآن نے نبیاء علیہم السلام کو رؤیا کا لفظ استعمال
کیا ہے۔ آخری دو مقامات عزیز مصر کے رؤیا کے بارے میں ہیں جو سچ ثابت ہوئے
اس آیت میں قرآن نے دو مرتبہ بادشاہ کی زبان سے رؤیا کا لفظ ادا کیا خواب
میں اس کے واضح جلی اور صاف ہونے کی وجہ سے اگرچہ اسکی قوم کے درباری اسے
ہوا جس، اہام اور برے خواب سمجھ رہے تھے :

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ يَقْرَاتٍ سَمَانٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عَجَافٍ
وَسَبْعَ سَنَابِلَاتٍ خَضِرٍ وَأَخْرِيَّاسَاتٍ يَا أَيُّهَا الْمَلِكُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ
إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبِرُونَ قَالُوا أَصْنَعَاتُ أَعْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ عِلَالِ حُلَامٍ
بَعَا لِمَسِينٍ دَلِیُّوسَفَ (۳۴-۳۳)

قصہ قرآنی سیاق میں جاری رہتا ہے کہ اچانک بادشاہ کا خواب سچا
الہام ثابت ہوتا ہے۔ اور ڈرانا خواب نہیں ہوتا جیسا کہ اس کے درباریوں نے
کہا تھا۔

انس اور البصر:

لغت میں انس ۱۔ لاشی کے معنی دیکھنا، انس ۲۔ الصوت کے معنی سنا اور استانس کے معنی اجانت طلب کرنا بیان ہوئے ہیں۔ تو کیا پاکیزہ عربی زبان یہ جائز قرار دیتی ہے کہ قرآن جہاں 'انس ناراً' کہتا ہے وہاں اسکی جگہ البصر یا نظریہ یا شہد یا دوسرے الفاظ جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ انس کے ہم معنی ہیں۔ لائے جاسکتے ہیں۔

جب ہم قرآنی استعمال کا استقراء کرتے ہیں تو اس سے ہمیں عربی زبان کی تینہ حص حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کو دیکھنے یا سینے کیلئے 'انس' نہیں کہا جائے گا جس میں کوئی انسیت نہ ہو۔ ایک عربی جب 'انسیت' کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایسی چیز دیکھی یا سنی ہے جو انسیت بخشی ہے۔

قرآن نے فعل 'انس' کو پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ چار جگہ اس آگ کے ذریعہ میں جسے موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا جب وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ وہ آیات یہ ہیں:

ظہ۔ ۱۰: اِذْ رَاكَ نَارًا فَقَالَ لاهُلهٗ اَشْكُوْا اِنِّیْ اَنْتَ نَارُ الْعٰلَمِیْنَ اَیْتَكُمْ مِنْهَا بَقِیَیْسٌ اَوْ اُجُودٌ عَلٰی النَّارِ صَدِیْقٌ۔

النمل۔ ۷: اِذْ رَاكَ مُوسٰی لاهُلهٗ اِنِّیْ اَنْتَ نَارُ سَآئِیْتِكُمْ

منھا نَجْرٌ اَوْ اَیْتَكُمْ بِشَیْءٍ فَبِیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ لَصِطْلُوْنٌ۔

قصص۔ ۲۹: فَلَمَّا قَضٰی مُوسٰی الْاَجَلَ وَاٰتٰی بِاهْلَہٗ اَنْسَ

مِنْہٗ نَارًا فَطَوَّرَ نَارًا اِنِّیْ اَنْتَ نَارُ الْعٰلَمِیْنَ

اَیْتَكُمْ مِنْہٗ نَجْرٌ اَوْ اَیْتَكُمْ بِشَیْءٍ فَبِیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ لَصِطْلُوْنٌ۔

پانچویں جگہ سورہ کنعاع میں آیا ہے :
 وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَلْيَنْصَحُوا لِمَا كُنْتُمْ رِشْدًا فَأَرْفَعُوا
 إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (۶)

یہاں یتیموں سے مراد محض سن بلوغ کے ماری وحشی منظر رشد کا
 دیکھنا نہیں بلکہ آزمائش و امتحان کے بعد یا طبعان حاصل کرتا ہے کہ واقعی وہ
 سن رشد کو پہنچ گئے ہیں۔

اسی مادے سے سورہ نور میں استئناس کا فعل مضارع کا صیغہ آیا ہے
 ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بِيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا
 تَسْمِعُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا“ (۲۴)

یہاں استئناس سے مراد محض استئذان (اجازت طلب کرنا) نہیں
 صراحتاً مفہوم کو ہم دوا۔ بلکہ اس سے مراد اہل ہونے سے پہلے گھر والوں کی
 انیسیت کا احساس دلانا ہے۔

عربی زبان کا ذوق یکتا سن نہیں رکھتا کہ پولیس، ٹیکس، تفسیر، ترمیمی
 حواہ کے اجازت طلب کرنے کے لیے سن استئناس کا لفظ استعمال کیا جائے۔
 یہاں استئذان کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں انیسیت کی جس
 کا فقدان ہے۔ اسی طرح دشمن اور بھینس کہیں آگ لگی ہوئی دیکھنے کو یا بجلی
 کو ایک یا دوسرے کی آواز سننے اور تھنص نہیں کہیں گے۔

النائی اور البعد:

بیشتر اہل لغت، مفسرین النائی اور ابجد دونوں کے درمیان کسے
 کی تائید سارے کے بغیر ایک کو دوسرے سے خفیہ استعمال کرتے ہیں لیکن تراز
 کا انکار کرنے والوں نے دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔

ہم النائی اور البعد کے قرآنی استعمال کے مقامات کا استقراء کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ دونوں میں مترادف نہیں ہے۔ 'النائی' اعراض، روگردانی اور منہ پھیرنے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں اس کا صریح سیاق و سباق دلاتا ہے:

الاسراء - ۸۳: وَإِذَا أُنْتَهَى عَلَى الْإِنْسَانِ أَنْعُرْهُ وَنَائِي بِجَانِبِهِ

[ساتھ ہی دیکھئے سورہ حم السجدة - ۵۱]

الانعام - ۲۶: حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ عُرْوَةَ يَمْحَاكُ يَوْمَئِذٍ الَّذِينَ كَفَرُوا

إِنَّ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ وَيَوْمَئِذٍ نَكُنُ يَكْفُرُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ

”البعد“ تو یہ قرآن میں حقیقت و مجاز پر مختلف صیغوں کے ساتھ مکانی یا زمانی بعید یا معنوی بعید کے معنوں میں آتا ہے:

التوبہ - ۴۴: لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَا تَقْبَلُونَ وَلَكِنْ بَعِيدٌ

عَلَيْهِمُ الشَّفْعَةُ

الزخرف - ۲۱: حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ عُرْوَةَ قَالَ يَا لَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدُ الْمَشْرِقَيْنِ

قَبْسُ الْقُرُونِ

الفرقان - ۱۲: إِذَا رَأَوْهُمُ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَفِيظًا وَزَفِيرًا

سبا - ۵۲: وَأَتَىٰ لَهُمُ التَّنَاضُوسُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ

هود - ۸۳: وَمَا هِيَ مِنْ الظَّالِمِينَ بَعِيدٌ

الانبیاء - ۱۰۴: إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمُ نَارُ الْحَشِيِّ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُعَذَّبُونَ

ق - ۳۱: وَأَزْلَفَتْ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ

الانبیاء - ۱۰۹: فَإِنَّ أَرْضِي أَقْرَبُ أَمَّ بَعِيدٍ مَا تَوْعَدُونَ

المعارج ۶۰: انهم يروننا بعيداً ونراهم قريباً۔
 آل عمران ۱۰۳: يوم تجد كل نفس ما عملت من خير محضراً وما عملت
 من سوء تود لو أن بينها وبينه أمداً بعيداً۔
 سبأ ۱۹: فقالوا ربنا يا عبد بن اسفارنا وظالموا انفسهم
 فجعلناهم اعداء مبغضين ومنزلناهم كل ممزق۔
 النمل ۲۲: فمكث عني لعيد فقال احطت بما لم تحيط به وقتك
 من سبأ نبأ يقين

مندرجہ بالا تمام آیات میں مکانی یا زمانی بعد درج ہے :
 اسی طرح بعد کا استعمال قرب کی سند کے معنی میں 'مندرجہ ذیل' آیات میں ہوا ہے
 ہود ۹۵: الا بعد المدین کما بعدت شمو۔
 ہود ۶۸، ۶۹، ۷۰: "وقیل بعداً للقسیم الظالمین"
 [ساختہ سورۃ المؤمنون: ۴۱، ۴۲]

اسی طرح 'بعد' کا استعمال معنویات کیلئے بھی ہوتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل
 آیات میں ہے :

* شقاق بعد البقرہ ۱۷۶ الحج ۵۲، حم السجدہ ۵۲۔
 * ضلال بعد ابراہیم ۳، النسا ۶، ۱۱۶، ۱۳۶، ۱۶۷ الحج ۱۲۔
 الشوریٰ ۸ سبأ ۸ ق ۲۷

ان تمام آیات میں 'بعد' قرب کی ضد آیا ہے جبکہ 'الناٹی' صرف اعراض
 کے معنی میں آتا ہے جو 'توجہ' کی ضد ہے۔

الحلف اور القسم

بکثرت ایک کی تشریح دوسرے سے کی جاتی ہے اور لغت کی کتابوں میں

دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا ہے 'حلف' متعدد جاہلی اشعار میں
قسم کے معنی میں آیا ہے جیسے :

الغالبۃ الذبیاتی : حلفت فلم أترک لنفسی رعیۃ -

الاعشی : حلفت لہ بالراقصات الی منی -

شاش بن عبدہ : حلفت بما ضمت الحجیم الی منی -

لیکن پاکیزہ عربی زبان کی جس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے حلفۃ
فاجبر، اُحلفۃ کاذبۃ یہ کبھی نہیں سنا گیا ہے۔ حلفت پر اُحلفۃ صادقۃ

الایہ کر شعر میں آئے۔ اسی طرح عرب میں کہتے ہیں 'أحلف الغلام' جب لڑکا
سور اور غ کو تباؤ کر جائے اور اسکی بلوغت میں شک کیا جائے لگے۔ اسی طرح

عرب کہتے ہیں 'مناقۃ محلفۃ السنام' اس اونٹنی کے بارے میں جسکی سر...

شک ہوا اور ملیت محلفۃ، اس اونٹنی کو کہتے ہیں کازنگ سرخ دسیا ہے

در بیان ہو۔ اور ملیت غیر محلفۃ، اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا رنگ سرخ

ہوا اور کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ اسی طرح کہتے ہیں : "حضرار الذن

محلفان" ان دو ستاروں کے بارے میں جو 'سحیل' نامی ستارے سے قبل

دکاتے ہیں اور وہ نول میں اسے ہر ایک کے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سحیل

ہے۔ تو کیا شعر میں 'حلف' کا شک وارتیاب کے علاوہ دوسرے معنی کیلئے

استعمال ہونا ضرورت شعر ہی میں سے ہے ؟

جب ہم قرآن کے اعلیٰ بیان سے اس سلسلہ میں فیصلہ چاہتے ہیں تو اس

کے مکمل استقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں 'ح ل ف' کا مادہ تیسرے جا

آیا ہے۔ اور تمام جگہ۔ بغیر کسی استثنا کے۔ چھوٹی قسم کی بیٹہ آتا ہے۔

اکثر فعل کا اسند و منافقین کا طوف ہے۔ یہی سیرۃ توبہ کی آیات جن

الہ افی کا کھوٹائی پر کیا گیا ہے :

”وَسِيحَافُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ

أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۴۲)

”وہ سحافتوں نے باللہ لو اسطعننا لخرجنا معکم دہلکون

أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۴۲)

کائنات میں (۶۲)

”وَسِيحَافُونَ بِاللّٰهِ مَا تَعَالَوْا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بِالْعَدْلِ اِنَّهُمْ لَمُذْمُومُونَ

”يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضَىٰ عَنْ

الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (۴۶)

”وہ سحافتوں نے ان اردنا الہ الحسنىٰ بِاللّٰهِ لِيُشْهِدَ اِيْهُمْ لَكَاذِبُونَ (۴۶)

ان آیات کے ساتھ منافقین کی بارہ میں اللہ کی آیات بھی ہیں :

النساء - ۶۲ : وَلَازِلُفِيلٌ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلَيْهِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَآلِی الْوَسْوَی

رَابِعًا لِّلْمُنَافِقِیْنَ یُحَدِّثُونَ غِبَابًا وَیُؤْوُونَ اِلَیْهِ اِذَا اَصَابَ بِتَقْطِیْمٍ مَّهِیْمَةٍ

بِاَقْدَمَتِ اَیْدِیْهِمْ ثُمَّ جَاءُورِیْنَ یَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنَّهُ اُرْدُنَا اِلَیْهِ حَسَانًا وَلَقَدْ

اَوَّلِیْهِ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوبِهِمْ فَاَعْرَضَ عَنْهُمْ وَعَظَّمَ قُلُوبَهُمْ فِی

أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا

المجادلہ - ۱۳ : اَلَمْ تَرَ اِلَی الْاِیْمَانِ قَوْلُہُمْ رَا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْہُمْ مَا هُمْ یَعْلَمُونَ

وَلَا یَعْلَمُونَ عَلَی الْکُذِبِ وَہم یَعْلَمُونَ

المجادلہ - ۱۸ : یَوْمَ یُعْذِبُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فِیْہِمْ غُفْرٰتٌ اُولَکَ خَسِرُوْنَ لَکُمْ وَیَحْسِبُوْنَ

عَنْہُمْ عَلٰی شَیْءٍ اَلَا اِنَّہُمْ لَمُکَاذِبُونَ

القلہ - ۱۰ : وَلَا تَطْعَمْ کَاِبَرٌ عَلَیْہِمْ ہَمَّارٌ مَّشَآءُ بَنِیْمٍ مِّنَ اَنْجَارٍ یَّخْرُجُ حَتَّارٌ

فَعَلَّ ۝ سَارِفٌ اِیْہِمْ مَّرْتَبَہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کِیْ تَصِیْرُہُمْ فِیْ اَنْفُسِہُمْ اَلَا اِنَّہُمْ لَمُکَاذِبُونَ

حلفہ کا کفارہ واجب ہو گیا۔

”ذَلِكَ كَفَارَةٌ بِمَا نَكَمْتُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ“ (المائدہ - ۸۹)

”۱۱ القسم“ تو اس کا استعمال سبھی قسموں کیلئے ہوا ہے سورہ واقعہ میں اس کی صفت ”عظیم“ بیان کی گئی ہے۔

”وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّتَعْلَمُونَ عَظِيمٌ“ (۷۶)

سورہ فجر میں اللہ تعالیٰ سوال کرتا ہے:

”هَلْ فِي ذَلِكَ حَسْمٌ لِّذِي حَجَرٍ“ (الفجر - ۵)

سورہ مائدہ آیات ۱۰۸-۱۰۹ میں قسم، وصیت کے خلاف شہادت دینے کی حرمت کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں جھوٹی قسم کی حرمت کا بیان ہے۔

سورہ قلم میں جن باغ والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی قسم میں سچے تھے:

”إِذَا أَقْسَمُوا بِبَصَرِ فَتَحَا فَبَصِيرُ الْإِنسَانِ“ (القلم - ۱۷)

اسی طرح وہ مجرم بھی جھوٹے نہیں ہوں گے جو قیامت کے دن قسمیں کھا کھا کر کہیں گے: ”وَيَوْمَ يَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ“ ”مَا بَشَرْنَا غَيْرَ سَاعَةٍ“ (الروم - ۵۵)

قسم کا اسناد ”ضالین“ (گمراہ لوگوں) کی طرف بھی ہوا ہے۔ اس لیے کہ خود ان کا پر اپنی گمراہی عیاں ہونے سے پہلے، ان کی قسم سچے دل سے ہوتی تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں ہے:

الانعام - ۱۰۹: ”وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جِئُوا فَيَكْفُرُوا بِهِمْ فَأَتَوْا بِهِمْ“

”لِيَوْمَئِذٍ يَكْفُرُونَ“ (۱۰۹)

فاطر - ۲۲: ”وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جِئُوا فَيَكْفُرُوا بِهِمْ فَأَتَوْا بِهِمْ“

”لِيَوْمَئِذٍ يَكْفُرُونَ“ (۲۲)

الأعراف - ۴۹: ”وَنَادَىٰ اصْحَابُ الْأَعْرَافِ رَجُلًا يَعْرِفُونَ نَجْمَ الْبَرِّ“

قالوا ما أغنى عنكم جمعكم وما كنتم تكبرون، أهولاء الذين أقسمتم
لا ينالهم الله برحمة

ابراہیم۔ ۳۴: وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا
رَبَّنَا أَخْرِنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نَّحْبِ دَعَوَتِكَ وَنَتَّبِعِ الرَّسُولَ اُولَٰمَ تَكُونُوا اُقْسِمْتَ
مَنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ

النحل۔ ۳۸: ”وَأَقْسِمُوا بِاللَّهِ جِئُوايَا نَحْمُ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مِنْ مَيِّتٍ
بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

سورہ مائدہ میں ہے :

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جِئُوايَا نَحْمُ انْهَمْ لَكُمْ

حبطت أعمالهم فاصبحوا بخاسرین (۵۳)

اس کے سیاق میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہ قسم منافقین کی اس آزمائش
سے پہلے کی ہو جس نے ان کا کذب ظاہر ہو گیا ہو۔

اس بیان قرآنی کے سامنے یہ بات آسان نہیں کہ ہم قسم کی تشریح حلف سے
کر ہی قرآن کا انداز ان دونوں کے درمیان دقیق فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے اگر ہم
میر نہ کہیں کہ ”قسم“ علی الاطلاق سچی قسموں کیلئے (خواہ وہ حقیقی طور پر یا وہی طور پر)
کیلئے آتا ہے۔ اور حلف ”جھوٹی قسموں کیلئے۔ تو کم از کم یہ تو کہہ ہی سکتے ہیں کہ ان کی
دلائلوں میں عام و خاص کا فرق ہے۔ قسم کا اطلاق تمام قسموں پر ہوتا ہے اور حلف
جھوٹی قسموں کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ بیان قرآنی کے استعمال سے معلوم ہوتا

النَّصْدُ ع اور التَّحْطُّمُ :

سورہ حشر کی آیت ہے :

”وَنَزَّلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جِبْرِئِلَ لِيُنذِرَ الْبَشَرَ بِمَا كَسَبُوا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنُظَرِّبَ النَّاسَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ“ (الحشر-۲۱)

اس آیت میں ”تصدع“ و ”تخلم“ کے مترادف نہیں ہے۔

تصدع، صدع سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں ٹھوس اجسام کا پھٹنا مرنی میں مجازاً صدع (درد و سہم) کیلئے استعمال کرتے ہیں گویا درد اور چکر سے سر پھٹا جاتا ہے۔ اسی معنی میں سورہ واقعہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

”لَا يَصْدُرُ عُدُوٌّ“ ”هَٰؤُلَاءِ نِعْمَ الْفَوَاحِشُ“ (۱۹)

اسی طرح معنوی طور پر تصدع، تفویق و تمزق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور الصدع بالامر کے معنی ہیں کسی قطعی بات کے ذریعے کسی کام کا فیصلہ کرنا اسی معنی میں سورہ حجر کی آیت ہے

”فَاَصْدَرَ بِهَا تَوَمُّوْا عَرْضَ الْمَشْرِقَيْنِ“ (۹۴)

لیکن تخلم کے معنی ہیں ”ہشتم“ دچور چور ہونے کے ہیں۔ اس کا استعمال ان چیزوں کے ساتھ خاص ہے جو خشک ہوں۔ خواہ سخت اور ٹھوس ہوں یا نہ ہوں۔ عربی میں شیر کو حطوم کہتے ہیں اس لئے کہ وہ شکار کو بے پزیرہ ریزہ کر دیتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اسی طرح منحوس سال کو حاطم اور حطمة کہتے ہیں اس شخص کو جو ہر چیز لنگل لے پھر بھی پیٹ نہ بھرے۔ رُجل حطم کہتے ہیں۔ اور سنگ دل چرواہے کو راع حطمة یا راع حطم کہتے ہیں۔ گویا وہ جانوروں کو بانکتہ وقت اپنی سختی سے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

بر اصل معنی (یعنی سختی اور سنگ دلی کے ساتھ توڑ پھوڑ) قرآن کے ان چیمور بمقتضا استہدایا جاتا ہے جہاں اس مادہ کا استعمال ہوا ہے۔

سورہ نمل میں ہے :

قال في نسخة يا أيها النمل ادخلوا مساكنكم لا يحطمنكم سليمان

وجنوده وهم لا يشعرون (۱۸)

سورۃ الزمر اور سورۃ الحديد میں زبر، سوکھی اور چوڑے چوڑے کیلئے حطام کا

لفظ آیا ہے:

۱۰ ثم ترأى الله أنزل من السماء ماءً فسلكه ينابيع الدُّنْيَا ثم يخرج به

زبراً مختلفاً لَوْنُهُ ثُمَّ يَجْعَلُ فَتْرَةً مَصْفُورَةً ثُمَّ يَجْعَلُ حَطَاماً (الزمر - ۲۱)

”۱۰ اعلیٰ ہوا آسمان الحیاۃ الدنیا لعب ولعب وزینۃ وبقا آخر جنکیم و شکا شرفی اذا

ثوال والاولاد کتل غیثہ عجیب الکفان نباتہ“ ثُمَّ یَجْعَلُ فَتْرَةً مَصْفُورَةً ثُمَّ

یکون حطاماً (الحديد - ۲۰)

سورۃ حمزہ میں خطبۃ ”اس آگ کیلئے آیا ہے جو لوگوں پر طعن کرنے اور پیچھے

پیچھے برائیاں کرنے والے شخص کو توشہ پہنچا کر رکھ دے گی:

”الذی جمع وعدۃ“ بحسب آتہ الہ الخلدہ“ کلا یسبذت فوز الخطیۃ

وما دار الی ما الخطیۃ تدار الیہ“ (وقدہ“ (۲-۶)

”حطم“ کا استعمال جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں آیا ہے جو پتھر پڑ جانے

والی اور خشک چیزوں کیلئے ہوتا ہے جیسے تصدع“ کا استعمال سخت اور نفوس

جیزاں کیلئے ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ حشر میں پہاڑ کیلئے ”او یسبذت فوز الخطیۃ

مندرجہ ذیل آیت میں زمین کیلئے ہوا ہے:

”والسما عزات الوجع“ والدُّنْيَا ذات الصدع“ (انہ لقول وما

هو بالهول“ (۱۱-۱۲)

الخشوع والخشية اور الخصور والخو:

سورۃ حشر میں پہاڑ کیلئے ”تصدع“ کا لفظ اس کے اصل لغوی معنی میں

استعمال ہوا ہے۔ اس میں بیان کا اعجاز یہ ہے کہ خشوع کی نسبت پہاڑ کی طرف کی گئی ہے جبکہ پہاڑ کی شان یہ نہیں ہے کہ اس پر خشوع یا خشیم طاری ہو خشوع اور خشیم دونوں دل کے افعال ہیں۔ جن کا صدف جمادات سے نہیں ہوتا۔ یہ بیان اس کا اعجاز ہے کہ اس سنبے جان پتھر میں زندگی کی روح بھونکی ہے۔

خشیمہ معنی میں خوف سے مختلف ہے اس لیے کہ اس کا صدف اس ذات کی عظمت پر ہے یقین سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ اسی طرح خشوع معنی میں خضوع سے مختلف ہے۔ خشوع کا صدف اس ذات کی جلالت سے ہے جو تار سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں جبکہ خوف قبر و دہشت کے تسلط سے بھی پیدا ہوتا ہے اور خضوع میں نفاق اور خوف کی وجہ سے تصنع یا تقیہ یا مدارات ہو سکتی ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں خشع قلبہ وہ خضع قلبہ نہیں کہتے۔ إلا تخوزا۔

قرآن کے اس معجزانہ بیان میں حیرت انگیز نسق و ترتیب، لطیف دلائل اور خیرہ کن اسرار ملتے ہیں۔ قرآن خشیمہ کے مختلف دنیاوی زندگی کے بارے میں آئے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا ہی آزمائش کا میدان ہے۔

قرآن میں ”خشیمہ“ کی نسبت جن امور کی طرف کی گئی ہے۔ وہ ہیں غیب، قیامت، آخرت یا تنگی و پریشانی، فقر و فاقہ، تجارت کا ماند پڑ جانا، یتیموں کا مال ہرنیپ کر لینا اور سرکشی اور کفر کے ذریعہ تنگ کرنا۔

لہٰذا ان اسکی نسبت اگر کسی ذات کی طرف کی گئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انہی نسبت کسی مخلوق کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ یہ نکتہ قرآن کے ان تمام مقامات میں پایا جاتا ہے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یسر ۳۰ : اِنَّمَا تَنْذَرُ مَنْ اَتْبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنََ الْغَيْبَ

[سجده کی دیکھتے آیات : ق ۳۳ الانبیاء ۴۹ قاطر ۸ الملک ۱۱ الرعد ۲

البینۃ - ۸: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ، وذلك لمن خشى ربه

النازعات - ۱۹: واهدیک الی ربک فتنخی

الاحزاب - ۲۷: وتخشى الناس واللہ احق ان تخشاه

[ساتھ ہی دیکھئے آیات: المائدہ ۳۴، التوبہ ۱۳، البقرہ ۵۰، النساہ ۷۷]

التوبہ ۱۸: ولم یخش الا اللہ

آل عمران: الذین قال لهم الناس ان الناس قد جمعواکم فاخشوا

فزاہم ایماناً وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل

قرآن میں اللہ کی خشیت کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی گئی ہے جو اپنے رب

کے پیغامات پہنچاتے ہیں، جو ذکر کا اتباع کرتے ہیں، جو ایمان اور علم کے حامل ہوتے

ہیں اور جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے لیکن جب اللہ کی

خشیت پہاڑ پر طاری ہونے لگے جیسا کہ سورہ حشر کی آیت ۲۱ میں ہے۔ یا

پتھر پر طاری ہونے لگے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۷۶ میں ہے اور ان منہا المذکب

من خشية اللہ میں ہے تو یہ قرآن کا اعجاز بیان ہے جو بے جان جمادات میں

زندگی کی روح بھونک دیتا ہے اور اسے حس و حرکت کرنے والا، ثاثر قبول کرنے

والا اور خشیت اور خشوع پیدا کرنے والا بنا دیتا ہے۔

اسی طرح 'خشوع' بھی جامد پہاڑ کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ دل کا فعل ہے

عربی میں خشع الصوت، خشع الوجه، خشع البصر استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی

خشوع قلب سے ہے۔

● (باقی آئندہ)

اپنے موضوع پر نادر اور بے مثال کتاب

سرجری اسلام کے قرونِ اولیٰ میں

اور

اس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

مؤلفہ

مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی

رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

عہد رسالت اور عہدِ خلفاء و تابعین میں سرجری کی موجودگی اور اہم آپریشنوں کا وجود اور اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس کی مختلف قسموں اور اس کے نوعِ بنوعِ طریقوں کا رواج خود عہدِ نبوی میں پلاسٹک سرجری کے واقعات نہایت مستند حوالوں کے ساتھ بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

اس مقالہ میں ایسے حیرت انگیز واقعات و حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ملک و بیرون ملک کے بڑے بڑے ممتاز اہل علم و محققین نے اس مقالے کو غیر معمولی طور پر سراہا ہے، یہ مقالہ اولاً برطان میں قسط وار شائع ہوا تھا اب پہلی بار کتابی شکل میں منظر عام پر آیا ہے۔

اعلیٰ معیاری عکس طباعت، ریگزین کی خوبصورت جلد

قیمت چالیس روپے

عمید الرحمن عثمانی

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

تبصرہ

نام کتاب : قوموں کا کردار

مصنف : ڈاکٹر احسان اللہ خاں

صفحات : ۱۳۴

طباعت : فوٹو لیتھو ورس دہلی

تبصرہ نگار : محمد سعید الرحمن شمس

ڈاکٹر احسان اللہ خاں ملک کے ایک معروف اسکالر اور مشہور مصنف ہیں جن کی چھوٹی بڑی دو درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو کوشش یہی کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ اس لئے کہ موضوع تصویر کے دونوں (مثبت و منفی) پہلوؤں کو اپنی دقت نظر، وسیع معلومات اور علمی زرف نگاہی سے پوری طرح اجاگر کر کے خاطر خواہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ”قوموں کا کردار“ جو اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن بقول ڈاکٹر صاحب انھوں نے سائنٹیفک انداز میں قوموں کے کردار کا محاسبہ کر کے جو مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے اس سے فکر و نظر کے کئی دروازے فابہوتے ہیں۔ زبان و بیان عام فہم اور سادہ ہے۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود معلومات انرا اوٹ کرانگیر ہے۔

”قوموں کا کردار“ اگرچہ یہ موضوع انتہائی اہم، علمی، تاریخی اور تحقیقی ہے اور اس عنوان پر متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں تاہم جو لوگ جدید رجحانات اور تقاضوں کے پیش نظر اس موضوع پر کام کرنا چاہیں انہیں ڈاکٹر احسان اللہ کی یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

(محمد سعید الرحمن شمس)

دینی مدارس متوجہ ہوں

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت — تالیف مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی صفحات (۳۶۸) جو مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن پر جامع و مکمل تبصرہ ہے۔ ہندوستان کے بڑے دینی مدارس کے لئے بطور عطیہ جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد و اخوانہ کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ دینی مدارس حسب ذیل پتہ سے رجوع کریں۔

۱۸۳۸، شیخ چاند، لال کنواں دہلی

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

لمصنفین دینی کا علمی و دینی مآبنا

برکات

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زمان حسینی

مرتب

عمید الرحمن عثمانی

مدیر اعزازی

قاضی اطہر مبارکپوری

مُصَنَّفَاتُ الْمَصْنُفَاتِ

- ١٩٣٩ -
- ١٩٤٠ -
- ١٩٤١ -
- ١٩٤٢ -
- ١٩٤٣ -
- ١٩٤٤ -
- ١٩٤٥ -
- ١٩٤٦ -
- ١٩٤٧ -
- ١٩٤٨ -
- ١٩٤٩ -
- ١٩٥٠ -
- ١٩٥١ -
- ١٩٥٢ -
- ١٩٥٣ -
- ١٩٥٤ -
- ١٩٥٥ -
- ١٩٥٦ -
- ١٩٥٧ -
- ١٩٥٨ -
- ١٩٥٩ -
- ١٩٦٠ -
- ١٩٦١ -
- ١٩٦٢ -
- ١٩٦٣ -
- ١٩٦٤ -
- ١٩٦٥ -
- ١٩٦٦ -
- ١٩٦٧ -
- ١٩٦٨ -
- ١٩٦٩ -
- ١٩٧٠ -
- ١٩٧١ -
- ١٩٧٢ -
- ١٩٧٣ -
- ١٩٧٤ -
- ١٩٧٥ -
- ١٩٧٦ -
- ١٩٧٧ -
- ١٩٧٨ -
- ١٩٧٩ -
- ١٩٨٠ -
- ١٩٨١ -
- ١٩٨٢ -
- ١٩٨٣ -
- ١٩٨٤ -
- ١٩٨٥ -
- ١٩٨٦ -
- ١٩٨٧ -
- ١٩٨٨ -
- ١٩٨٩ -
- ١٩٩٠ -
- ١٩٩١ -
- ١٩٩٢ -
- ١٩٩٣ -
- ١٩٩٤ -
- ١٩٩٥ -
- ١٩٩٦ -
- ١٩٩٧ -
- ١٩٩٨ -
- ١٩٩٩ -
- ٢٠٠٠ -
- ٢٠٠١ -
- ٢٠٠٢ -
- ٢٠٠٣ -
- ٢٠٠٤ -
- ٢٠٠٥ -
- ٢٠٠٦ -
- ٢٠٠٧ -
- ٢٠٠٨ -
- ٢٠٠٩ -
- ٢٠١٠ -
- ٢٠١١ -
- ٢٠١٢ -
- ٢٠١٣ -
- ٢٠١٤ -
- ٢٠١٥ -
- ٢٠١٦ -
- ٢٠١٧ -
- ٢٠١٨ -
- ٢٠١٩ -
- ٢٠٢٠ -
- ٢٠٢١ -
- ٢٠٢٢ -
- ٢٠٢٣ -
- ٢٠٢٤ -
- ٢٠٢٥ -
- ٢٠٢٦ -
- ٢٠٢٧ -
- ٢٠٢٨ -
- ٢٠٢٩ -
- ٢٠٣٠ -

مجموعہ

جلد ۱۰۲ | بیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق نومبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۶

- ۱۔ نظرات
محمد حسین ہیکل
- ۲۔ عید الرحمن عثمانی
جناب محمد صلاح الدین عمری
- ۳۔ طبقات الصوفیہ
اسپی تحریروں کے آئینے میں
- ۴۔ تذراتہ عقیدت
محسور مفتی عتیق الرحمن عثمانی
- ۵۔ قرآن کریم میں تراوت (۳)
مدیر نصرۃ الاسلام کٹھیر
- ۶۔ تبصرے
جناب ڈاکٹر احسان اللہ
- ۷۔ ترجمہ: محمد رفیع الاسلام ندوی
جناب کمال جعفری، آل انڈیا سٹیج
- ۸۔ نئی دہلی
جناب ڈاکٹر احسان اللہ
- ۹۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
شہید عری پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ
- ۱۰۔ جناب عبدالرشید صاحب
شہید عری پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ
- ۱۱۔ جناب محمد سعید الرحمن شمس
ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی
- ۱۲۔ جناب کمال جعفری، آل انڈیا سٹیج
نئی دہلی
- ۱۳۔ جناب ڈاکٹر احسان اللہ
نئی دہلی

عید الرحمن عثمانی پرنٹس پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپو کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

اسلام ہی دنیا، تنہا اور آخری مذہب ہے جس کی تمام تر بنیادی تعلیمات ایک اٹل اور دائمی نظام اخلاق پر استوار کی گئی ہیں۔ جس میں مغرب کی افادیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ غیر دوسرے کا ایک رن اور ایسی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے دلچسپی نہ رکھتا۔ تبدیلیوں، اور مصلحت و وقت کے تقاضوں سے اس کے بنیادی اصول اخلاق کو ہرگز ٹوڑا نہیں جاسکتا۔ الیٰ نبیادی اصول کو چھوڑ کر اسلام کے جہد قوانین تمدن و معاشرت زمانہ و وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جلتے جو اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔ یا شریعت اسلامی کی روح اس کے مقاصد، اور اسلامی زندگی کے نصب العین کا ساتھ نہ دیتی ہو۔ بنیادی اصولوں اور عقائد کا یہ شبہات و استہکام اور ان کا اس طرح ناقابل تغیر ہونا ایک بہت بڑا تحفظ اور ضمانت ہے جس کی نظیر دوسرے مذاہب و ادیان میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ درہنہ آج جس طرح مغربی ذہن و فکر نے اپنے وقتی اور ذاتی انفرادی مقاصد کے تحت ہر اخلاقی اصول اور اور مہابطہ کو توڑ ڈالا ہے۔ یہی حال خدا کو اسسٹہ اسلامی اصول و مقاصد کا ہونا۔ اس کے بنیادی عقائد اور شریعت اسلامی کے اخلاقی اصولوں میں مساوی خود غرضیوں اور کام جوتیوں کے، اثرات راہ نہیں پاسکتے۔

جہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جاتی ہے کہ اسلام کا اخلاقی، عقل، فکر

کی ترجیحی کا دشمن نہیں ہے بلکہ وہ فکر و عقل کی بے قید آزادی کا سب سے بڑا مخالف ہے وہ عقل کو معطل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسے انسانی اور اخلاقی اصولوں کا تابع بناتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی عقل کو یہ حق نہیں دیا جاتے گا کہ وہ شریعت کے بنیادی مقاصد اور اسلامی زندگی کے مجموعی نصب العین میں کوئی تبدیلی کر سکے اور نہ اسے یہ حق پہونچتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو مختلف شعبے کے لئے زندگی کے جوہر بات دیتے ہیں اور جو اصول ان کے لئے وضع کئے گئے ہیں ان میں دخل اندازی کرے۔ ہاں اسے یہ آزادی ضرور عطا کی گئی ہے کہ وہ تفصیلی امور اور ذیلی قوانین پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ شریعت کے مقاصد سے متصادم تو نہیں ہوتے ہیں عقل کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں اسلامی قوانین (فقہ اسلامی) اگر اسلاف مذاہد کا اصول کا بہت مطابقت نہ رکھتے ہوں تو ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ بخوبی کرے۔ اسلامی زندگی میں عقل و فکر کا مرتبہ یہ ہے کہ جب حوادث کے طوفان اور عذاب کی آہندہ ہر سال زمانہ میں نئے باپ کا اضافہ کریں۔ نئے نئے حالات رونما ہوں، قدم قدم پر معاشرت و تمدن درہم برہم ہو جائے اور زندگی کو نئے مسائل و مشکلات سامنا ہو تو وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان مطالبوں کو پورا کرے اور زمانے کے چیلنج کا جواب دے۔ اسلامی زندگی کے لئے نئے قوانین اپنی ذاتی بصیرت اور فکر و عقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرآن و حدیث، کی عطا کی ہوئی روشنی میں وضع کرے۔ اس طرح گویا اسلام نے عقلی ارتقاء اور انسانی فکر و ذہن کے پروردگار پروردگار بھی متعین کر دی ہے لیکن عملی ارتقاء میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی ہے۔

اسلام میں اخلاق کا دائرہ اثر اور احاطہ کار محدود نہیں ہے اس وجہ سے مسکن انسانیت رحمۃ اللعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و

غایت اور عہد و مقصد اور اخلاق و علیا کی اہم اور مکمل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے آپ کی نبوت صحن اصلاح معاشرت اور تطہیر مہمان کے لئے نہیں بلکہ عالم گیر پیمانے پر اصلاح عقائد و اعمال تشکیل تہذیب، تعمیر تمدن اور مسکن کی انسانی قدروں کے فروغ کے لئے بھی ہے۔ آپ صرف انفرادی معاملات کی اصلاح کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے تھے بلکہ تمام اجتماعی معاملات کو سنوارنا، درست کرنا، بڑھانا بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھے۔ اس لئے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت ہے ایک تحریک ہے، ایک پیغام ہے، ایک انقلاب ہے جو انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں پر محیط ہے۔

آپ کی عالم گیر دعوت، دو تعلقانی پیغام اور آفاقی تعلیمات زندگی کے کسی خاص پہلو کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر شعبہ کے لئے اپنی مستقل ہدایات واضح پالیسیاں، صاف ستھرا موقف، اصلاحی تدابیر اور فکری نظریات رکھتا ہے۔ اس کا ایک مخصوص نظام تہذیب و تمدن، ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست و حکومت ہے۔ اس نے زندگی کے معاشی اور اقتصادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کو مناسب اہمیت دی ہے۔ زندگی کے اور گوشوں کو جس طرح اس نے یہاں بھی واضح احوال و ہدایات دیتے ہیں۔ اس نے خارجی نظامات باطنی محرکات پر بھی یکساں توجہ صرف کی ہے اور ایک دوسرے کے مابین گہرا ربط اور تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت کا مفہوم صرف روزہ اور نماز ہی نہیں بلکہ ہر وہ عمل عبادت شمار کیا جاتا ہے جو اس کے وضع کردہ اصولوں اور ہدایات کے مطابق ہوں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی کے معاملات سے اس کا تعلق ہو۔ اسی لئے دین اسلام ایک اصول عمل، ایک رابطہ اخلاق، عقائد کا ایک مجموعہ، تمدن کا

ایک نظام، حکومت کا ایک تصور اور معاشرت کا ایک نظریہ ہی بلکہ وہ فکر کا ایک صحیح ترین اصول اور عقل کے ارتقاء کا سب سے سیدھا راستہ، بہ صراط مستقیم (RAIGHT PATH) بھی ہے فکر کی سلامت روی اور عقل کی راستی جو کچھ، جہاں کہیں اور جتنی کچھ ہے وہ سب اس میں اور اسی سے ہے دنیا کے اور تمام فلسفہائے نظام، انسانی ذہن کے تراشیدہ خود ساختہ نظریے اور، ازم، اور عقل کی تمام راہیں انسانی کو بالیقین منزل مقصود سے بھٹکانے والی اور اجتماعی زندگی کے لئے ہلاکت خیز ہیں۔

اخلاق دین اسلام کی ایک جامع اور مکمل اصطلاح ہے اسی سے مراد محض خوش روئی، خوش کلامی اور خند و پیشانی ہی نہیں بلکہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسانی زندگی کی پوری تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خلق شخصیت انسانی کا آئینہ جو کہ خود سے اجتماع اور ذات سے معاشرے تک اس کا نفوذ و اثر ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا مفید اور قابل ذکر پہلو نہیں جو اخلاق کے زمرے میں شامل نہ ہو، اچھے بیٹھے، چلنے پھرنے، کھاتے پینے، اور بھونچھونے سے لے کر اہم ترین مسائل حیات اور امور نظم مملکت سبھی کچھ اس اخلاق کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہادی عالم نبی آخر الزماں حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العالمین نے، خلق عظیم کا طرۃ امتیاز دے کر منصب جلیل پر فائز فرمایا ہے۔ حکمت خلق کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے فروع میں وسعت و تنبیہ اور عادات، خصائل، افعال اور کردار میں رفعت و غرور بلکہ اتم پائی جاتی ہے۔ آپ جو شکمہ رحمت میں اس لئے پروردگار عالم نے آپ کو دنیا میں حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار کا عظیم ترین معیار قائم کرنے کے لئے مبعوث فرمایا تھا، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے محض فکری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر (CALLY) (PRACT.) حکمت خلق کا عظیم معیار قائم فرمایا اور بلاشبہ اس میں آپ طرح کا سیاق و سبب جس کے نقوش و اثرات ہر وہ صدیاں گزر جانے کے باوجود

آج بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔

دور حاضر میں، امت وسط، کاسنی انحطاط جس حد تک پہنچ چکا ہے اور مجموعی طور پر ہم جس انحطاط اور بستی کے دور سے گزر رہے ہیں یہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے لیکن اس کے اسباب باہر نہیں بلکہ ہمارے اندر ہیں۔ ہم اپنے گمراہی میں جھانک کر دیکھیں۔ اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لیں، تو معلوم ہوگا کہ ہمارے زوال کا عمل خود ہمارے اپنے ہی اعمال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسلام نے عزت و سر بلندی اور قیادت و وقار کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنے کا جو ہمیں گرسکھایا تھا افسوس اسے ہم نے فراموش کر دیا، اور شعوری و غیر شعوری طور ان راہوں پر ہی چل پڑے جو بظاہر ہیں تو پرکشش، لیکن وہ زوال پذیر قوموں کی گزر گاہوں ہیں۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مثال اخلاقی پہلو اور آپ کا بے داغ کردار ہمارے لئے نئے حالات، ماحول اور فتنے ہیں یہی پیغام رکھتا ہے۔ اور وقت کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں، ایمان و یقین کی بے چارہ اور لازوال دولت کے ساتھ اپنے اجماع اور ملی کردار میں مثبت اور نمایاں تبدیلی پیدا کریں، اور زندگی کی شاہ راہ میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم سمجھیں۔

شکر

قبل جیل مہدتی مرتبہ برہان کے وصال کے بعد دو تین ماہ تک برہان کے نظرات ملک کے معروف صحافی اور کہنہ مشوق اہل قلم محترم ظہیر صدیقی لکھتے رہے جس کے لئے ادارہ موصوف کا بے حد شکر گزار ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی صدیقی صاحب اپنے گرانقدر مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں گے۔

اپیل

قارئین کرام! وہمہدائیانِ ملت! ادارۃ مدوۃ المتفقین اکابر
 و بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم
 کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی ناخوشگوار
 حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی ٹھوس، مثبت
 و تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آ رہا ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔

لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا
 و ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین
 میں اور ہی خواہ حضراتِ اولین فرست میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دورگراں بازاری میں ایسے ادالے
 برسی مستقل فنڈ کے قیام کے بہرگز نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب

استثنائی جانفشانی، ذاتی محنت اور مہم سے سزا کا لٹکا چلائے ہوئے ہے اور اس کا تحقیقی و علمی معیار برقیوت پر مبنی رکھا۔ اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ کسی منصوبے جو تشنہ تکمیل اور کئی اہم مطلوبہ حالت جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بے ہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سطر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلا یا ہے اور ہم ہمیشہ ہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔ امید ہے کہ اگر باب خیر اللہ بھی خواہاں ہو تو ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! — چیک، ڈرافٹ یا مئی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیے جائیں گے۔

منبر ندوۃ المصنفین

اردو بازار، دہلی

محمد حسین مہر کی اپنی تحریروں کے آئینہ میں

جناب محمد صلاح الدین عمری، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جدید مصری ادب۔ جس کو دنیا نے عرب کے تمام آداب پر فوقیت حاصل ہے، اور جس نے قدیم و جدید عربی فکر و فلسفہ کا حسین امتزاج پیش کر کے ادب و فن کو ارتقائی مراحل سے ہم کنار کرے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ کا مطالعہ بڑا متنوع اور دلچسپ ہے۔ علم و ادب اور فکر و فن کو برتنے میں سرزمین مصر کو ہمیشہ سے ہی قیادت حاصل رہی ہے۔ یہ مصر ہی تو تھا جس کی قدیم عربی یونیورسٹی جامع ازہر نے مدتوں عالم اسلام کے مسائل کو حل کرنے اور برطانوی تسلط نیز اس سے قبل مسلمانوں کی بھنور میں پھنسی کشتی کو پار لگانے کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔ اسی سرزمین مصر کو تو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے عظیم مجددین اور مصلحین کی شخصیت سازی کی، اسی مصر نے تو جمال الدین الافغانی کے لئے اپنے بازو واکے اور ان کی اصلاحی دعوت کو اپنے یہاں پھیلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے تھے۔ اسی مصر نے تو شیخ محمد عبدہ کے اجتماعی، تعلیمی اور اصلاحی نظریات کی اشاعت کے لئے راہیں ہموار کیں۔ اسی کی آغوش میں تو شیخ رشید رضا نے پناہ لی تھی۔ اسی مصر کی آنکھوں کا تارا انقلابی لیدر

مصطفیٰ کامل تھا اور اسی منہ کا جگر گوشہ تو انقلاب مصر کا بیباک قائد سعد
زغلول تھا، اس کی کوکھ سے تو لطفی السید نے جنم لیا تھا۔ اسی مردم خیز
سرزمین کی تو پروردہ ناقد ادیب ڈاکٹر طہ حسین، عظیم عالم ڈاکٹر احمد امین،
فلسفی ناقد استاد محمود العقاد کی گونا گوں شخصیتیں تھیں۔ اس خطہ ارض کے
جمال و رعنائی کے نغمہ حافظ ابراہیم نے گائے تھے۔ اسی کج حسن کے نقوش نے
تو احمد شوقی کے قصائد کی نوک پلک سنواری تھی۔ اسی سرزمین میں پہلے والے
دریائے نیل کی عظمت اور اس کی قدیم تہذیب و تمدن کے راگ ہیکل نے
الاپے ہیں۔ وہی ہیکل جن کو جدید عربی ادب میں پہلے فنی ناول کی تخلیق کا شرف
حاصل ہے۔ اسی مصر کے چند سر پیرے نوجوانوں نے اگر ایک طرف مشرقی قومیت
کی آواز لگائی تو دوسری طرف اس کے فرزندانِ توحید نے، اسلام کی عطا کردہ
حضارتِ سلیم کو اپنانے کی دعوت دی۔ اسی سرزمین کے چند ہیالوں نے کمر بستہ
ہو کر، اسلام اور اسلامی حضارت سے محبت و عشق کے بیج بوئے اور
اسلامی اخوت و مودت کے پر لطف نغمے چھڑے۔ پھر، چراغ سے چراغ
جلے اور کارواں بنتا گیا۔ اخوان المسلمون، جماعۃ شباب محمد اور
جماعۃ الشبان المسلمین کی طاقت ابھری۔

اسی مصر نے تو عربی زبان کے ارتقاء اور فنون ادبیہ و نقدیہ کی ترویج و
اشاعت میں عملی حصہ لیا اور تعلیم و تدریس کی سطح کو بلند کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔
اسی سرزمین کی حضارت نے کھلے دل سے مغربی حضارت و تمدن کو اپنے یہاں
پھلنے پھولنے اور سیننے کے بھرپور مواقع فراہم کئے تاکہ قدیم و جدید تہذیبوں کا
ایک حسین آمیزہ تیار ہو کر مصری قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں معاون
ثابت ہو۔

مصر ہی کے ایک فرزند محمد حسین ہیکل کی بندید عربی ادب کا اجمالی جائزہ ہماری اس بحث کا موضوع ہے۔ جی ہاں! وہی ہیکل جس کی شخصیت عرب دنیا میں سب سے پہلے ناول نگار کی حیثیت سے معروف ہے۔ جو انسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں عربی ادب کے پہلے معلم شمار کئے جاتے ہیں، جن کو عربی ادب و تنقید میں بھی ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ ہیکل ہی تو ہیں جنہوں نے 'حیاء محمد' پیش کر کے، اسلام دشمن مستشرقین کے بے بنیاد الزامات کا خالص تحقیقی اسلوب میں جواب دیا ہے۔ انہیں نے تو اسلامی سلطنت کو ایسی حضارت کے روپ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن عالم کی ضمانت دیتی ہے۔ اسی طرح ان کو ادبی، سیاسی اور تنقیدی مقالات نیز صحافتی مقالے کو فنی انداز میں پیش کرنے کا بھی خاص ملکہ حاصل ہے۔ سیرت و تراجم ادبیہ میں بھی ان کا تنوع ان کی فکری ارتقار کا غماز ہے۔ دل کو چھولینے والی ہر بات اور ذہن کو جھنجھوڑنے والا ہر احساس، ان کے یہاں الفاظ کا جامہ پہن کر قاری کو دم بخود کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک طویل عرصہ تک ایک مخلص اور خوددار سیاسی قائد اور مفکر کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے اور ساری زندگی، مصر میں نیا بنی حکومت اور آزادی کی تلاش میں سرگرم رہے۔ وہ سیاستدان، ادیب، ناقد، ناول نگار اور صحافی سب ہی کچھ تھے مگر اس سے بڑھ کر وہ غیور، خوددار اور حریت کے دلدادہ انسان تھے۔ حریت رائے اور حریت قلم ان کی سب سے بڑی دولت جس سے وہ کسی قیمت پر بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔

ادبی اور اجتماعی ارتقار کی کہانی، سیاسی حالات کے نشیب و فراز کے پس منظر میں ہی چھپی ہوتی ہے، لہذا کسی ادیب یا فنکار کا مطالعہ، اس وقت کے سیاسی

سماجی اور تمدنی حالات کے پس منظر میں ہی کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ عمل کا ٹکراؤ جب رد عمل سے وقوع پذیر ہوتا ہے تو لاتعداد منفی پہلوؤں کے سامنے آنے کے باوجود چپکے سے رونما ہو جانے والے مثبت پہلوؤں کی تلاش بھی ایک جگر سوز لیکن دلچسپ مشغلہ ہے۔ اور یہی مثبت پہلو ادب و فن اور فکر و فلسفہ کے ارتقاء کی گہرائی سناتے ہیں۔ مصر میں عمل اور رد عمل کا کچھ ایسا ہی تصادم اس وقت رونما ہوا جب عثمانی حکومت کے زیر نگین مدت سے چلے آ رہے ملک پر ۱۷۹۸ء میں نیپولین نے اپنا جھنڈا گاڑ کر باشندگانِ مصر کو بوکھلا دیا۔ اس اچانک تسلط کے رد عمل نے، مصر پر حکومت کرنے کے، فرانسیسیوں کے خوابوں کو چکنا چور ضرور کر دیا، لیکن یہ فرانسیسی سیلاب جاتے جاتے اپنے کچھ ایسے اثرات چھوڑ گیا جن سے مصریوں کو لاشعوری طور پر مستفید ہونا ہی پڑا۔ فرانسیسی حملہ، مصر میں تمدنی اور علمی ترقی کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ یہ فرانسیسی اپنے ساتھ نہذیب و تمدن اور علم و ادب کا جو اثاثہ لائے تھے، اس کے اثرات کا نتیجہ ہی تھا کہ مصر میں محمد علی پاشا کے ہاتھ میں زمام حکومت آتے ہی عام اصلاحات، قوم کی سیاسی سطح کو بلند کرنے اور ان میں علمی شعور پیدا کرنے کی غرض سے ایسے قوانین کا نفاذ کرایا گیا جن کے نقوش پر ہی مصر میں سیاسی، علمی اور ادبی ارتقاء کی راہیں ہمارے پیش ہیں۔ اسی نیپولین کے حملہ کے نتیجہ میں غالباً باشندگانِ مصر کو قومیت کا احساس ہوا۔ جس نے بعد کے ادوار میں کہیں فوجی انقلاب کا روپ دھارا، تو کہیں عوامی انقلاب کی تخم ریزی کی، لیکن چونکہ ابھی مصریوں کے سیاسی شعور میں

۱۔ دیکھئے: سوقی: فی الأدب الحديث ص ۱۲ تا ۱۴۔

۲۔ محمد فی: تاریخ مصر الاقتصادی ص ۵۷ تا ۶۸۔

وہ بچنگی نہیں آئی تھی جو اقوام کو اپنا راستہ خود متعین کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور خود اپنے تحفظ کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے، لہذا کچھ ذہن کی ناعاقبت اندیشیوں کا احساس کر کے، انگریزوں نے مصر کو لقمہ تر سمجھ کر اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور جلد ہی مصر انگریزوں کی استعماریت کے شکنجہ میں کستا چلا گیا۔ لیکن، تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت نے ظلم و عدوان پر کبھی اطمینان کی سانس نہیں لی، بلکہ اسے ہمیشہ ظلم و زیادتی کی کرخت آوازوں کے پس پردہ قومیت کی للکار سنائی دیتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں غیر ملکی تسلط پر، وہاں کے باشندوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی چین کی سانس نہیں لی، بلکہ جوں جوں استعماریت کی جکڑ بندیاں سخت ہوتی گئیں، وطنیت کا شعور بڑھتا گیا۔ اسی استعماریت کی ظلم و تعدی کا ثمرہ تھا کہ وہاں جلد ہی قومی لیڈر ابھر کر سامنے آئے جنہوں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے عوام کو نجات دلانے اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کی انتھک جدوجہد شروع کر دی۔ حزب الوطنی، حزب الوند، حزب الامۃ اور حزب الاحرار الدستوریین، اور کتنی ہی سیاسی و سماجی جماعتوں نے اس استعماری تسلط کو مزید برداشت نہ کرنے کے عزم کا اعلان کر کے، ہنگامے شروع کر دیئے، ملک کے طول و عرض میں مظاہرے ہونے لگے، آگ و خون کی ہولی کھیلی جانے لگی، اور مصری بچہ بچہ مصری شخص کے تحفظ کا عزم لے کر سینہ سپر ہو گیا۔ آخر کار ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہو گیا اور اس طرح مصر

۱۔ ملاحظہ ہو، محمد مصطفیٰ صفوت: مصر المعاصرة ص ۷۸۔

۲۔ عبداللطیف حمزہ: الصحافة المصرية فی مائۃ عامہ ص ۸۱۔

۳۔ ہیکل: مذکرات ج ۲ ص ۳۷۹-۳۸۲

میں ایک طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد آزادی کا پرچم لہرایا۔
سیاسی انقلابات اور تبدیلیاں، علم و ادب کی ترقی و تنزلی کی ضامن
ہوتی ہیں۔ اور غیر ملکیوں سے سیاسی و ثقافتی روابط، علم و ادب کا لین دین
اور خیالات و انکارات کا تبادلہ، ذہنی وسعت اور ثقافتی ترقی کا وسیلہ ہوتا
ہے۔ چنانچہ غیر ملکی ثقافت اور ان کے اصول و تمدن سے واقفیت نے مصر کو
مغربی تہذیب و تمدن کے معائب و محاسن سے روشناس کرایا، جس نے وہاں کے
علمی و ادبی افق کو اگر ایک طرف وسعت دلایا اور پہنائیوں سے آشنا کیا تو دوسری طرف
ہم کو، مصری ادب و فن کا اس جدید تہذیب و تمدن سے شناسائی کے نتیجہ میں،
ادب و فن میں آہستہ سے در آنے والی کشمکش اور اضطراب کا احساس بھی
ہوتا ہے جو مغربی تہذیب کی چکا چوند کرنے والی تیز روشنی کے پس پردہ تہ بہ تہ
تاریکیوں کا خاصہ ہے۔ پھر، اگر ایک طرف مصری ادب بار اور مفکرین نے عربی زبان
ادب کے دامن کو جدید اصلاحات اور سائنسی و ثقافتی تعبیرات سے مالا مال کرنے
میں اپنی زبان دانی کی قوتیں صرف کی ہیں تو دوسری طرف ہم کو جمال الدین الافغانی
اور شیخ محمد عبیدہ جیسے مصلحین مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے مذہبی اصلاح
دین کو فرسودہ رسوم و رواج اور زلیعنی ادہام و خرافات سے پاک کرنے اور نوجوان
نسل کو — جو مغربی تہذیب پر فریفتہ ہو کر دین و مذہب سے بیزار نظر آ رہی
تھی — دین کی اصل روح سے آشنا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان مصلحین نے
اسلامی ثقافت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ میں اسلامی فکر و شعور کو

۱۔ ملاحظہ ہو تشاد لر آدس : الاسلام و التجدید فی مصر ص ۱۷-۱۸

و گب الاتجاہات الحدیثہ فی الاسلام ص ۶۸-۶۹۔

بیدار کر کے ان کی علمی و شعوری سطح کو بلند کرنے کی جدوجہد کو ہی اپنا مطلق نظر بنالیا تھا۔ پھر ہماری توجہ مصری یونیورسٹی کے قیام اور اس کے پس پردہ، قوم کی جدید تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے بلند مقصد پر بھی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قدیم اہیات الکتاب کی دوبارہ اشاعت، تالیف و ترجمہ کے لئے کمیٹیوں کا قیام، کرم خوردہ مخطوطات کے احیاء کی جدوجہد، جراند و رسائل کا اجراء اور ان کا، مصر میں ادب و علم کی ایک بڑی تعداد کی ذہنی تربیت کا سنجیدہ عمل، قاسم امین کی تحریک حریت نسوان کا مصری ماحول پر گہرا اثر، اور پھر قوم کا جدید تہذیب و تمدن کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں گم ہو کر، اسلامی و عربی تشخص سے آہستہ آہستہ دست بردار ہو جانے کے خطرناک نتائج کا احساس کر کے چند سر پھرے خدا پرستوں کا سونہل اور مصری قوم کو ورطہ بھلاکت سے باہر نکالنے کی پر عزم کوششیں، اور جدید مصری تاریخ کے سوز و ساز کے مطالعہ سے اس قدیم اضطراب و کشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جو حق و باطل کے درمیان ازل سے ہی نوشتہ ہے۔ فریاد کی راہ خوشنما، لذت آشنا اور عیش و طرب کے بے شمار احساسات سے مزین ہے، لیکن اس راہ کی منزل بہر حال بھلاکت، تباہی، ذہنی گھٹن اور اذلی اضطراب پر ختم ہوتی ہے۔ اور حق کی راہ غمخیزوں کی دھوپ میں جھلساتی ہوئی، سنگ باریوں کے خطرات سے الجھتی اور لغز افشانیوں سے لہو لہان ہوتی ہوئی، آلام و مصائب سے گھری اور

۱۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۵۲-۵۳۔

۲۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۶۱-۶۲۔

۳۔ دیکھئے : نشار لڑ آدمس : الاسلام والتجدید فی مصر ص ۲۳۳۔

سنگارِ راستوں کے نشیب و فراز سے پُر ہے، لیکن اس راہ کا اختتام ہر حال سرخ روئی، ذہنی سکون اور ابدی طمانیت کی منزل پر ہوتا ہے۔

ہیکل ۲ اگست ۱۸۸۸ء کو کفر غلام نامی بستی میں حسین آفندی سالم ہیکل کے گھر پیدا ہوئے۔ مختلف مدارس میں ابتدائی اور پھر ثانوی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۰۵ء میں لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۰۹ء میں قانون کی ڈگری لینے کے بعد فرانس چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ۱۹۱۲ء میں دین مصر العام کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ گویا ڈاکٹر محمد حسین ہیکل پہلے مصری ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی۔

ہیکل کی ادبی زندگی کا آغاز، لطفی السید کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات سے تاثر کا نتیجہ تھا۔ لطفی السید نے ہی ہیکل کو ادبی اور اجتماعی موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی اور ہمہ وقت ان کی ہمت افزائی کرتے رہے۔ اس کے بعد جب ہیکل فرانسیسی ادب و ثقافت خصوصاً Hippolyte Taine کے

۱۔ مقالہ، ڈاکٹر حسین فوزی النجار (الدكتور محمد حسين هیکل اعداد لطفی السید) ص ۵۔

۲۔ ہیکل: مذکرات فی السیاسة المصریة ج ۱ ص ۲۲، دسوقی ضیف: الاصل العربی المعاصر فی مصر، ص ۲۷۰۔

۳۔ Antonie Wessils: A modern Arabic Biography of Mohammad P 35

۴۔ حسین فوزی النجار ص ۱۴۔

۵۔ ہیکل: مذکرات ج ۱ ص ۳۔

ادبی و تنقیدی افکار سے متاثر ہوئے، تو عربی و فرانسیسی ثقافت کے امتزاج سے جو شکل بنتی ہے، وہ ہیکل کی تحریروں کی جلالت میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ فرانس سے واپس آنے کے بعد ہیکل نے اگرچہ وکالت کا پیشہ شروع کر دیا تھا، لیکن مستقبل کا ہیکل ابتداء ہی سے ان کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وکالت کی مشغولیت کے باوجود وہ سیاست، ادب و نقد اور اجتماعی موضوعات پر قلم اٹھاتے رہے حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا کہ ہیکل نے وکالت کا پیشہ ترک کر کے صحافت کو اوڑھنا بچھونا بتالیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 'السیاسة' کی ایڈیٹر شپ سے ہوتا ہے۔ جو حزب الاحرار کا روزنامہ اخبار تھا۔ پھر چند سال بعد انہوں نے ایک ہفتہ وار ادبی میگزین 'السیاسة الاسبوعية' نکالنا شروع کیا۔ جس نے جلد ہی اس وقت کے ادبی و تنقیدی رجحانات اور جدید فکر و شعور کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر لی۔ ایک طویل عرصہ تک صحافت سے منسلک رہنے کے بعد جب انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا تو کئی بار وزارت تعلیم کا قلمدان ان کے سپرد کیا گیا۔ پھر، اس کے بعد رئیس مجلس الشیوخ کے معزز عہدہ پر بھی کئی بار سرفراز ہوئے۔ ان کی صحافتی و سیاسی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی حریت فکر اور آزاد رائے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ یہ ہی تو ان کا طرز امتیاز ہے جو ان کو بہت عزیز ہے۔ تقلید اور دوسروں کے نقش قدم پر چل پڑنا یا مادی مقصد

۱۔ ہیکل: تراجم مصریہ و غریبہ ص ۲۴۷۔

۲۔ حسن فوزی النجار، حواہ سابق ص ۸۔

۳۔ Antonie vessels: opscat p36

۴۔ ہیکل: مذکرات ج ۲ ص ۸۹ و ص ۱۰۰۔

کے حصول کی خاطر ہاں میں ہاں ملانے والے توبے تلاش کئے، قدم قدم پر چلتے ہیں
لیکن حریت رائے اور آزادی فکر کو برتنے کے لئے نہ صرف اپنے ہر ذاتی مقصد
کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے، بلکہ قدم قدم پر مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ
بھی اس راہ کو اپنانے کا لازمی جزو ہے۔ حریت فکر کی راہ بظاہر بڑی پرخطر اور
دشوار گزار نظر آتی ہے اور اس کے راہی کو اس راہ کے انتخاب کا حساب
کرب و اذیت اور طویل تر تنہائی کے احساسات سے چکانا پڑتا ہے لیکن کارِ ابراہیم
میں یہی اپنوں کے ستائے ہوئے، تنہائی کے احساس تلے دیے کرب مندہ چند نفوس
اپنا مقام بنانے میں بالآخر کامیابی کی منزل سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور ذاتی اغراض
مقاصد کے پرستار اور فرسودہ تقلید کے بندے، اپنے ہی جیسے بے شمار انسانوں
کے سیلاب میں بہتے بہتے نہ صرف اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ان کی یادوں کے
نقوش بھی نقشِ بر آب سے زیادہ دیر پا نہیں ہوتے۔ ہیکل کا شمار بھی ان چند
خوش نصیب نفوس میں کیا جاسکتا ہے، جس نے حریت فکر کا کبھی کوئی سودا
نہیں کیا، اور تقلید کی سہل انگیزی سے منہ موڑ کر، اپنی راہ خود بنانے کی صعوبتیں
بھیانے ہی میں سکون و طمانیت کے پہلو تلاش کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
پر عزم کوشش میں انہوں نے لغزشیں بھی کھائی ہیں، اور کبھی غلط راہوں پر بھی چلے
لیکن بالآخر حق کی تلاش کے جذبہ صادق نے ان کو جس منزل پر پہنچایا وہ بھی منزلِ حق
امن و سکون کی علامت اور صالح فکر و حرارت کی ضامن ہے۔

سیاسی و صحافتی مصروفیات کے باوجود، خوب سے خوب تر کی تلاش ان
کو لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرتی رہی اور وہ، کبھی 'زینب' لکھ کر اپنے اندرونی کرب

اور فرسودہ تقلید کے خلاف اپنے احساسات کو صفحہ نظر خاص پر اتارتے ہیں، تو کبھی عظیم مصری شخصیات اور مغربی مفکرین سے اپنے دل کے رشتے جوڑ کر مصریوں کو اپنے فکر سے آشنا کرتے ہیں۔ فرانسیسی اصول تنقید اور حضارت تمدن کے قوانین کا موازنہ مصری اور عربی ادب نقد سے کرتے ہیں تو زبردست مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ اپنے مقالات و مضامین میں ادب و نقد کے مسائل چھیڑ کر جدید اصول نقد اور خالص تحقیقی اسلوب کو اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبویؐ کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے مخصوص تحقیقی، علمی اور ادبی اسلوب میں ایسے نادر نو نے پیش کرتے ہیں کہ خود ہی اپنی تحقیق پر رشک آ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیات محمدؐ میں انھوں نے بعض ایسے پہلوؤں پر تاریخی بحث کی ہے جو مستشرقین کا ہدفِ طاعت بنے ہوئے تھے۔ اس تالیف کی ترتیب میں ہیکل کی بعض زبردست لغزشوں سے قطع نظر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جدید دور میں جدید اسلوب تحقیق کے پیش نظر نگہیں جانے والی سیرت پر یہ پہلی تالیف ہے، پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی شخصیت

۱۔ ملاحظہ ہو ہیکل کا ناول 'زمینب'۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "تراجم محمدیہ" وغربیہ، اور ثورۃ الأدب۔

۳۔ دیکھئے ثورۃ الأدب۔

۴۔ حیات محمدؐ۔

۵۔ الصدایق ابوبکرؓ۔

۶۔ الفاسادق عمرؓ۔

کو سبک نے جس تاریخی اسلوب میں پیش کیا ہے اور جدید ممبر کی سیاسی تاریخ کی تدوین کی، اس سے ان کی علمی ذہن داری، ادبی مہارت اور تاملی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی متنوع شخصیت کا بھی احساں ہوتا ہے۔

(باقی)

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی نظریات مولانا کی علمی اور دینی زندگی اور قرآن فہم کی غیر معمولی بصیرت کے لئے حجاب بن گئے تھے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے مولانا آزاد کو جو عقلی دور کے تقاضوں کے مطابق قرآنی علوم و معارف کو قدیم و جدید فہموں میں اتارنے اور مضطرب دلوں کو مطمئن کرنے کی بھرپور صلاحیت سے نوازا تھا۔ مولانا آزاد کی معرکہ الہاماتفسیر — ترجمان القرآن — اس کا واضح نمونہ ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے چار سو صفحات کی اس اہم کتاب میں ترجمان القرآن کے علمی، تفسیری، تاریخی اور ادبی محاسن و کمالات پر شرح و تفصیل کے ساتھ مدعا دالی ہے۔

شرح میں حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار کا تحقیقی مقدمہ شامل ہے۔ مولانا آزاد کی قرآنی فہم و بصیرت پر یہ پہلی عظیم کتاب مولانا آزاد صدی کا بہترین علمی تحفہ ہے۔

کتابت و طباعت معیاری قیمت پچاس روپیہ، علاوہ محصول ڈاک
مکتبہ رحمت عام، شیخ چاند اسٹریٹ، لاہور کنواں سے، دہلی

طبقات الصوفیہ

آصفیہ لائبریری حیدر آباد کا ایک عربی مخطوطہ

جناب عید الرشید صاحب، صدر شعبہ عربی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

چند سال پہلے مجھے حیدر آباد جانے کا موقع ملا۔ آصفیہ لائبریری میں ایک مخطوطہ پر میری نگاہ پڑی، یہ مخطوطہ ناقص الاول ہے، مجموعی، وراق ۲۲۴ ہیں۔ ۸۷۷ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔ صوفیاء اور مشائخ کے تراجم و اقوال پر مشتمل ہے۔ اس ناقص اول کتاب کی ابتداء مشہور صوفی بشر الحافی کے تذکرہ میں اس عبارت سے ہوتی ہے "وفا شاذلی خیر" آخر پوری کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے۔ مصنف نے پہلے صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے پھر سرتذکرہ کے ضمن میں اس شیخ سے متعلق متبعین اور مریدین کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب ایک خاتمہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ۲۱ وراق پر مشتمل ایک فیصلہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نہ مصنف کا نام کہیں مذکور ہے اور نہ کتاب کا۔ مگر یہ کتاب چونکہ صوفیاء اور مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے اس لئے کتاب کا اصل نام چاہے "طبقات الصوفیاء" یا "طبقات الاولیاء" کے نام سے موسوم کرنا قرین قیاس ہے۔

”الفہرست المشرّوح للکتاب الخطیۃ النحویۃ کے نام سے فارسی زبان میں آصفیہ لائبریری کی ایک تفصیلی فہرست ہے۔ اس فہرست کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابوالعباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ کی تالیف ہے، اور ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے، مگر مؤلف ذیل نے اپنے خطبہ میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس حصہ میں اپنے یمنی شیوخ کا تذکرہ کریں گے۔

مرتب فہرست کی اس تحریر سے مخطوطہ کے متعلق تین باتوں کا انکشاف ہوتا ہے:

۱۔ اصل کتاب کے مؤلف چوتھی صدی ہجری کے ایک شیخ ابوالعباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ ہیں۔

۲۔ ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے اور اس کے مؤلف اور اصل کتاب کے مؤلف دونوں دو آدمی ہیں۔

۳۔ ذیل میں اس کے مؤلف نے اپنے یمنی شیوخ کے حالات درج کئے ہیں۔ مرتب مذکور نے اپنے پہلے دعویٰ کی تائید میں کشف الظنون کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ حاجی خلیفہ نے ”طبقات الصوفیاء“ کے ضمن میں لکھا ہے کہ ابوالعباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ کی بھی ایک ”طبقات الصوفیاء“ ہے۔ کشف الظنون دیکھنے پر معلوم ہوا کہ شیخ ابوالعباس السوسی نے بھی اس فن میں ایک کتاب تصنیف کی ہے مگر حاجی خلیفہ نے شیخ السوسی کی کتاب کی خصوصیت کے بارے میں ایک بات بھی تحریر نہیں کی ہے جس سے اس بات کا شک بھی ہو سکتا ہے کہ زیر بحث مخطوطہ شیخ السوسی کی تالیف ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ مؤلف کے نام کی تحقیق و تفتیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے خطبہ کی تھوڑی سی عبارت آپ کے سامنے آجائے جس سے

مرتب فرست کے دونوں دھوئوں کے متعلق آپ اپنی رائے قائم کر سکیں:

”وإذا قرعنا عن هذه الخاتمة النذی [التي] عقد هائمین
فلنذیل علیہا بسادات أدبہم فبلغناہم بالیمن حشرنا اللہ
فی سلكہم ولا أخرجنا من عقدہم“

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

- ۱۔ اصل کتاب اور ذیل کے مؤلف ایک ہیں نہ کہ دو۔
 - ۲۔ مصنف نے ذیل میں اپنے ان مشائخ کا تذکرہ کیا ہے جن کے زمانہ کو انھوں نے پایا اور تبرک و تین کے طوط پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں ”بضم الیاو اس لئے پڑھنا ضروری ہے کہ ذیل میں شیخ دمیری قاہری اور دوسرے مصری شیوخ کا تذکرہ موجود ہے۔
- اصل کتاب اور ذیل دونوں کے کاتب ایک ہیں۔ اب ذیل میں کاتب صاحب کا ترقیمہ بھی دیکھتے چلیے:

”وافق الفراغ سنہ ۷۸۷ھ ، الی اللہ المسلمین
مؤلفہ“

اس کتاب کی کتابت سے ۷۸۷ھ میں فراغت ہوئی۔ اللہ اس کے مؤلف کو مسلمانوں کے لئے باقی رکھے۔

اس عبارت سے یہ بات عداًف ہو جاتی ہے کہ مؤلف (ذیل اور مؤلف کتاب) ۷۸۷ھ میں بقیہ حیات تھے۔ اس لئے شیخ ابوالعباس احمد بن محمد سوسی متوفی ۳۹۶ھ اس کے مؤلف کیسے ہو سکتے ہیں۔

مزید براں اصل کتاب میں بعض ایسے مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ساتویں اور آٹھویں صدی میں ہوئی ہے اور کتاب الذیل میں شیخ محمد بن کریم الدمیری کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ۷۸۵ھ میں ہوئی ہے اور یہ قاہرہ کے مصنفات میں

قیام پذیر تھے۔ پھر شیخ دمیری کے بعد شیخ شہاب الفرغوی کے تذکرہ پر کتاب الذیل ختم ہو جاتی ہے جو کہ کتاب کی تالیف کے زمانہ میں بقید حیات تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ سوسی کی تالیف کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ وہ دلائل کسی اور پنج سے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اب آئیے اس کتاب کے مؤلف کے بارے میں صحیح اور حتمی فیصلہ کیا جائے جس کی طرف خود اس کتاب کی بعض باتیں رہنمائی کر رہی ہیں۔ "تذکرہ النوادر" کے مؤلف نے تحریر کیا ہے کہ یہ کتاب شیخ ابو حفص سراج الدین عمر بن علی بن عمر الانصاری الشافعی المصری المعروف بابن الملقن (۷۲۳ - ۸۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "معجم المصنفین" کے مصنف کی بھی یہی رائے ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ ٹوٹکی نے اپنے اس فیصلہ کو کس کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ بہر حال ان دونوں اکابر کی رائے سے راقم السطور بھی متفق ہے۔

دلائل پیش کرنے سے پہلے ابن ملقن کے بارے میں چند کلمات کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابن ملقن کے والد اندلس کے باشندہ تھے، وہاں سے کوچ کر کے مصر چلے آئے، اور مصری کو اپنا وطن بنالیا۔ یہ جید عالم تھے، مختلف علوم و فنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ علم لغت اور علم نحو کے امام مانے جاتے تھے۔ مصر ہی میں ۷۲۳ھ میں ابن ملقن کی پیدائش ہوئی۔ یہ سال ہے کہ تھوڑے والد کا سایہ مصر سے اٹھ گیا۔ وفات کے بعد اخبانی والدین گئے، اور انہی کی گود میں ابن ملقن کی نشوونما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ عیسوی مغربی جامع طبولون میں درس قرآن دیا کرتے تھے اس لئے یہ ابن الملحق کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بہر حال بعد میں یہ بہت بڑے صاحب فضل کمال ہوئے۔ درس و تفتار کے فرائض ایک طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ بر فرق کے زمانہ میں بعض ناگزیر حالات

کی بنا پر عہدہ قضا سے سبکدوش ہو گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تقریباً تین سو کتابیں تحریر کی ہیں، شاید ہی کوئی فن الیا ہو جس میں ان کی کوئی تصنیف نہ مل سکے۔ ان کی ایک کتاب "العقد المذہب فی طبقات حلیہ المذہب" ہے جس کے ایک حصہ کو راقم السطور نے کئی سال پہلے ایڈٹ کیا ہے۔ مقدمہ میں ۸ کتابوں کا نام شمار کرایا گیا ہے، جن میں سے بعض کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ بہت سی کتابیں یانگی پور، پٹنہ، آصفیہ لاہوری اور سعیدیہ لاہوری حیدر آباد میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ تقریباً تیس کتابوں کا نام خود مصنف نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں شمار کرایا ہے۔ ان کتابوں میں "طبقات الصوفیہ" کا نام بھی ملتا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تالیفات میں "طبقات الصوفیہ" کا ذکر کیا ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے طبقات الاولیاء لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ نے ایک جگہ طبقات الصوفیہ اور دوسری جگہ طبقات الاولیاء تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی کتاب ہو یا ایک دوسرے کا اختصار یا مطول ہو، جیسا کہ اس وقت کی عادت رہی ہے کہ پہلے مطول کتاب تحریر کرتے ہیں پھر اس کا اختصار کرتے ہیں، پھر اس کا خلاصہ تیار کرتے ہیں، اور کبھی پہلے مختصر کتاب تحریر کرتے ہیں پھر مطول تیار کرتے ہیں۔

ابن ملحق کے بہت سے شیوخ ہیں جن سے مختلف علوم و فنون میں تعلیم حاصل کی ہے۔ راقم السطور بہت تفصیل سے العقد المذہب کے مقدمہ میں ان کے شیوخ و تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ قطب الدین عبدالمکریم الحلی متوفی ۷۳۵ھ ان کے محبوب ترین شیوخ میں سے ایک ہیں، جن کی تاریخ مصر کا حوالہ یہ بکثرت اپنی تالیفات میں دیتے ہیں۔

اسی تفصیل کے بعد اب آئیے مخطوطہ کا جائزہ لیا جائے جس سے اس کے

مؤلف کا صحیح تعین ہو سکے :

۱۔ اس کتاب میں بار بار یہ عبارت مستی ہے: "قال شیخنا قطب الدین عبد الکریم الحلبي فی تالیفہ" اور یہ بات مسلم ہے کہ شیخ قطب الدین متوفی ۷۷۵ھ ابو العباس سوسی کے شیخ نہیں ہو سکتے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ شیخ قطب الدین ابن ملطین کے محبوب ترین شیخ ہیں۔ ابن ملطین نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں کثرت سے ان کی تاریخ نمبر کا حوالہ ٹھیک انہی الفاظ میں دیا ہے۔

۲۔ بہت سے تراجم میں مصنف کی یہ عبارت مستی ہے: "ذکرت فی طبقات الفقہاء" اور میں معلوم ہے کہ: یہ ملطین کی ایک کتاب "طبقات الفقہاء" پر مشتمل ہے جو کہ العقد المذہب کے نام سے موسوم ہے، بلکہ بدین لہ بر میں، کہ فورڈ کے نسخہ کے ٹائٹل پیج پر طبقات الفقہاء ہی درج ہے۔

۳۔ شیخ عبد الکریم بن ہواذن قشیری متوفی ۸۵۵ھ کے ترجمہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے ان کے دونوں بھائیوں کا تذکرہ طبقات الفقہاء میں کیا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے: "ذکرت أخوی فی طبقات الفقہاء"۔ طبقات الفقہاء دیکھنے پر معلوم ہوا کہ امام قشیری کے دونوں بھائیوں کے علاوہ ان کے چچا ٹرک، اور جنس امجاد کے بھی تذکرے مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

۴۔ کتاب الذیل کے خطبہ کی عبارت سے یہ بات طے پاتی ہے کہ اصل کتاب ذیل دونوں کے مؤلف ایک ہی شخص ہیں۔ در ذیل میں شیخ محمد بن کریم دمیری کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ قادیان کے مسافرات میں اقامت پذیر تھے اور ان کی وفات ۸۸۵ھ میں ہوئی ہے۔ ان کے بعد شیخ شہاب فرسوی کے تذکرہ پر نیز ختم ہوا تاہم جو کتب کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تالیف کی تالیف ۸۸۵ھ اور ۸۸۶ھ کے درمیان عرصہ میں ہوئی۔ در آخر میں صدر کا

نصف آخری ابن ملقم کی کثرت تالیف کا زمانہ ہے۔

یہاں یہ بات کھلتی ہے کہ ابن ملقم کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ طبقات الفقہاء کی تالیف کی ابتداء ششمین میں ہوئی اور اس کی تکمیل ششمین میں ہوئی، مگر تالیف کے بعد بھی اس میں حذف و اضافہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پھر بعد میں اس کا بھی کتاب الذیل ابن ملقم نے تیار کیا۔ مکتبہ خلیل المدینہ اسی حیدر آباد میں اس کا قدیم ترین مخطوطہ محفوظ ہے جس کی کتابت ششمین میں کی گئی ہے۔ اس کا ٹائٹل پیچ مؤلف کے قلم سے تحریر کردہ ہے۔ اس نسخہ میں اصل کتاب کے آخری حصہ میں مؤلف نے اپنی تالیفات میں شمار کرا یا ہے جن میں طبقات الصوفیاء کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس سے دونوں کتابوں کے درمیان مطابقت کی چند صورتیں ملتی ہیں۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ طبقات الفقہاء اور طبقات الصوفیاء دونوں ایک ساتھ تالیف کی گئیں اور اولیٰ عرصہ کے بعد کتاب الذیل تیار کیا گیا۔ یا دونوں کے بعد دیگرے تالیف کی گئیں مگر ذیل میں حذف و اضافہ ششمین تک جاری رہا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ طبقات الصوفیاء دوسری کتاب ہے اور زیر بحث کتاب طبقات الاولیاء ہے جیسا کہ کشف الظنون سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ملقم کی اس فن میں دو کتابیں ہیں۔ ایک طبقات الصوفیاء اور دوسری طبقات الاولیاء۔ صاحب اعلام خبر الدین زکریا نے بھی طبقات الاولیاء کا نام ذکر کیا ہے اور ابن ملقم کی عادت بھی یہی ہے کہ ایک فن میں مطول و مختصر کئی کئی باتیں تحریر کرتے ہیں۔

”اسلام کا نظام عدل... ایک جائزہ“

محمد سعید الرحمان شمس۔ مدیر نیفرت الاسلام کشمیر۔

اسلام کوئی نیا مذہب اور دین نہیں ہے بلکہ اس الہی مشن اور پیغام و دعوت کی آخری حتمی اور تکمیلی شکل ہے جسے جملہ انبیائے کرام اپنے اپنے وقت اور دور میں چلااتے اور عروج و نچشتے رہے۔ جس کی ابتدا سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ حضرت آدمؑ جہاں پہلے انسان تھے وہاں پیدا رسول بھی تھے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ حضرت ابوالواہدؑ کی روایت میں آیا ہے کہ سیدنا حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت نبیائے کرام کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”بیکار وہ جو میں ہزاراں میں ہیں سو چندہ رسول ہوئے۔“

(بحوالہ خدا احمد و ابن جان)

خدا کے اس بیکار و بیکاروں اور منتخب نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا اور خدا سے ڈر کر متعزز و نازندگ گذارنے کی تلقین کی۔ رسالت و نبوت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مستودعہ صفات پر آگئی۔ اس کے بعد جو دور اس کے خاتمہ تک کے جس کے دوسرے حضرات صرفہ

ہوئے۔ ان میں سے ایک پیغمبر ہونے کے ساتھ خاتم النبیین بھی

”وَمَا مِنْ نَبِيٍّ بَعْدِي“

اسی طرح آپ کی درسالت کے ساتھ دین الہی کی ہر سہیلہ اور جہت سے تکمیل ہو گئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے :-

<p>یعنی آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت (تم پر) تمام کر دی اور اسلام کے دین ہونے کی حیثیت سے تم سے راضی ہو گئے۔</p>	<p>”الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً“ (المائدہ)</p>
---	---

اسی کے ساتھ ساتھ بانگِ دہل یہ بھی اعلان فرما دیا گیا کہ :-

<p>بلاشبہ اسلام ہی حضرت حق جل مجدہ کے نزدیک پسندیدہ (مذہب) اور دین ہے اور جو کوئی اسکے علاوہ دوسرا مذہب تلاش کرے وہ ہرگز قابل قبول نہیں۔</p>	<p>”ان الذین عند اللہ الاسلام ومن یغیر الاسلام دیناً فلن یقبل وہ ہرگز قابل قبول نہیں۔“</p>
--	--

خود ایک حدیث پاک گندرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ :-
”میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلائے آیا ہوں
جس کی تعلیم انبیاءؑ نے دی ہے۔ میں ان تمام رسولوں کی عزت اور ان
کا احترام کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مسند تھے میں ان سب کی توثیق و تصدیق
کرتا ہوں۔“

اس کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ اور قرآنی آیات اس حقیقت کی ترجمانی
اور وضاحت کی گئی ہے یہاں تک کہ ایمان کی بنیاد جن چھ چیزوں پر ہے ان میں
ایک اہم بنیاد تمام انبیاءؑ سابقین پر اجمالی ایمان بھی ہے۔

اسلام نام کا مذہب کوئی ایسا مذہب اور ایسا عقیدہ نہیں ہے جس کی ابتداء
اور آغاز کوئی سال یا سن یا زمانہ بتایا جاسکتا ہو۔ بلکہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے

جس کی عمر ٹھیک اتنی ہی کہی جاسکتی ہے جتنی ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک بنی آدم اور اولاد آدم کی بنتی ہے، مذہب اسلام نے جو اپنے متبعین کو پیروں کا رول کو تعلیم دی ہے وہ آفاقی اور عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ تمام نوع انسان (HUMAN BEING) کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے جانے والے خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندوں پر ان کی تعلیم پر ایمان لانے سے شروع ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام انبیاء و مرسلین کے اعلان گرامی قرآن مجید میں بالترتیب بیان فرمائے لگتے تو بے شبہ اس پر پوری طرح قادر تھے لیکن یہ چیز حاصل تھی اور سوچئے! اس طرح پر قرآن مجید کی ضخامت اور حجم کس قدر بڑھ جاتا ہے لیکن تعلیم مطلق نے نہایت ہی مختصر مگر جامع اور مانع طریقہ بیان اختیار فرمایا۔ کہ پوری انسانی دنیا ایمان و عقیدہ کے اعلان کرتے وقت اس بات کا صدق دل سے اقرار کرے کہ ہم تمام انبیاء علیہ السلام اور ان کی ربانی تعلیم پر ایمان لاتے ہیں۔

ادیم ارض پر بھی وہ واحد مذہب ہے جو اپنے وسیع تر دامن میں انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے ایک مکمل نظام حیات، نظام زندگی، درمقعدہ حیات رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے متنوع اور مختلف گوشوں، شعبوں میں اسلامی اہمیت و ہدایات کی تکمیلی حیثیت سے صرف نظر کرنے والے ہمیں درج ذیل مقالہ میں "اسلام کے نظام عدل" پر ایک طاہر و ناظرانہ نگاہ ڈالنی ہے اور بدیہت سے کہ اسلام نے اس سلسلہ میں کیا کچھ ہدایات دی ہیں اور کون سے اصول وضع کئے ہیں جس سے انسانیت کے در و درکار مدد و اور زخم کا مرہم بن سکے۔

اسلامی اور مغربی نظام عدل کا تقابل

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو مستفاد قوموں کا حامل بنایا ہے۔ ایک وصف اس

میں ملکوتیت کا پایا جاتا ہے جو اسے اچھے اخلاق و کردار کی طرف مائل کرتا ہے اور اس میں نیکی اور پرہیزگاری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ دوسرا وصف بہمیت ہے جو انسان کو ظلم و جور، لوٹ مار، قتل و غارت، حرص و ہوس اور نفسانی و شیطانی خواہشات کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چونکہ نفسانی خواہشات میں تلذذ اور رنگینی ہوتی ہے اس لیے اکثر انسان بغیر سوچے سمجھے اور نتائج و شراب سے بے پرواہ ہو کر خواہشات کی وادی میں چھلنگ لگا دیتا ہے۔ انسانی معاشرہ کو اس وسوسہ کا گہوارہ بننے اور لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ دینے کے لیے دو قسم کے نظام رائج ہیں ایک نظام تورہ ہے جو انسانی ذہن و فکر کا ساحتہ اور پیرائہ ہے جسے ہر ملک کے معاشرے اور موجودہ حالات نے اپنی خواہشات اور جذبات کو مد نظر رکھ کر تیار کیا ہے اور اس کے ذریعے اس ملک کے افراد اپنے معاشرے میں عمل کا نظام قائم رکھتے ہیں۔ دوسرا نظام ہے جسے انسانوں کے خالق و مالک نے اپنے بندوں کی حاجت و ضرورت اس کی کمزوریوں، خامیوں، خوبیوں اور ذراہیوں کو مد نظر رکھ کر تیار کیا اور اپنے منتخب بندوں اور نمائندوں (انبیاء و رسل) کے ذریعے عالم انسانیت تک پہنچایا ہے۔ یہ نظام سرور کو نبین حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ذریعے اور طفیل میں تکمیل پذیر ہوا۔ اسلامی نظام عدل اور مغرب کے نظام عدل میں یہی بنیادی فرق ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ہے اس لیے اس میں وہ تمام کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں جو ایک انسان میں عموماً ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اس نظام میں مملکت کا سربراہ یا اس کے حاشیہ نشین ہر قسم کی مسئولیت اور (IMPEACHMENT) سے مامون ہوتے ہیں۔ منطوق عیون کا ہاتھ ان کے گریبان تک تو کمان کے داس تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ قانون ساز کا کہتے وقت وہ اپنے عطف کا پودا پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا نظام عدل میں مساوات اور برابری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہمیشہ بندہ

تمام بندے برابر اور مساوی ہیں۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ اس واقعہ سے لگائے کہ ”ایک مرتبہ رحمۃ اللہ علیہ جناب محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے دست مبارک کی چھتری سے ایک صحابی کو ہلکی سی خراش آجاتی ہے اور وہ اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ذات پاک جس کی خاک پاک ملک و ملکوت کے لیے سرچشمہ تھی۔ اپنی پشت مبارک کھول کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور صحابی کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا بدلہ لے لو!“

کیونکہ مغربی نظام عدل انسانوں کا بنایا ہوا ہے اس لیے نہ اس کو استقرار حاصل ہے اور نہ دوام آج ایک قانون پاس ہوتا ہے اور کل جب دوسری پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہ قانون اس کے مفادات کے منافی ہوتا ہے تو فوراً اسے (AMEND) کر دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے یوں کہہ لیجئے کہ مغرب کا نظام عدل عوام کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ حکمرانوں کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے اس کے برخلاف اسلام کے عدل پر توجہ حکومتوں کی تبدیلی کا اثر پڑتا ہے اور نہ زمانہ کے انقلابات و حواری کا۔ رب العالمین کا واضح ارشاد ہے۔

”لا تبدل کلمات اللہ“ (یونس)
 ”اللہ ان کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔“

یہ سن لیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی معاشرہ قیامت تک کن کن مسائل سے دوچار ہوگا۔ اور ان کا حل کیا ہے؟ اس لیے اس نے اپنی مازا کردہ کتاب اور اپنے پاک رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں ان تمام مسائل کا حل رکھ دیا ہے۔

ایک نکتہ

اس سلسلہ میں ایک نکتہ اور بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ چونکہ مغرب

کا نظام عدل انسان کا بنایا ہوا ہے اس لئے وہ انسانی خواہشات کے تابع ہے۔ اور اسلامی نظام عدل چونکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اس لیے وہ انسانی خواہشات پر کنٹرول کرتا ہے۔

اسلامی نظام عدل میں حاکم اور محکوم دونوں کے دل میں یہ بات راسخ کی جاتی ہے کہ وہ دونوں ایسے سمیع و بصیر اور علیم و منتقم اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہیں جو عالم الغیب والشہادہ ہے جو بندوں کی نیت و ارادہ سے واقف ہے اور جس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بندوں کے اعمال سے غافل نہیں رہیں۔ یہاں جواب دہی کا یہ احساس اور تصور بندوں کے دل میں خوف و خشیت کو جنم دیتا ہے اور وہ ایسے اعمال کے ارتکاب سے پرہیز کرتے ہیں جن کے ارتکاب سے اسلامی شریعت نے منع کیا ہے اس کے باعث جرائم کے ارتکاب کی شرح کم سے کم ہو جاتی ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ سہرا اور سجاوۃ سننے کے لائق ہے۔

.... لڑکی کو جب اس کی ماں سے دودھ میں پانی نہ ملنے کے لیے کہا تو لڑکی نے پانی ملانے سے انکار کر دیا جب ماں نے جواب طلبی کی تو اس نے کہا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کیا ہے

ماں نے کہا کیا اس وقت عمر رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں کہ تو دودھ میں پانی ملا رہی ہے یا لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔ ماں یہ سچ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن عمر رضی اللہ عنہ تو دیکھ رہا ہے: بچی کی بات سن کر ماں لاجواب ہو گئی۔

ماں کو یہ بات معلوم نہیں تھی اس کے مکان کے دروازے سے لگے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے مکان کے کوسن سے تھے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بچی کا جواب اس قدر پسند آیا کہ آپ نے بعد میں اس لڑکی کو اپنی بہو بنالیا۔ غور کیا جائے مسئولیت کا یہ خوف اور شدید احساس اس مغربی نظام عدل

میں کہاں سے آسکتا ہے؟ محاذ پولیس کا ایک سپاہی ہوتا ہے جو اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جسے رشوت کے ذریعے رام بھی کیا جاسکتا ہے۔ جسے دھوکہ اور فریب بھی دیا جاسکتا ہے۔ اور جسے ضرورت پڑنے پر جبرائیم پیشہ افراد قتل بھی کر دیتے ہیں۔

ایک اور بنیادی فرق

اسلامی اور مغربی نظام عدل میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت نے مسلم معاشرے کی بنیاد اخلاقِ فاضلہ پر رکھی ہے اس لیے اس بات کا مختلف طریقوں سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ ملت میں اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوں اور اگر کوئی فعل اخلاقِ فاضلہ کے خلاف دیکھا جاتا ہے تو اس پر سزا دی جاتی ہے۔ لیکن مغربی نظام عدل میں اخلاقِ فاضلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ البتہ اگر کسی فرد کا کوئی مجملہ۔ دسائنٹس کے دیگر افراد کے لیے مظہر ہو یا اس کے اسن عامہ میں خلل پڑنے کا امکان ہو۔ یا حکومت کے انتظامی امور میں دشواری پیدا کرنے والا ہو تو مغربی قانون حرکت میں آ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر ایک مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں یا کوئی شخص خمر میں یا بار میں بیٹھ کر شراب پیئے یا کلب میں جا کر حوا کیلے تو مغرب کا نظام عدل اس سے کوئی تعرض نہیں کریگا۔ اس لیے کہ اس نظام میں فرد کے اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے زنا یا بائجنر کرے یا شراب پی کر شائع عام پر غل غبارہ چلائے۔ جس سے لوگوں کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہو۔ یا فتنے کی حالت میں مونڈ چلائے یا جس سے کسی کے فحاشی جائے کا اندیشہ ہو تو فوراً مغربی قانون حرکت میں آ جائے گا۔

اسلامی نظام عدل میں یہ بات نہیں ہے۔ اسلامی شریعت سب سے زیادہ ضرورتوں کے اخلاق سے ماہر نے اور ایک صالح معاشرہ کی تخلیق پر رہتی ہے۔ کیونکہ

سارے فکا جبر اخلاق کی تباہی ہے۔ اگر لوگوں کے کردار بہتر ہو جائیں تو بغیر کسی تادیبی کاروائی کے جرائم خود بخود کم یا ختم ہو جاتے ہیں۔ مغربی نظام عدل چونکہ تعمیر کردار پر زور نہیں دیتا اس لیے باوجود تمام تر کوششوں اور پروپیگنڈوں کے، جرائم کی شرح میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، مغربی نظام عدل کا ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے۔ عدالتوں کے چکر کا یہ عالم ہے کہ معمولی قسم کے فیصلے میں تین تین اور چار چار سال لگ جاتے ہیں اس کے بعد اپیلوں کا چکر چلتا ہے جس میں اتنی دشواریاں ہیں کہ مظلوم کی داد رسی تو درکنار وہ خود کو عدالت میں گرفتار سمجھنے لگتا ہے۔ دیوانی معاملات کی طولیت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ ایک ایک مقدمہ کے فیصلے میں چودہ اور پندرہ سال کی مدت لگ جاتا تو معمولی سی بات ہے۔ اور بسا اوقات حصول انصاف کے بے صبر ایوٹ اور عمر نوٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کے نظام عدل میں بڑے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمہ کا فیصلہ دو چار دونوں میں ہو جاتا ہے اور ”حقیقی عدل“ کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ ”انصاف کی تاخیر بھی اپنی جگہ پر خود بہت بڑی بے انصافی ہے“۔

اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں دراصل عدل و انصاف ہی ایک ایسا معیار اور ہتھیار ہے جس سے انسانیت کے جائز، جمہوری اور بنیادی حقوق کی حفاظت ممکن ہے۔ چھوٹے بڑے کے منادات کی نگہداشت اور تحفظ ہوتا ہے اور حق بحق دار رسید والا معاوضہ ملتا ہے تو پورا انسانی سماج اور معاشرہ سکھ چین، اطمینان و سکون، لطف و کرم، امن و آشتی، بھائی چارہ و وسیع نظری، داد و دعا اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن جاتا ہے اور دنیا حقیقی کون اور اطمینان کی سانس لے سکتی ہے یہ دور بدقسمت ہے جس سے ہم اندر بہر میں تعالٰیٰ فکر

عمل کا بحرانی دور ہے اور جس کے ہلک اثرات سے پوری انسانی آبادی متاثر نظر آ رہی ہے۔ دوسری اقوام و مذہب کی بات تو ہم نہیں کرتے، اور نہ اخلاقی نقطہ نظر سے ابھی ہم عالمی سطح پر اس پوزیشن میں ہیں۔ البتہ ملت اسلامیہ اور ”امت مرحومہ“ کے تعلق سے اتنا عرض کرنے کو ضروری چاہتا ہے کہ اگر یہ موجودہ خطرناک سماجی نا انصافی اور حق تلفی و استحصال جیسے اجتماعی امراض کے علاج کی متلاشی ہے تو بے شک اس سے پوری مضبوطی سے اسلام کے ہی درخشاں نظریہ عدل و انصاف کے پاکیزہ روح پرور سچا پختہ ”انٹ اور راسخ“ ذہن و دماغ کو اپیل کرنے والے اصول و ہدایات اپنائے ہوں گے جس کا سلسلہ محض اس دنیا میں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کا ربط اور سلسلہ آخرت کی دائمی زندگی تک متواتر رہتا ہے۔ جی ہاں ”عدل و انصاف“ کو یقینی بنانا جس کا حکم بارگاہ ایزدی سے نازل ہوا ہے بڑا ہی نازک اور فرض شناسی چاہتا ہے۔ اس لیے بتایا گیا ہے کہ ”جسے کرسی عدل پر بٹھا دیا گیا گویا زمہ داری کی شدت کے پیش نظر اسے کند چھری سے ذبح کر دیا گیا“ اور جس نے خوف خدا اور محض حق جل جلالہ کے ڈر کر حق و انصاف کے مطابق پوری دیانت داری کے ساتھ فیصلہ دیا۔ وہ قیامت کے دن نور کے منبر پر بٹھا دیا جائے گا۔ نیز ایک حدیث پاک کے اندر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میدان محشر میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم ہو گا اور ہر فرد و بشر اپنی جگہ حیران و پریشان ہو گا۔ جن سات قسم کے خوش بختوں اور سعادت مندوں کو ”عرش خداوندی“ کے زیر سایہ جگے ملے گی۔ ان میں سرفہرست ”الامام العادل“ ہو گا۔ وہ انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا اپنے ظالمانہ فیصلہ سے اپنے لیے دوزخ خرید لیتا ہے اور نصفانہ فیصلہ سے جنت کا مستحق اور حقدار بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ظالم و جابر نظام حکومت کے تحت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہؒ نے قصر عدالت کے

کے بجائے پابند سلاسل ہونا، جیل کی تاریک کوٹھری میں بیٹھنا اور شاہانہ طہراق اور کرفرف کے بجائے اپنی پیٹھ پر مسلسل کوڑے کھانا پسند فرمایا لیکن عہدہ قضا اور تختِ عدل کو قبول فرمانے سے گریز کرتے رہے۔

قرآن مجید کے اندر رب العالمین کا یہ غبارِ شایہ ہے۔

”اِنَّ اللّٰهَ بِاَمْرِ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ“ بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا
(النمل) حکم دیتا ہے۔

آیت بالا کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالدار
رقمطراز ہیں۔

قرآن مجید کو ”تبیانا لکل شیء“ فرمایا گیا۔ یہ آیت اس کا ایک نمونہ ہے
حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ”خدا نے تعالیٰ نے ہر ایک خیر و شر کے
بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے گو یا کوئی عقیدہ، خلق، نیت، عمل، معاملہ،
اچھایا، برائیسا نہیں جو امر اور نہی اس کے تحت میں داخل نہ ہو گیا ہو، بعض
علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہی آیت
”تبیانا لکل شیء“ کا ثبوت دینے کے لیے کافی تھی۔ شاید اس لیے خلیفہ راشد
حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں اس کو درج کیے
امت کے لیے اسوۂ حسنہ قائم کر دیا۔ اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لیے
تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے تاہم تھوڑا سا اندازہ لوں کیا جاسکتا ہے
کہ آیت میں تین چیزیں کا اثر فرمایا ہے، عدل، احسان، اور اشیاءِ رزی الغربی ”عدل“
کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و
انصاف کے ترانہ میں سب سے بڑا۔ افراط و تفریط سے کوئی پلٹ نہ کھٹکے نہ پائے۔
سختی سے سخت دشمنوں کے ساتھ، نرم معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے

نہ چھوڑے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے پسند نہ کرے۔

”احسان“ کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقامِ عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل، عفو، اور تسطف و ترحم کی خواہش رکھے۔ فرض ادا کرنے کے بعد بطورِ ع اور تبرع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا۔ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اُدھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی سے ملے گا۔

”الاحسان ان تعبد الله کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک“

(صحیح بخاری)

”ہل جزاء الاحسان“ (الاحسان والقرآن)

یہ دونوں خصائصِ عدل و احسان یا با نفاظ و دیگر انصاف و مروت) تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سے متعلق ہیں، لیکن اقارب کا حق و بجا بہت سے کچھ نا ٹھ ہے“ الخ۔ (بحوالہ ترجمہ شیخ الہند)

بہر حال اپنے تو اپنے غیروں اور دشمنوں کے بارے میں حضرت قبل بجدہ، شریعتِ مصطفیٰ اور اسلام کے نظامِ عدل کو یہ گوارہ نہیں کہ ان کے ساتھ فیصلہ کرنے وقت کہیں ان کی دشمنی اور جذبہ انتقام آڑے نہ آجائے۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

اور کسی قوم کو ہر دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ عدل کو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ کے اور اللہ سے

”ولا یجزمکم شتان قوم علی انہ لا تعدلوا احدہما اقرب الی تقویٰ وتقواللہ“ (اللہ خیر ما تعلمون)

رہو اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

(ترجمہ شیخ الہند)

المائدہ (۱۵)

مذکورہ آیت کی شرح میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم خامہ فرسا ہیں۔ ”عدل“ کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلوں میں سے کسی پہ کو جھکا نہ سکے۔“

آگے فرماتے ہیں :-

جو چیزیں شرعاً ہلک یا کسی درجے میں مُضر ہیں ان سے بچاؤ کرتے رہنے

سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام

”تقویٰ“ ہے۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب و وجوہ بہت سے ہیں تمام اعمال

حسنہ اور خیر کو اس کے اسباب و میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن معلوم

ہوتا ہے کہ ”عدا و“ یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا

اور حق کے معاملے میں جذباتِ محبت و عداوت سے قطعی مغلوب نہ ہونا یہ

یہ خصلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اس لئے

”فرمایا و یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک

تر ہے۔ اس کی فرازات کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی

ہے۔ لکھتے ہیں یعنی ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک

سکے۔ اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو مستقی بننا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے

حصول کا واحد ذریعہ خدا کا خوف اور اس کی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف

”اعلمیہ“ کے مضمون کے بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

جب کھن مو من کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو اس کا قلب خشیتِ الہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں ”عدل و انصاف“ کا راستہ اختیار کرے گا اور احکامِ الہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پراس کے نتیجہ پر شمار وہ ملے گا جسے انجلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔“

(بحوالہ ترجمہ شیخ الہند)

پیش کردہ آیات بالا اور مختصر تشریح اور تفسیری نوٹ سے ہر صاحبِ نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کی ہر فرد بشر کے ساتھ کس قدر شدت کے ساتھ تاکید کی ہے اور ذمہ دار حضرات کے سامنے واضح اور بے لاگ اصول بیان کر دیئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جو عدل و انصاف اور حریت و مساوات کی جلتی جاگتی تصویر اور شفاف آئینہ ہے۔ آپ نے خود اپنا بار بار میں ارشاد فرمایا ہے کہ :-

” اھرفی ربی ببتع خشیتہ فی

السرو والعلابہ“ دیکھو العداء فی الغضب

والرضی۔ الخ

(الحديث بحوالہ ردّیہ)

میرے رب نے مجھے نواتوں کا حکم دیا ہے

کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا ہوں

اور غصے میں ہوں یا خوش میں ہر حال میں ”انصاف“

کی بات کہوں۔

”معتبر ترین روایات اعا دیت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مخرومی خاندان کے متمول گھرانے کی ایک عورت نے کسی کے گنہگار چرایے ایکڑی گئی، مقدمہ دربار رسالت میں پیش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قوانین کے پیش نظر مجرمہ کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا کہ لوگوں

کو بڑا دکھ اور حیرت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصفانہ فیصلہ پر
تامل ہوا۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت اسامہؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زید ابن عارضہ
حضور کے منہ بولے بیٹے کے تعلق سے بچہ چہیتے اور محبوب تھے خدمت اقدس میں
سفارشی بنا کر پیش کیا کہ ”فاطر“ معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس
لئے معاملہ رفع دفع کر کے مرنظر کر لیا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال ملاحظہ فرمائی تو غصہ سے
چہرہ انور سرخ ہو گیا اور ”اے اللہ“ اے اللہ“ کہ پہلے کے لوگ
اسی بنیاد پر ہلاک کر دیئے گئے کہ جب ان میں سے کوئی کمزور مالی اور سماجی اعتبار
سے اور غریب کا کام کرتا تو اسے فوری سزا دی جاتی اور اگر کوئی معزز یا طاقت ور
ایسا کرتا تو اسے نظر انداز کر دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی
اور حکمران کاٹھن فاطمہ زہراؓ سے بھی یہ حرکت سرزد ہوتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹنے
ڈالتا۔ اور اسلامی حد جاری کر کے ”عدل و انصاف“ کو قائل کرتا۔ اس کے بعد پھر
دوبارہ کسی صحابی جلیل کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ اللہ و رسول کے معاملہ میں دخل
اندازی کریں۔ تفصیلات کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔

اسلام کے نظام عدل کے تعلق سے مستند علماء کی ذمہ داری تھی تصانیف موجود
میں اور اس میں تواریخ میں سینکڑوں ایسے معاملات اور مثال ملتی ہیں جو موجودہ
ظلم و ستم پر ”نا انصافی“ اور حقوق تلفی کی دنیا میں شعل راہ کی حیثیت اور انہی
خطوط کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم اپنے موقف کے اثبات اور اپنے دعوے کی دلیل
کے طور پر بطور نمونہ جسے اندازہ دے چند ایک معتبر واقعات و حقائق پیش کیے جاتے ہیں
جی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا سانحہ پیش آنے کے بعد اتفاق
جمہوری اہلہ صحابہ کرامؓ خلافت و قیادت کی ذمہ داری سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی

اللہ غنہ کو سوچنی گئی۔ بیعت عام کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے منبر پر بیٹھ کر جو پہلا خطبہ دیا اور اپنے آئندہ طرز عمل اور پالیسی کی ترغیب فرمائی اس میں ایک تاریخی جملہ یہ بھی فرمایا کہ "انشاء اللہ تمہارا منجیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں۔ انشاء اللہ اور تمہارا قوی فرد بھی میرے نزدیک منجیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلا دوں" (بحوالہ طبقات ابن سعد) خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ صحن کی خلافت و امامت کی پوری عدل و انصاف مساومت و برابری ہمہ سدی وہی خواہی درد مندی اور دل سوزی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جیلہ بن الابیہم کا واقعہ یاد کرنے کے لائق ہے جو امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شام کے حج ادا کر رہا تھا حالت طواف میں جیلہ کا تہمند جو آواز اٹھا اور شہوت کے سبب زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ قبیلہ فزراء کے ایک شخص کا پیر غلطی سے پڑ گیا۔ جیلہ کو غصہ آگیا اور اس نے زور سے کہنا شروع کیا کہ اس شخص کے دانت ٹوٹ گئے۔

مقررہ خلافت کی عدالت میں پہنچی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں سے فرمایا کہ با تو تم مدعی کو رضاعت کر دو ورنہ قتل کیا جائے گا۔ جیلہ کو یہ خلاف توقع فیصلہ سخت ناگوار لگا۔ اس نے کہا کہ ایک معمولی شخص کے عوض مجھ سے قصاص لیا جائے گا، میں اپنی جگہ کا بادشاہ اور اہم آدمی ہوں اور وہ عام رعیت کا ایک فرد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اسلام نے تم کو ملو اس رعیت کو اپنے احکام کے محامد میں مساوی کر دیا ہے۔ اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو بعض امت میں اس پر خلاق حسنہ کر دیتے ہیں۔

اسلام کی اشاعت ص ۲۱۰

رہایت نہیں فرمائی۔ اور دنیا کو بتلادیا کہ ”اسلام کا نظام عدل“ کیا ہے؟ اور اپنے
پراسٹے کے فیصلہ کے نازک وقت میں کس طرح عہدہ برآ ہوناہے اور اس وقت اسلام
کا مطالبہ کیا ہے؟

تایخی حوالے سے یہ بات ثابت ہے کہ خلیفہ اعظمؓ کے صاحبزادے فرزند ارجمند
نے مصر کے اندر شراب پی لی تھی۔ مصر کے گورنر نے یہ سہمہ کر خلیفہؓ وقت کے صاحبزادے
سے لغزش ہو گئی ہے تنہائی میں کمرہ کے اندر بلوا کر اسلامی حدود کی روشنی میں ہلکی سزا
دے دی اور مطمئن ہو گئے۔

تندرہ شدہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی فوراً فرمان جاری کیا اور
تحریر فرمایا کہ تم نے محض یہ جان کر کہ خلیفہؓ وقت کا بیٹا ہے۔ اسلامی سزا میں مدامت
کا ثبوت پیش کیا ہے مجرم کو یہاں بھیجا جائے تاکہ میں خود اپنی نگہانی میں شرب خمر کی
سزا دوں۔ اور تم کو بھی اپنے عہدے محض اس بنیاد پر معزول کیا جاتا ہے کہ اسلامی
عدل کے مظاہرہ اور حد جاری کرنے میں نرم گوشہ کیوں اختیار کیا؟ ”صاحبزادہ یوں ہی
مصر سے مدینہ آیا فوراً سزا کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے سفارش
کی کہ صاحبزادہ کی طبیعت کچھ علیل ہے اور پھر ایک حد تک سزا مل بھی چکی ہے۔ بہتر ہوگا
چند دن تاخیر کیا جائے۔ فرمایا کہ یہ برگز نہیں ہو سکتا، زندگی کا کیا بھروسہ ممکن ہے
اسی حال میں یرق موت آجائے! اور میں حدود اللہ کو جاری کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے
یہاں چل جاؤں!

بالآخر بھرے دربار میں فرزند ارجمند شرعی سزا دی گئی اور بغیر کسی روئے طاقت
کے نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادہ کے مرض میں از در۔ اعلیٰ ہو گیا۔ اور پھر جائزہ ہو کر
روح قفس منفرد سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وان الیہ راجعون

کیونکہ تمدن سے متقدم تاریخ کی جی ”مد“ یا نصائح کی یہ روحانی تفرہ

کر سکتی ہے ؟ داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دعویٰ خلافت و سیادت ہے۔ حضرت علیؑ کی زرہ چھدی ہو گئی، جو ایک یہودی کے ہاں پکڑی گئی، قاضی وقت حضرت شریحؒ (جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ سے ہی عہدہ قضا پر فائز پہلے آرہے تھے) مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت قاضی نے قلعین کے نام سمٹن جاری کر دیا۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک طرف ادنیٰ یہودی ہے (جس کا کوئی مذہب نہیں) اور دوسری طرف خلیفہ اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدسی الاصل اور پاکیزہ شخصیت گرامی ہے مگر چونکہ عدل و انصاف کا معاملہ ہے۔ اس لیے عدالت میں حاضری ناگزیر اور ضروری ہے قاضی عدالت نے کرسی پر بیٹھ کر حضرت علیؑ سے اپنے دعوے پر گواہ طلب فرمایا آپؑ نے اپنے بیٹے حضرت حسنؑ اور غلام () کو شہادت میں پیش کیا۔ قاضیؑ نے گواہوں کی پوزیشن دیکھ کر فرمایا کہ میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی معتبر نہیں ہے کوئی دوسرا گواہ پیش کیجئے۔

خلیفہ وقت نے یہ سن کر فرمایا کہ دوسرا گواہ تو اور کوئی نہیں ہے۔ البتہ میرے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق قابل اعتبار ہے !۔

قارئین کرام سوچئے ہوں گے ؟ کہ خلیفہ وقت کے حق قاضی نے یہ سن کر فیصلہ دے دیا ہوگا اگر کیسے سمجھایا جائے کہ یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے کہ قاضی نے دوسرا ہی فیصلہ صادر فرمایا۔ مقدمہ خارج اور فیصلہ یہودی کے حق میں یہودی نے جب ”عدل و انصاف“ کا یہ اسلامی رنگ دیکھا تو انسانی فطرت صحیحہ کے خائب اور بات ناممکن ہوتی کہ وہ متاثر نہ ہوتا۔ اس بے شالی واقعہ، اس کی زندگی کا کیا بیانیہ ہے۔ دی۔ فوراً اپنے جرم کا اعتراف کر کے اسلامی کن غلامی کا طوق ہمیشہ ہمیشہ سوجھ۔ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اور گواہی دی کہ بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کفر ستادہ اور رسول برحق ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات ہر لحاظ سے تسلی بخش اور فطرت انسانی کے ہم آہنگ ہیں۔ دو گروہوں یا دو آدمیوں میں جب کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو اکثر ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر اپنے مفاد پر ہوتی ہے جس میں بظاہر فائدہ نظر آئے آدمی اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق، انصاف اور بے انصافی اور عدل و ظلم کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ اور جو طریقہ کار بھی عدل و انصاف کے مطابق ہو اختیار کیا جائے اور جو طریقہ بھی عدل اور حق کے خلاف ہو چھوڑ دیا جائے۔

پوری اسلامی تاریخ الحمد للہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کی داستان ہے۔ برہنہ ہے اور زبان حال سے ملک و قوم اور نفع انسانی کو دعوت فکر دعوت عمل اور دعوت عدل دے رہی ہے۔

آخر میں ہندوستان کی آزادی کے ممتاز رہنما "گاندھی جی" کا وہ حقیقت افروز تبصرہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو موصوف نے دہلی کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام لیلا گراؤنڈ (RAM Lila ground) برسر عام اظہار و اعلان کیا تھا۔ حقیقت ہے "الافضل

بعد میں خود اپنے اخبار "ہریجن" (HARIJAN) بابت ۲۷-۷-۲۷ میں نقل کیا۔ الفاظ ہیں۔

"SIMPLICITY IS NOT THE MONOPOLY OF CONGRESS
IS THE NAME NOT GOING TO MENTION THE NAME
OF RAMA AND KRISHNA, BECAUSE THEY WERE
NOT THE HISTORICAL PERSONALITIES, A NAME

قرآن کریم میں تراویح

تفسیر جتہ

ماثور عن عبد الرحمن بن عوف عن عائشة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن میں خشوع صرف اللہ کے لیے بیان ہوا ہے اسے اہل ایمان کی صفت یا حال بتایا گیا ہے جو صرف اسی دنیاوی زندگی کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام صریح آیات میں ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں:

الاسراء ۱۰۹: اِذَا يَتْلُو عَلَيْهِمْ نَجْرُونَ سَجْدًا وَلِقَوْلِهِمْ سُبْحَانَ رَبِّكَ
كَانَ وَعْدًا مَقْعُودًا وَخَيْرُونَ لِذِقَانِ يَكُونُ دِيْنُهُمْ خَشُوعًا
المؤمنون ۲: قَرَأْ فَلِمَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي هَلَاكِهِمْ شَاشِعُونَ
العمران ۱۹۹: خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْعُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ شَنَا قَلِيلًا
الانبیاء ۹۰: أَنَّهُمْ كَانُوا لِيَسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَذَعْنَنَا رِجَابًا
رَهْبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ

بیان قرآنی میں خشوع کی نسبت جہاں مجرین اور کفار کی طرف کی گئی ہے وہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ضد مدان کی طرف ہے آخرت میں ہوگا جس سے ان کو ڈرایا دھمکایا ہے۔ جیسا کہ آیات کے صریح سباق سے معلوم ہوتا ہے۔
الغاشیہ ۲: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ
عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ تَصْلَى نَارًا حَامِيَةً

النازعات ۹: قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ أَبْصَالُهَا خَاشِعَةٌ يَقُولُونَ أ
إِنَّا لَمُرْدُونَ فِي الْحَافِرَةِ إِنَّا كُنَّا غَطَامًا نَحْوَةً تَلْهُ إِذَا كُورَةٌ خَاسِرَةٌ
المعارج ۴۴: فَذَرِهِمْ يَخْرُصُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوْمَعُونَ

یوم یخرجون من الأجداث سراعاً کانهم الی نصب ید فوضون خاشعة أبصار
هم ترهقهم ذلّة ذلک الیوم الذی کانوا یعدون

الشوری ۴: وترى الظالمین لما راوا العذاب یقولون هل الی مود
من سبیل وقرأهم لعیضون علیہا خاشعین من الذلّة

القمر: فتولّٰ عنہم یوم یدرع الدارع الی شئ نکر، خشعاً أبصارهم یخرجون
من الأجداث کانهم جبراً ومنتشراً

مجھے نہیں معلوم کہ مفسرین اور اہل بلاغت میں ہے کسی کی توجہ اس پہلو کی طرف
مبذول ہوئی ہو کہ خشوع کی نسبت دنیا میں اہل ایمان کی طرف ہے اور آخرت میں
کافروں، مجرموں اور ظالموں کی طرف۔ میرے خیال میں اس کا بیانی راز یہ ہے کہ کفار
کا خشوع اس دن کے آنے کے بعد ہوگا جس سے انھیں ڈرایا جاتا ہے۔ اس دن خوف
ڈراؤر ذلت کی وجہ سے ان میں خشوع پیدا ہوگا۔ جبکہ اہل ایمان میں دنیا میں سچے
ایمان، تقویٰ اور خشیت الہی کی بنا پر خشوع پیدا ہوتا ہے۔

سورہ حشر کی آیت کے مطابق پہاڑ ہیں خشوع اس لیے نہیں پیدا ہو اکیڈنک
اس پر قرآن نازل نہیں کیا گیا، ورنہ اگر اس پر قرآن نازل کر دیا جاتا تو تم دیکھتے
کہ اللہ کی خشیت سے وہ شق ہو جاتا۔ یہ ایک مثال ہے جسے اللہ نے لوگوں کے
لیے بیان کیا ہے تاکہ وہ غور کریں۔

جب یہ جان و نعت جان پہاڑ اس قرآن کی جلالت کو وجہ سے خشیت
الہی سے خاشع اور متصدع دکھائی دیتا ہے تو اس انسان کا کیا حال ہونا چاہیے
و جس واداک و شعور و ت تمیز اور سننے اور دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ لیکن
انسان پر قرآن نازل ہونے کے باوجود وہ کم ہی اللہ کی خشیت سے خاشع دکھائی دیتا کہ
جبکہ اگر قرآن پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ بھی حالت خشوع میں ہوتا۔

عقل کے انکار اور دل کی قسوت کی وجہ سے انسان کی انسانیت کہیں زیادہ
بے حس ہو جاتی ہے اور اس میں تاثیر اور عبرت پذیری کی صلاحیت بالکل مفقود ہو جاتی
ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دل پتھر سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ بے حس ہو جاتا ہے:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنُظَرِّهَا النَّاسَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (الحشر - ۲۱)

زوج اور امراۃ

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم و حوا کا قصہ بیان کرتے ہوئے
’زوج‘ کا لفظ استعمال کرتا ہے [دیکھئے آیات: البقرہ ۳۵، الاعراف ۱۹،
طہ ۱۱۷] جبکہ بعض مقامات پر ’امراۃ‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے ’امراۃ العزیز‘
’امراۃ نوح امراۃ لوط امراۃ فرعون‘۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ میں سے
ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ دونوں قرآن میں استعمال ہوئے
ہیں جیسے ’زوج آدم کی جگہ‘ ’امراۃ آدم‘ اور ’امراۃ العزیز کی جگہ زوج العزیز‘
کہہ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کا معجزانہ بیان اس کا انکار کرتا ہے۔

اسی سے ہم پر دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ آدم و حوا جو اس صفحہ ہستی
پر پہلے دو انسان ہیں۔ ان کے درمیان تعلق کا مناسط ’زوجیت‘ ہے آدم کی بیوی
دوسری عورت تو اکی طرح ایک عورت نہ تھیں۔ بلکہ صرف وہی ان کی بیوی تھیں۔ ان کو
آدم سے تعلق اور وجود کا راز صرف اور صرف زوجیت تھا۔

ہم قرآن میں دونوں الفاظ کے استعمال کے سیاق میں تدبیر کرتے ہیں تو
دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ لفظ ’زوج‘ اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں
مناسط ’زوجیت‘ ہو۔ حکمت انجمن کے اعتبار سے یا قانون اور حکم کے
اعتبار سے۔

زوجیت کی نشانی (سکون، موت اور رحمت) کے معنی میں اللہ تعالیٰ فرماتا

۴:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا فِيهَا وَلِيَجْذِلَ
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم - ۲۱)

”وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا ذُرِّيًّا تُقَرِّهْ أَعْيُنُنَا
وَجْعَلْ لَنَا لِمَتَّقِينَ إِمَامًا“ (الفرقان - ۷۴)

اسی طرح آخرت میں ملنے والی بیویوں کیلئے ”ازواج“ کا لفظ آیا ہے، دیکھئے
آیات: الواقعة: ۷، البقرہ: ۲۵، آل عمران: ۵۱، النساء: ۵۶، الزخرف: ۶۱، یس: ۵۱،
لیکن جب خیانت یا عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے زوجیت کی نشانی سکون
محبت، رحمت، مفقور ہو جائے تو قرآن زواج کے بجائے ”امراة“ کا لفظ استعمال
کرتا ہے۔

”امراة العزيز تراود فتاها من نفسه“ (یوسف: ۲۳)
”امراة نوح وامراة لوط“ کانتا تحت عبدین من عبارتیا ففحانتا ثم
فلم یقنیا عنهما من الله شیئاً التحريم
”امراة لوط“ العنکبوت ۳۳، النمل ۷۷، الحجر ۶۰، الذاریات ۸۱،
الاعراف ۸۳

”امراة فرعون“ التحريم - ۱۱

فرعون کی بیوی کیلئے ”امراة“ کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ دونوں کے
درمیان زوجیت کی نشانی مفقور تھی ۳۱، یہ کہ وہ یمن تھی اور فرعون کافر۔
انسان اور دوسری جاندار مخلوقات (حیوانات و نباتات) میں زوجیت
کی حکمت تبارک و تعالیٰ ہے۔ اسی سے یاقین ۱۰، نندہ جوفیل آیات میں زوجہ

زوجین اور ازواج کے الفاظ مذکور موزن کیلئے استعمال ہوئے ہیں :

النساء - ۱، ہود - ۲۰، الشوریٰ - ۱۱، یس - ۳۶، الذاریات - ۴۹،

النجم - ۴۵، النساء - ۸، ساتھ ہی دیکھئے مزید آیات :

المؤمنون - ۲۷، الانعام - ۳، الزمر - ۳، لقمان - ۱۰، الحج - ۵، الشعرا - ۷،

۵۳ ق ۷

جب انسان میں زوجیت کی حکمت یا بچہ پن یا بیوگی کی وجہ سے مفقود ہو
جائے تو قرآن زوج کے بجائے امرأة کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ
السلام کی بیوی (حضرت سارہ) اور عمران کی بیوی کے بارے میں امرأة ہی کا لفظ
آیا ہے۔ دیکھئے آیات : ہود - ۷۱، الذاریات - ۲۹، آل عمران - ۳۵

حضرت زکریا اللہ تعالیٰ سے تنزع کرتے ہیں :

”وكانت امرأة من عاقرات خبيثات من لدنك وليا ذمير - ۵
”فالله ربهم أئمة يكرهون له غلام وقد بلغن الكبر وامراتي عاقرات
پھر ربیب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور زوجیت
کی حکمت ثابت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا :

”والتقينا له وهبنا له يحيى وأهوانا له زوجة“ والانبیاء - ۹۰
تشریح کی آیات میں احکام ’زوج‘ ازواج‘ سے اس وقت متعلق ہوتے
ہیں جب زوجیت حقیقہً یا حکماً قائم ہو جیسے میراث کے احکام میں اور ان
مورتوں کی عدت میں جن نے ازواج‘ فدت پاچھے ہیں (البقرہ - ۲۴۰) لیکن تب
طلاق یا ایلاء کی وجہ سے زوجیت کا علق منقطع ہو جائے تو احکام کا تعلق انہوں
کے بجائے نساء سے ہو جاتا ہے جیسے آیات : الطلاق - ۱، البقرہ - ۲۲۶
سورۃ بقرہ آیات ۲۲۶ :

”وفاً لخلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره“ (البقرہ-۲۳)

اس کا تقاضا ہے کہ طلاق بائن پانے والے عورت اور محلل کے درمیان زوجیت عملاً قائم ہو، اور محض نکاح کی ظاہری کارروائی ہو جانے سے طلاق سینے والے شوہر کی طرف اس کی دوبارہ واپسی جائز نہ ہو۔

سورہ مجادلہ میں ظہار کی آیت ہے :

”قد سمع الله قول التي تجادلك في زوجها وتشتكي الى الله“ (المجادلہ-۱)

اس آیت میں ”زوج“ کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ زوجیت قائم ہے اور آیت ”والذين يظاهرون من نسائهم“ میں ”نساء“ کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے ظہار کے ذریعے زوجیت کو معطل کر دیا ہے۔

کیا وہ مختلف صیغوں کے الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں؟

عربی زبان کے محققین نے صرف انھیں الفاظ میں مترادف کا انکار نہیں کیا ہے جن کے حرف اور مادے مختلف ہوں۔ بلکہ ان کے الفاظ کے بھی مترادف ہونے کا حکم دیا ہے جن کے مادے اور حروف یکساں ہوں۔ لیکن ان کے صیغے اور وضع مختلف ہوں۔ لایہ کہ ان کا استعمال دو لغتوں میں ہو جیسی کہ یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ میں حرکتوں میں اختلاف ہو اور ان کا معنی ایک ہو۔

ابو ہلال نے اس سلسلہ میں مبالغہ کے صیغوں کی مثال دی ہے کہتے ہیں :

”ما آدمی میں جب کام کرنے کی صلاحیت بالقوی ہو تو ”مغول“ کہتے ہیں

جیسے صبور، مشکور اور جب وہ وقت بوقت کام کرے تو ”فوال“ کہتے ہیں جیسے علام

صباح اور جب ویسا کام کرنا اس کے عادت ہو جائے تو ”مفعال“ کہتے ہیں جیسے حنان

میں ”مفعول“ معانی کے اس اختلاف کو نہیں سمجھاؤ یہاں کرتا ہے نہ تمام صیغوں

یہ صرف مبالغہ کا فائدہ حاصل ہوتا ہے حالانکہ بات صرف اتنی نہیں ہے بلکہ مبالغہ کا فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ مذکورہ معانی بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح تمام کلام میں فعلت اور افعلت کے وزن پر آنے والے الفاظ کے معانی میں فرق ہوتا ہے الایہ کہ دونوں الگ الگ لغت میں ہوں جیسے سقیت الرجل کے معنی ہیں "تم نے آدمی کو پیسے والی کوئی چیز دی یا اس کے حلق میں ڈال دی" اور اسقیت الرجل کا مطلب یہ ہے کہ "تم نے اس کیلئے پاؤں کا ایک حصہ خاص کر دیا" اسی طرح شرفت الشمس کا مطلب ہے کہ سورج طلوع ہوا اور غرمت کی ضد اور اشرق الشمس کا یہ مطلب ہے کہ سورج روشنی والا ہو گیا۔ بعض اہل لغت کا یہ قول کہ الشعر اور اشعر اور النحر اور النحرۃ ایک معنی میں ہے تو درحقیقت یہ دو لغتیں ہیں جب حرکتوں کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے۔ تو خود معانی کے اختلاف سے ایسا ہونا زیادہ قرین جواب ہے" ۱۷

عربی زبان کی عظیم کتاب۔ قرآن کریم۔ ہم پر یہ دقیق نکتہ واضح کرتی ہے کہ جو الفاظ ایک مادہ سے ہوں لیکن ان کی حرکتوں یا صیغوں میں اختلاف ہو۔ ان کی دلائلوں میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں ذیل کی سطور میں بیان کی جا رہی ہیں۔

x

اشتات اور شتی:

دونوں کا مادہ ایک ہے۔ الشیت اور الشیات لغت میں تفریق و

اختلاف کے معنی آتے ہیں۔ یہ مانہ قرآن میں پانچ جگہ آیا ہے۔ تین جگہ مشق کے صیغے میں ذیل کی آیات میں:

طہ ۵۳: وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْ نَّشِئَاتٍ

اللیل ۴: إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى

الحشر ۴: تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى

ان آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی اختلاف کے ہیں جو اختلاف (اتحاد) کی ضد ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل دو آیتوں میں 'اشتات' کے صیغے میں آیا ہے جس کا معنی سیاق کی رو سے تفریق و انتشار (الگ الگ ہونا) ہے۔ جو جمع کی ضد ہے۔

الزلزلہ ۶: يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّسِرِّهِمْ

النور ۶: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا وَأَشْتَاتًا

الإنس اور الإنسان:

دونوں کا مانہ ایک ہے جو توحش کی ضد ہے۔ لیکن دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک میں ایک خاص ملخص ہے۔ جو اسے دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

لفظ 'إنس' قرآن میں ہمیشہ 'جن' کے ساتھ تقابل کے طور پر آیا ہے۔ کسی بھی جگہ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔ تمام آیات میں 'جن' کے قسیم کی حیثیت ہے اس کا استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی کے مقابل اس میں 'النسبت' کا پہلو ہے جو 'توحش' کی ضد ہے۔ 'جن' کے مقابل میں اسے بیان کرنے سے یہی مفہوم بھراحت معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ 'جن'

سے 'خفاء' پر دلالت ہوتی ہے جو توحش کے مظاہر میں سے ہے۔ اسی 'انسیتہ' سے ہماری جنس ان جنسوں سے ممتاز ہے جو مخفی، مجہول اور نامعلوم ہیں اور جو ہماری زندگی قوانین کے تابع نہیں ہیں۔

ربما لفظ 'الانسان' تو معجزانہ بیان کی آیات کا مستقرا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی 'النسانیہ' کا مناط محض 'النس' ہوتا نہیں ہے بلکہ اس میں لسانیہ دراصل مکلف ہونے کی اہلیت، بارِ امانت کا تحمل اور خیر و شر کی آزمائش کی منزل تک ارتقاء ہے۔ ۵۷

قرآن کریم میں لفظ 'الانسان' سے ۱۵ مقامات پر آیا ہے۔ جب ہم ان تمام آیات کے سیاق میں غور کرتے ہیں تو ہمیں 'النسانیہ' کی ممتاز دلالت کا اشارہ ملتا ہے

وہ اپنی عام جنس میں 'انس' ہے۔

”خلق الانسان من صلصال کالفخار“ وخالن الجان من مارج من

نار (الرحمن - ۱۴)

”ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون“ وخالن خلقناہ

من قبل من نار السموم (الحجر - ۲۴)

لیکن اپنی 'النسیۃ' کے ساتھ انسان مندرجہ ذیل خصوصیات کا

بھی حامل ہے :

قرآت و علم : سۃ العلق ۱-۵

بیان : الرحمن ۳-

مکافہ ہینا : الہر النجم ۳۹، القیامہ ۱۴، الاسراء ۷۰، ۱

مجار و خصوصیت : کھف ۵۴

۵۷ اس استقرا کی تفصیل کیلئے دیکھئے مکتب التفسیر البہانی للقرآن الکریم کا دورہ احسنہ

وصیت : لقمان ۴۱ العنکبوت ۱۸

مشقت کو برداشت کرنا : البلد ۴۴

اس بار امانت کو اٹھانے والا جسے اٹھانے سے آسمان زمین اور پہاڑوں

نے انکار کر دیا اور اس کے اٹھانے سے خوف محسوس کیا : الاحزاب ۷۲

آزمائش اور گمراہی سے دوچار ہونے والا : الفرقان ۴۴ ق ۱۶ الحشر ۱۶

الدھر ۴۴ الفجر ۱۵

غور و استکبار کرنے والا اور اپنے خالق سے بے نیاز سمجھ کر گمراہ ہو جانے

والا : العلق ۶

اسی طرح بکثرت مقامات پر قرآن انسان کو اس کا ضعف اور ناتوانی

یاد دلاتا ہے تاکہ اس کا غرور ٹوٹے اور وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے سرکشی نہ

کرے۔ کیونکہ اس بات کا گمان تھا کہ سرکشی اسے خالق کے انکار تک پہنچا دے

اور اسے کھلا ہوا جھگڑا لو بنا دے :

النمل ۴۴ مریم ۶۷ الانفطار ۶۷ حم السجدہ ۴۹ الزخرف ۵۱ عبس ۱۷

العادیات ۶ ۹

النعمة اور النعمیم :

دونوں الفاظ ایک مادہ سے ہیں اور دونوں اپنے مشترک مادے کی عام

علامت ہیں۔ مشترک میں لغت کی کتابوں میں دونوں صیغوں میں کوئی فرق نہیں ملتا۔

لے مزید تفصیل اور وضاحت کیلئے دیکھئے میری کتاب "معمناں فی اللغات : در سلسلہ

قرآن مجید" طبع الدہلی ۱۹۶۶ء۔

اہل تفسیر و نعیم کی تفسیر ان تمام معانی سے کرتے ہیں جو اس مادہ کی لغوی دلالت میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

پورے قرآن میں جب ہم دونوں صیغوں کا استعمال کرتے ہیں تو دونوں کے معنی میں واضح فرق دیکھتے ہیں 'نعمة' کا لفظ قرآن میں مختلف اقسام کی دنیوی نعمتوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔ تمام مواقع استعمال میں درخواست اس کا استعمال مفرد ہوا ہو یا جمع ایسا ملتا ہے کہیں اس کے برخلاف نہیں ہے۔ ان کی تعداد ۵۳ ہے۔

لیکن 'نعیم' کا صیغہ قرآن میں اسلامی دلالت کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا استعمال صرف آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام آیتوں میں ہے جن کی تعداد ۱۶ ہے۔

پندرہ آیتوں میں صریح لفظ کے ساتھ وارد ہے جنت کی نعمتوں کے علاوہ کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی

الواقعة ۸۹: فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرِيحٌ وَجَنَّةٌ نَعِيمٌ

المعارج ۳۸: أَيْطَعُ كُلٌّ أَمْرٍ أَنَّهُمْ أَنْ يَدْخُلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ

المطففين ۲۲: إِنَّ الْأَبْرَارَ يَفْنَىٰ نَعِيمٍ عَلَى الدُّرَائِلِ يَنْظُرُونَ تَعْرِقُ فِي

جِبْهُمْ نَقْرَةٌ النِّعِيمِ

الشعراء ۸۵: وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ

الدھر ۲: وَجَنَّا هُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةَ وَحَرِيرًا... وَإِنَّا رَأَيْتُمْ رَأَيْتُمْ

نَعِيمًا وَمَلَكًا كَبِيرًا

المائدہ ۶۵: ولا دخلنا ہم جنات النعیم
یونس ۹: تجری من تحتہم الا انہا فی جنات النعیم
القلم ۳۴: انہ للمتقین عند ربہم جنات النعیم
لقمان ۸: ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات لہم جنات النعیم
الطور ۱۷: ان المتقین فی جنات النعیم
الحج ۵۶: الملک یومئذ للہ فالذین آمنوا وعملوا الصالحات فی

جنات النعیم

[ساتھ ہی دیکھئے آیات: الصافات ۳۴، الواقعة ۱۲]

التوبہ ۲۹: وجنات لہم فیہا نعیم مقیم

صرف سورہ نکاح کی آیت میں ان لوگوں کو خطاب کر کے جنہیں ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا کمانے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ کہا گیا ہے:

”دشم لتسألن یومئذ عن النعیم“ (۸)

تمام آیات میں قرآن کے ”نعیم“ کے صیغے کو آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص کر دینے کے بعد ہم اس آیت کی وہ تفسیر نہیں کر سکتے جو ہمیں تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اور یہاں ”نعیم“ سے مراد دنیا کی نعمتیں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ دنیا کی نعمتوں کیلئے بیان قرآنی میں ”نعمۃ“، ”نعیم“ اور ”نعم“ وغیرہ کے صیغے آئے ہیں۔ اس آیت میں بیانی راز یہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیاوی اسباب کی زیادتی نے آخرت کیلئے زاد فراہم کرنے سے غافل رکھا ان لوگوں سے اس دن جب وہ جہنم دیکھ لیں گے (اور یقیناً اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے) یہ سوال کیا جائے گا کہ حقیقی نعمت (نعیم) کیا ہے؟ اور اس وقت انہیں اس ”نعیم“ کی حقیقت کے بارے میں علم الیقین حاصل ہو جائے گا جسے انہوں نے ضائع کر دیا اور دنیا کے فانی کی نعمتوں پر ٹوٹے پڑے

ہے اور اس کے چند روئے اسباب کی کثرت نے انھیں اس سے غافل رکھا ہے

X X X

یہاں میں ان شواہد کے پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہوں جو ان محققین اہل لغت کے مسلک کی تائید کرتی ہیں جو دو الفاظ کے مترادف ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ الا یہ کہ دو لغتوں میں آئیں۔

”لیکن یہ کہ ایک ہی لغت میں یہ محال ہے کہ دو الفاظ مختلف ہوں اور ان کا معنی ایک ہو جیسا کہ بہت سے نحویین اور لغویین کو گمان ہوا۔ انھوں نے اہل عرب کو ان کی حقیقت پر اور عادت کے مطابق جیسا کہ وہ معروف تھے بولتے ہوئے سنا بولنے والوں کے نفوس میں ان کے مختلف معانی کا استحضار تھا لیکن سننے والے ان علتوں اور فروق کو نہ سمجھ سکے اور انھوں نے ان کے مترادف ہونے کا گمان کر لیا اور اہل عرب کے بارے میں ایسی بات کہہ دی جو صحیح نہ تھی“^{۱۲}

X X X

سمجھا عزاف ہے کہ میں قرآن کے بعض الفاظ (جو بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں) کی دالالتوں میں فرق جاننے سے قاصر رہی ہوں۔ میں اپنی عاجزی اور جہالت کا پورا اعتراف کرتی ہوں اور ابن الاعرابی کے یہ الفاظ مستعار لیتی ہوں۔

”دو الفاظ جنہیں اہل عرب ایک معنی میں استعمال کیا ہے، انہیں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں بسا اوقات ہمیں وہ معلوم ہو گیا ہے تو ہم نے بتلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکے کہ اہل عرب کو بھی وہ معلوم نہ تھے“^{۱۳}

^{۱۲} دیکھئے التفسیر البیانی کے پہلے حصے میں سورۃ التکاثر جمع المعارف۔

^{۱۳} البولال العسکری: الفروق اللغویہ ص ۱۲

^{۱۴} انصاف ص ۶۵

نذرانہ عقیدہ

بھنور مفتی عتیق الرحمن عثمانی پاپی ندوۃ المصنفین دہلی

انکمال یغری، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

اے مفکر، اے مدبر اے امیر کارواں
تو نہیں لیکن زمانے میں بے تیری داستان

اے امام قوم اے فخر وطن اے روزگار
تجھ کو قدرت نے عطا کی تھی نگاہِ معتبر

ملک و ملت کے لئے تھی وقف تیری زندگی
قابلِ صدر رشک تیری ذات کی تھی سادگی

گفتگو میں تیری پوشیدہ تھی شانِ دلیری
ایسا لگتا تھا کہ تجھ پر ختم تھی دانشوری

تجھ کو بخشا تھا خدا نے کیا غنیمتِ حافظہ
آیتِ قرآن سے کرتا تھا حل ہر مسئلہ

مفتی دیں میں کہوں یا مفتی اعظم کہوں
یا کہ تجھ کو رازہائے قوم کا محرم کہوں

تیری ہر تقریر ہوتی تھی ہمیشہ دل پذیر
جس کی اب دنیا میں مل سکتی ہے مشکل سے نظیر

’خوصہ تیرا ہمالہ عزم تھا تیرا فلک
تیرے دل میں ہندو مسلم کا مقاصد مشترک

پاکباز و پاک سیرت نیک خوان تھا
فخر ہند و فخر مسلم فخر ہندوستان تھا

تو کہ علم و فضل کا تھا ایک بحرِ بیکراں
تازہ کرتی تھی خطابت پر تری ابد و زباں

فصل جیسے صاحبِ علم و عمل و ادا ملے
تربیت پائی چچا شبیر کے سائے تلے

شفقتِ پدرِ عزیزِ مردِ حق حاصل رہی
درسِ انورِ شاہِ رحیمِ عرفان کی بدولی

دیوبند سے کر کے جب تعلیم تو فارغ ہوا
درسِ دینی مدرسوں میں جلا بکا دیا رہا

شہرِ کلکتہ ہوا ڈا بھیل و بیٹاوی شرف
تو جہاں ٹھہرا نہ پیدا ہو سکا کوئی حریف

جس جگہ پہنچا اُسے جنتِ بداماں کر دیا
قومِ مسلم کے لئے راحت کا سماں کر دیا

کے قائم انجمنِ ندوۃ المصنفین کی
عمر بھر دہلی میں کی خدمتِ خدا کے دین کی

تیسرا اور اپنی چیز کی کتب کے قریب
انہماک و شوق سے تو نے بہت اچھے کیے

حق پرست و حق شناس و حق نظر پاکیزہ ذات
خوبیاں کیا ہوں بیاں تجھ میں ہزاروں تھیں مرقا

ماہنامہ جاری کروہ جو ترا "مربا" ہے
تفنگ علم پر اس کا بڑا احسان ہے

اس رسالے کو سعید احمد نے بخشنا وہ وقار
ہو گیا دنیائے علم و فن میں یہ خاک شاہکار

در حقیقت تھے رفیق کار تیرے جاں نثار
مگر کے باہم مشورے کرتے تھے کار بے شمار

اللہ اللہ کس قدر بیدار تھا تیرا شعور
دم بخود افکار رہتے تھے سدا تیرے مشور

تیرے جیسا اب مسلمانوں میں ہے قادم کہاں
اب کہاں ڈھونڈوں تجھے آنکھوں آنسوؤں میں

بارگاہ حق میں ہو جائے دعا میری قبول

تیرے مرقد پر قیامت تک ہو رحمت کا نزول

حشر تک باقی رہے گا مفتی دین تیرا نام

روح کو تیری کمال بے ہنر کا صد سلام

تبصرہ

تخلیق آدم اور نظریہ ارتقاء

مصنف: مولانا شہاب الدین ندوی

ناشر: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ

قیمت: نامعلوم

صفحات: ۲۷۷

سائنسدان جب کافی مشاہدات و حقائق جمع کر لیتا ہے تو وہ ان کو ترتیب دے کر ایک فطری قانون اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر اس کے ایک مخصوص ترتیب بندی میں چند حقائق موافق ہوتے ہیں اور زیادہ حقائق مخالف تو اس ترتیب بندی کو مفروضہ کہا جاتا ہے۔ تبصرہ جس ترتیب بندی میں زیادہ حقائق موافق اور چند حقائق مخالف ہوتے ہیں اس کو نظریہ سے یاد کیا جاتا ہے مگر جس ترتیب بندی میں تمام حقائق موافق ہوتے ہیں تو اس کو ثابت شدہ حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ (خان - مذہب اور سائنس، ص ۱۹۸)

ارتقاء برسوں سے ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور آج شاہدی حقیقت اس کے خلاف نہیں ملتی ہے۔ خان، سائنس اور اجتہاد، ص ۱۹۷۔ اگرچہ چند غیر یاتیم سائنسدان ارتقاء کے خلاف لکھتے آئے ہیں بغیر کسی شاہدی حقیقت کے۔ اسی بنا پر زمین اور صاحب مطالعہ ہم مفکروں نے ارتقاء کی حقیقت نہیں مانی ہے۔ خود بخود نا آزاد، سید سیدان ندوی اور شیخ عبدہ وغیرہم ان مسلم مفکروں میں شامل ہیں۔

مسلمان اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ الہامی کتابیں

بھی خدا کی دین ہیں اور فطری قوانین بھی خدا کے تخلیق کردہ ہیں لہذا ان دونوں میں تضاد غیر ممکن ہے مگر فطری قوانین مشاہدی حقائق پر مبنی ہیں لہذا ان کو غلط قرار دینا ناممکن ہے لہذا الہامی کتابوں میں بیان کردہ واقعات یا قوانین اور مشاہدی حقائق یا فطری قوانین میں اگر تضاد نظر آتے ہیں تو یہ محض الہامی کتابوں کی تفسیرات کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ لہذا ارتقاء کے معاملے میں مسلم مکتبہ میں اگر اختلاف ہے تو یہ محض تفسیر کی وجہ سے ہے۔

مذہبی حلقوں کی یہ عام روش ہے کہ وہ الہامی کتابوں کی قدیم تفسیر کو مسلم تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف تفسیر کرنے والوں کو اہل الرائے قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات مانتے ہیں کہ ہر چیز کو خواہ وہ مشاہدی حقیقت ہی کیوں نہ ہو مشتبہ گردانتے ہیں۔ انہیں پس منظر میں ارتقاء کو مفروضہ یا افسانے سے یاد کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء ایک ثابت شدہ حقیقت ہے لیکن یہ تصور کہ ارتقاء کی تمام کڑیاں خود بہ خود وجود میں آتی ہیں اور ان میں خدا کا کوئی منصوبہ کارگر نہیں ہے غیر سائنسی ہے مگر علماء نے اس تصور کو سائنسی عقیدت کی حیثیت دے دی ہے جس کی مخالفت محض مذہبی حضرات ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ غیر جانبدار اور سچے سائنسدانوں کا بھی یہی موقف ہے (خان، دور جدید اور روح، ۱۹۸۵)

مولانا شہاب الدین ندوی صاحب مسلسل یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ علماء حضرات میں مشاہدی حقائق، مفروضہ، نظریہ اور ثابت شدہ حقیقت کے فرق کو واضح کریں۔ (میں نے بھی مندرجہ بالا تینوں کتابوں میں یہی واضح کرنے کی کوشش کی ہے) تاکہ علماء حضرات جدید تعلیم یافتہ حضرات کی نظر میں مشتبہ چیز نہ بنیں بلکہ عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور ان کے اسلامی خیالات

کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں مقبولیت حاصل ہو سکے اور وہ نبی کی وصایت کا
حق صحیح معنوں میں ادا کر سکیں لہذا پوری کتاب میں سولہ کی بھرپور کوشش کی
گئی ہے کہ یہ ثابت کریں کہ دنیا کا پورا نظام خدا کے منصوبے کے مطابق
چل رہا ہے کہ مخلوق کی یہ کوشش کہ دنیا کا پورا نظام بغیر خدا کے چل رہا ہے
سازش کا نتیجہ ہے مگر غلطی سے ارتقار کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں
لگ گئے جو کتاب کا بڑا کمزور پہلو ہو کر رہ گیا ہے
(احسان اللہ)

بقیہ : اسلام کا نظام عدل

COMPELLED TO MEN ONE THE NAMES OF ABUBAKR
AND UMAR.

THOUGH THEY WERE MASTER OF A VERET
EMPIRE YET THEY BINED. THE LIFE OF PURES.

("HARIJAN" dated 27/7/37)

"یعنی سادگی کا نگریں کی اجارہ داری نہیں۔ میں رام ادا کرشن کا حوالہ
بھی اس سلسلہ میں پیش نہ کر سکوں گا کیونکہ ان کی شخصیتیں ماقبل از تاریخ کی ہیں۔
میں اس ضمن میں ابوبکر و عمرؓ کا نام لینے پر مجبور ہوں کہ باوجود ایک وسیع مملکت کے
ہونے کے ان نے انتہائی سادگی اور فقرانہ زندگی بسر کی۔"

جی ہاں کمال یہی ہے کہ غیر اور پرانے بھی اعتراف کمال اور اقرار حق پر مجبور رہے۔

(بشکریہ نعرۃ الاسلام نمبر بابت ماہ نومبر ۱۹۸۴ء)

۱۹۵۳ء	حیات محمد صمد الحق مرتضیٰ دہلوی، معلم و اعلام، اسلام آباد، حکومت پاکستان
۱۹۵۵ء	تاریخ فلسفہ و تاریخ فہم اسلام کا ذریعہ نظام و تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ تاریخ فہم و اسلامیات
۱۹۵۶ء	تذکرہ ملا محمد بن طاہر محدث تہذیب نیزہ بان الشہ جلد ثالث، اسلام آباد، حکومت پاکستان، جدیدہ لپیڈز، تہذیب و ادب
۱۹۵۷ء	سیاسی مباحثات جلد دوم، مختلف کے باشندین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات
۱۹۵۸ء	ذات القریٰ علیہ السلام کا تاریخ فہم و تعلیم، ہندو عقائد میں اسلام کی جگہ
۱۹۵۹ء	مذات القریٰ علیہ السلام کی زندگی میں جہاں تک تاریخ فہم و تعلیم، اسلامی سیاسی مباحثات
۱۹۶۰ء	حضرت عمرؓ کی سرکاری خطوط، کائناتی، روزانہ جنگ آزادی، شہداء و شہداء کی
۱۹۶۱ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، ۱۹۶۰-۶۱، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
۱۹۶۲ء	اسلام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق، عروج و زوال کا الہی نظام
۱۹۶۳ء	تفسیر نظیری، اردو جلد اول، میرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانہ، تہذیب و ادب
۱۹۶۴ء	تاریخ ہندو، چوتھی روایت
۱۹۶۵ء	تفسیر نظیری، اردو جلد دوم، اسلامی دنیا دوسری صدی ہجری میں، معارف الآثار
۱۹۶۶ء	نبیلہ قرأت، کتب
۱۹۶۷ء	تفسیر نظیری، اردو جلد سوم، تاریخ، روح پرورش، شیعہ، علما، ہندو، کائنات، امن، اول
۱۹۶۸ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، جعفر بن عثمان کے سرکاری خطوط، عرب و ہند، عہد رسالت میں
۱۹۶۹ء	ہندوستان، شاہان، فلسفہ کے عہد میں
۱۹۷۰ء	ہندوستان میں مسلمانوں کا تاریخ، تعلیم و تربیت، جلد اول، تاریخی مفاہمت
۱۹۷۱ء	لاٹیکس، ہندو، تاریخی، فلسفہ، تاریخ، آخری نواداریات
۱۹۷۲ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، ہندو، تاریخ، خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلسلہ
۱۹۷۳ء	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
۱۹۷۴ء	نیزہ بان الشہ جلد چارہ، تفسیر نظیری، اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ
۱۹۷۵ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، تفسیر نظیری، اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ
۱۹۷۶ء	اسلامی مباحثات کی فہم و تعلیم
۱۹۷۷ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، تاریخ، اسلامی مباحثات، ہندو، تاریخ، سلسلہ
۱۹۷۸ء	حیات محمدی، تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، تاریخ، معارف، اسلام، تاریخ، مباحثات، تاریخ، مباحثات
۱۹۷۹ء	تفسیر نظیری، اردو جلد چارہ، تاریخ، مباحثات، اسلام، تاریخ، مباحثات، تاریخ، مباحثات
۱۹۸۰ء	فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتساب التہذیب و التہذیب، اسلام، تاریخ، مباحثات
۱۹۸۱ء	عربی لٹریچر میں تعلیم ہندوستان

جب یہ سب خرابیاں ہوں



زمانہ حمل میں خون کی کمی



انکھ سے جگر کی تباہی



ظہار میں ذہنی ترقی کی کمی



ذہنی و جسمانی تناؤ اور دہاک



وزن کی کمی



جسمانی ہتھکاوٹ



وٹامن اور آئرن کی کمی



اعصابی بے چینی



سستی اور قوت کی کمی



بیماری کی شدت



بیماری کے بعد کی کمزوری



بھوک کی کمی

سنگارا
ان سب کو ٹھیک کرتا ہے!



لازمی بنیادی عناصر
وٹامنوں اور
جڑی بوٹیوں کا
نادر مرکب

سنگارا

مشہور عالمی ٹرانک - ہر موسم میں سب کے لیے

ہمدرد